اسلام اور جدید مادی افکار

محمد قطب

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی - ٦

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

ذخیرۂ پروفیسر محمد اقبال مجددی

جو 2014ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو

ہدیہ کیا گیا۔

CALL NO

PUNJAB UNIVERSITY LIBRARY

LAHORE

Marfat.com

6470

۳۸۶

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ

اِسلام
اور
جدید مادّی افکار

الانسان بین الاسلام والمادیۃ
(باللغۃ الاردویۃ)

تصنیف: ——— محمد قطب

ترجمہ: ——— سجّاد احمد کاندھلوی

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ٦

Marfat.com

© اشاعت اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) دہلی

135038

بار اوّل: ستمبر ۱۹۸۰ء ۱۰۰۰

بار دوم: مئی ۱۹۸۳ء ۱۰۰۰

قیمت: ۳۵/- روپے

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعہ: جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

Marfat.com

فہرست مضامین

عرض ناشر ۱۲

پیش لفظ مترجم ۱۴

مقدمہ مصنف طبع سوم ۱۸

مقدمہ ۱۹

مسیحی نقطۂ نظر ۲۳

مسیحی تعلیمات اور نفسیاتی الجھنیں ۲۵

مسیحیت اور عملی زندگی ۲۸

سائنس اور کلیسا کی جنگ ۳۱

فرائڈ کے افکار و نظریات ۳۷

فرائڈ کے افکار پر نظریۂ ڈارون کے اثرات ۳۸

فلسفۂ مادیت اور وجودِ خداوندی ۴۲

نقطۂ انقلاب ۴۷

فرائڈ اور یہودیت ۵۰

یہودیوں کی طرف سے انتقام ۵۵

انسان فرائڈ کی نظر میں ۵۸

ضمیر انسانی، فرائڈ کی نظر میں ۶۱

جذبات کی دوئی ۶۳

پاکیزہ انسانی اعمال ۶۸

Marfat.com

خوابوں کی تعبیر	۷۰
فرائڈ اور مذہب	۷۴
سماج ، اخلاق اور روایات	۷۶
نفسیاتی شذوذ	۷۸
مساکیت	۸۱
فرائڈ کی تنگ نظری	۸۳
مغربی معاشرے پر فرائڈ کے اثرات	۸۶
تجربی نقطۂ نظر	۹۳
تجربی سائنس اور دائرہ محسوسات	۹۳
نفسِ انسانی ، تجربہ گاہ میں	۹۵
نفسِ انسانی کا سرچشمہ، جسم ہے	۹۸
تجربی نفسیات اور مُبشّرات	۱۰۰
انسانِ کامل اور اس کے متفرق اجزاء	۱۰۲
تجربی نفسیات کے فوائد	۱۰۳
تجربی نفسیات اور خالص مادیت	۱۰۴
اشتراکی نقطۂ نظر	۱۰۷
اشتراکیت اور ڈارون	۱۰۸
جدلیاتی مادیت	۱۰۹
نفسیاتی اور روحانی محرکات اشتراکیت کی نظر میں	۱۱۳
اقتصادی جبریت	۱۱۵
سرمایہ داری کا مزاج	۱۱۸
اسبابِ عیش اور انسانی زندگی	۱۱۹
روٹی، کپڑا اور جنس	۱۲۲

Marfat.com

اسلام کی خصوصیات ۱۲۵

پہلی خصوصیت ۱۲۵

دوسری خصوصیت ۱۲۶

تیسری خصوصیت ۱۲۷

چوتھی خصوصیت ۱۲۸

انسان اور اس کے نفسیاتی محرکات ۱۲۹

اسلام کا نقطۂ نظر ۱۳۳

توازن اور اعتدال ۱۳۳

انسانی وجود کے تین اجزاء ۱۳۵

اسلام اور انسان کی عملی زندگی ۱۳۷

اخفاء (Repression) ۱۴۰

احساس جنس ۱۴۲

جذبۂ انتقام ۱۴۳

مال کی محبت ۱۴۴

حکمِ جہاد ۱۴۶

خمر اور میسر ۱۴۸

اسلام اور حدود و قیود ۱۴۸

انسان اور حیوان ۱۵۱

لذتِ اکل ۱۵۲

جسمانی آرام ۱۵۳

مسئلہ جنس ۱۵۴

جذبۂ ملکیت ۱۵۵

اسلام کی عائد کردہ حدود و قیود خود فرد کے مفاد میں ہیں ۱۵۷

Marfat.com

اسلامی حدود و قیود کا مزاج دو گانہ ہے ۱۶۰

قانونِ اسلامی کی خصوصیات ۱۶۲

لذتِ خورد و نوش ۱۶۶

لذتِ جنس ۱۶۷

حصولِ دولت کی آتشِ شوق ۱۶۸

اخلاق کی آبیاری ۱۶۸

اہلِ مغرب اور اخلاق ۱۶۹

عملِ انضباط ۱۷۱

روزہ : شعوری انضباط کی مثال ۱۷۴

قوتِ ارادی ۱۷۶

شعوری اور اخلاقی ضمیر ۱۸۰

عمل سے زندگی بنتی ہے ۱۸۴

اسلام کا نظامِ عبادات ۱۸۷

اسلام کی ہمہ گیری اور وسعت ۱۸۸

انسانیت کا مقامِ رفعت ۱۹۱

توبہ کا دروازہ ۱۹۶

تاریخ اسلامی کی تابناک مثالیں ۱۹۷

حضرت ابوبکرؓ ۱۹۸

حضرت عمرؓ ۱۹۸

حضرت عثمانؓ ۱۹۹

حضرت علیؓ ۲۰۰

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ۲۰۰

حضرت خالد بن ولیدؓ ۲۰۲

Marfat.com

ابو محجن ثقفیؓ ۲۰۲
یونس بن عبید ۲۰۴
ماعز بن مالکؓ ۲۰۴
صلاح الدین ایوبیؒ ۲۰۶
شیخ بدوانیؒ ۲۰۷

فرد اور معاشرہ ۲۰۹

فرد اور معاشرے کے درمیان خطِ فاصل ۲۱۰
معاشرہ : فرد کی ایک نفسیاتی ضرورت ۲۱۱
معاشرے کی ابتداء ۲۱۲
معاشرے کا پھیلاؤ اور اس کی ہمہ گیری ۲۱۴
انسان : ایک مجموعۂ اضداد ۲۱۵
انتہاء پسند جذبۂ انفرادیت ۲۱۶
تہذیب نوی کی خیرگی اور مشرق کی پس ماندگی ۲۲۱
امریکہ اور جنسی آزادی ۲۲۲
فرانس اور جنسی انارکی ۲۲۳
سماجی روایات اور ان کا کردار ۲۲۶
سماجی بیماریاں ۲۲۸
ممتاز شخصیت ۲۳۱
انتہاء پسند جذبۂ اجتماعیت ۲۳۴
کلیت پسند ریاستوں میں بچوں کی تربیت ۲۳۵
انسانِ بلند آفاق ۲۳۸
انفرادی امتیاز اور اشتراکیت ۲۳۹
آمریت اور ذہنِ انسانی کی پژمردگی ۲۴۲

Marfat.com

تحریکِ اسلامی کا ابتدائی نقشہ	۲۴۵
اکرام مسلم	۲۴۷
اسلامی معاشرے میں تربیتِ افراد	۲۴۸
اسلام میں انسانی حقوق	۲۵۲
اسلام اور عدلِ اجتماعی	۲۵۴
اسلام اور شخصی آزادی	۲۵۷
ارتداد ایک اجتماعی مسئلہ ہے	۲۶۳
اسلام اور فرد اور معاشرے کا ربطِ باہم	۲۶۵
اسلام انسانیت کے لیے سراپا رحمت	۲۶۷
جرم اور سزا	۲۷۱
جرم کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر	۲۷۱
شخصی آزادی	۲۷۳
جرم اور تحلیلی نفسیات	۲۷۵
جرم کے بارے میں اشتراکیت کا نقطۂ نظر	۲۷۹
دنیائے اشتراکیت کا واحد جرم	۲۸۱
اسلام میں انسدادِ جرم کی ذمے داری اجتماعی ہے	۲۸۲
اسلام اور جرم و سزا	۲۸۲
جرم کے بارے میں فرائڈ کا نقطۂ نظر	۲۸۶
اسلام اور اجتماعی امن و سلامتی	۲۸۹
حرمت زنا	۲۹۲
حرمت شراب	۲۹۴
مے نوشی کے برے اثرات	۲۹۹
مسئلہ ارتداد	۳۰۲

Marfat.com

فساد فی الارض	۳۰۴
اسلامی سزاؤں پر مغرب کا اعتراض	۳۰۶
اسلامی سزاؤں میں فرد کے نقطۂ نظر کا لحاظ	۳۰۹
اسلام اور اسبابِ قتل	۳۱۱
چوری کے اسباب	۳۱۳
زنا کے محرکات	۳۱۴
اسباب مے نوشی	۳۱۹
اسباب ارتداد	۳۲۲
فساد فی الارض کے اسباب	۳۲۳
مسئلہ جنس	۳۲۷
جنس اور انسانی ذمے داریاں	۳۲۸
فرائڈ کی نظر میں جنس کی اہمیت	۳۳۱
مرد و زن کے درمیان جنسی فرق	۳۳۴
دونوں صنفوں میں مساوات کا مسئلہ	۳۳۶
دونوں صنفوں میں ہم آہنگی	۳۴۰
مرد و زن کی مستقیم فطرت	۳۴۳
جنس اور اخلاق	۳۴۶
مغرب کی جنسی اباحیت	۳۵۰
حیوانی لذت اور نفسیاتی نشاط	۳۵۲
عقل اجتماعی اور خاندان	۳۵۶
خاندان ـــــ دورِ قدیم کی ایک اقتصادی ضرورت؟	۳۵۸
خاندان اور فطرتِ انسانی	۳۶
فرد اور خاندان	۳۶۱

Marfat.com

مغرب میں محبت جسمانی خواہشات کی مظہر ہے	۳۶۳
لطیف جذبات اور پر سکون فضا	۳۶۶
کثرت طلاق اور جنسی انارکی	۳۶۸
خاندان ـــــ بچوں کی ناگزیر ضرورت	۳۷۱
نرسری کا نظامِ تربیت	۳۷۴
بچے کی اپنے والدین کی جانب احتیاج	۳۷۵
نرسری نظامِ تربیت اور اشتراکیت	۳۸۰
احساساتِ جنس میں فرق و امتیاز	۳۸۲
انسان میں جمالیاتی مظہر	۳۸۴
نفسیاتی ارتفاع	۳۸۵
جنس کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر	۳۸۶
بقائے نسل اور تحفظ نوع	۳۹۰
توافق اور ہم آہنگی	۳۹۳
قرآن کریم کی ایک لطیف تعبیر	۳۹۵
فطری میلان اور پاکیزہ مقصد	۳۹۸
انسانی مساوات	۴۰۰
تقسیم میراث	۴۰۱
قوامیت	۴۰۴
اسلام اور تحدید روابط	۴۰۸
اسلام اور تعددِ ازدواج	۴۱۱
اسلام اور مساواتِ زن و مرد	۴۱۴
ایک اعتراض	۴۱۷
بے پردہ عورت اور لطفِ زندگانی	۴۱۸

Marfat.com

عادت اور زندگی ۴۱۹
"پاکیزہ اختلاط" ۴۲۰
اسلام میں نوجوانوں کے مشاغل ۴۲۴
غیر طبعی ہیجانات سے پاک معاشرہ ۴۲۶
جلد نکاح کی تلقین ۴۲۷
اسلام مکمل ضابطۂ حیات ۴۳۰
اسلامی نظام میں جلد شادی کرنے کی سہولتیں ۴۳۲
نکاح جلد کرنے پر چند شبہات ۴۳۴
اقدار عالیہ ۴۳۷
فرائڈ کی تیار کردہ تصویر انسان ۴۳۸
انسان کی ترقی کا پیمانہ ۴۴۳
مغرب اور مادی مفادات ۴۴۷
اقدار عالیہ مادی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہیں ۴۴۸
مغرب کا ایک مغالطہ ۴۴۹
بعض حیوانات میں بھی مہذب رجحانات موجود ہیں ۴۵۲
لاشعور ـــــ اقدار عالیہ ۴۵۲
انسان کے اجزاء ۴۵۴
اسلامی معاشرے میں انسانی رفعت کی مثالیں ۴۵۵

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

مغرب کے اہلِ دانش نے علم و ہنر اور سائنس ٹیکنالوجی کے میدان میں بلاشبہ بڑی ترقی کی مگر کائنات کی سب سے بڑی اور ازلی و ابدی صداقت سے گریز و فرار کی بناء پر ان کے افکار نے تہذیب و معاشرے کو جس سانچے میں ڈھالا اس میں سکون اور سچی خوشی ناپید تھی۔ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک نے کچھ عرصہ تو اس کمی کا دنیا کو احساس نہ ہونے دیا لیکن آہستہ آہستہ کشمکش و تصادم اور اس کے نتیجے میں مصائب و آلام نے اس تہذیب کی اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔ ذہنی سکون اور قلبی یکسوئی سے محروم ہو کر انسانیت، افکار و نظریات کے کارزار میں الجھ گئی اور علم و سائنس کے نام پر نت نئے فلسفوں نے امن و سلامتی کی راہ دکھانے کے بجائے قوموں کو قوموں سے اور معاشرتی طبقات کو باہم ایک دوسرے سے خوب خوب لڑایا۔

مغرب کے خدا ناشناس ذہن کی جولانیوں کی معراج فرائیڈ اور کارل مارکس ہیں انہوں نے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں خالص مادی نقطۂ نظر پیش کیا اور اس کے حق میں عقلی و منطقی دلائل کے انبار لگا دیئے یہی نظریات فکری اور انقلابی تحریکوں میں ڈھلے اور مغربی دنیا کے سیاسی و سماجی ڈھانچے میں دُور رس نتائج کی حامل تبدیلیاں رو نما ہوئیں ان تبدیلیوں نے ساری دنیا کو تصادم اور کشمکش، تباہی اور بربادی اور محرومی و مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ مغرب اس حقیقت کا اعتراف کرے، نہ کرے، اس کی نئی نسل اس اضطراب کی زندہ تصویر بنی سکون قلب کی تلاش میں دیس دیس کی خاک چھانتی نظر آتی ہے۔

Marfat.com

اس بے چینی و اضطراب کا حل اگر کہیں ہے تو اس بات میں ہے کہ انسان اس کائنات کے خالق و مالک کے آگے سرِ تسلیم خم کرے، اپنی حقیقت کو پہچانے اور زندگی کے سفر میں ہدایت و رہنمائی کے لئے خالقِ کائنات ہی کی طرف رجوع کرے کہ ساری خرابی اس سے منہ موڑنے اور گریز و فرار اختیار کرنے کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی ہے اور خالقِ کائنات کی عطا کردہ ہدایت کا نام اسلام ہے

محمد قطب مصر کے سید قطب شہید کے بھائی اور عالمِ اسلام کے ممتاز اہلِ علم ہیں۔ انہوں نے مغربی افکار کا بے لاگ تجزیہ کرنے کے بعد اسلام کے نظامِ حیات کا بہت فاضلانہ تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اور بڑے مدلل اور پُر زور انداز میں اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مغربی مفکرین اور مستشرقین کی طرف سے مختلف پیرایوں میں اسلام کی تعلیمات و احکام پر کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب "الانسان بين الاسلام والمادية" عربی زبان میں ہے۔ سجاد احمد کاندھلوی صاحب نے بامحاورہ اور سلیس اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ قارئین اسے مفید پائیں گے۔

ناشر

Marfat.com

پیش لفظ مترجم

بیسویں صدی کے جن مفکرین نے اسلام کو دورِ جدید کے تناظر میں رکھ کر مطالعہ کیا ہے اور اس کی ایسی تعبیرِ نَو پیش کی ہے جو جدید ذہن کے لیے قابلِ قبول ہو سکے، اُن میں محمّد قطب کا نام سرِفہرست ہے۔ آپ مرحوم سید قطب شہیدؒ کے بھائی ہیں۔ اسلام کی خاطر مصر کے اس علمی خانوادے نے جس شیفتگی سے مصائب کو سینے سے لگایا ہے اور جس والہانہ جذبے سے سرشار ہو کر اذیتوں اور تکالیف کو برداشت کیا ہے، اور جس استقلال اور جہادِ مسلسل کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے ہے، اس سے یقیناً اس تصور کو بڑی زبردست تائید حاصل ہوتی ہے کہ اسلام ایک زندہ جاوید ضابطۂ حیات اور ایک ایسی راہِ نجات ہے جس پر چل کر تہذیبِ مغرب کی ماری ہوئی، ژولیدۂ فکر اور سسکتی ہوئی انسانیت از سرِ نَو اپنی منزل کی جانب گامزن ہو سکتی اور ابدی کامرانیوں سے سرفراز ہو سکتی ہے۔

اسلامی علوم پر گہری نگاہ اور نظرِ بصیرت کے ساتھ محمد قطب جدید علوم پر بھی مضبوط گرفت اور ناقدانہ رائے رکھتے ہیں۔ انھوں نے تہذیبِ نوی کا ہمہ جہتی مطالعہ کیا ہے اور مادی تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور خیرگی کا پردہ چاک کر کے ان مصائب اور قبائح کو انسان کے سامنے رکھا ہے جو اس پردۂ زنگاری کے پیچھے پنہاں ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انسان آج جن آفات و آلام میں گھرا ہوا ہے ان سے چھٹکارے کا واحد راستہ صرف یہی ہے کہ انسان اسلام کے دامانِ رحمت میں پناہ لے۔ اس نظریے کو پیش کرنے کے لیے اور جدید ذہن کو اسلام آشنا کرانے کے لیے انھوں نے مدلّل و پُرشکوہ اندازِ بیان، سہل و رواں اسلوبِ نگارش اور مؤثر و دلنشین

Marfat.com

طرزِ تخاطب کو اپنایا ہے۔

محمد قطب نے نفسیات کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سالہا سال تک فرائڈ کے شیدائی رہے اور جو کچھ اس کے بارے میں ملتا رہا اسے پڑھتے رہے، مگر مطالعۂ قرآن اور قرآن فہمی نے ان پر یہ عظیم راز منکشف کر دیا کہ جس طرح قرآنِ کریم تمام علوم کا سرچشمہ اور جملہ معاملاتِ زندگی اور مسائلِ حیات میں انسانیت کا رہنما ہے اسی طرح قرآن نے نفسِ انسانی کے بارے میں بھی واضح اشارات دیے ہیں جنھیں اگر مربوط اور مرتب شکل میں پیش کر دیا جائے تو اسلامی نفسیات کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں[1] جن میں انھوں نے جدید نفسیات کے تمام مکاتیبِ فکر پر تنقید کے ساتھ ساتھ انسان اور نفسِ انسان کے بارے میں قرآن اور اسلام کے نقطۂ نظر کو ایسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے جو جدید ذہن کو اپیل کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ان کی زیرِ نظر کتاب " الانسان بین المادیة والاسلام " اس سلسلے کی بڑی اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نفسیات کے بارے میں بالخصوص اور دیگر مادی نظریات کے بارے میں بالعموم انتہائی سلجھے ہوئے اور دلنشین انداز میں گفتگو کی ہے اور انسان اور نفسِ انسانی کے بارے میں مغرب جس فریب اور ژولیدگی کا شکار ہے اس کا پردہ چاک کر کے بتایا ہے کہ انسان اور نفس انسان کے بارے میں قرآن اور اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور یہ کہ اسلام کا نقطۂ نظر ہی فطرتِ انسانی سے مربوط و پیوست اور نفسِ انسانی سے ہم آہنگ ہے اور یہی وہ واحد راہِ عمل ہے جسے اپنا کر انسان سکون و اطمینان

---

[1] پیشِ نظر کتاب کے علاوہ نفسیات کے موضوع پر مصنف کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہیں، جن میں سے پہلی دو کا اُردو ترجمہ راقم الحروف کر چکا ہے:

۱۔ التطور والثبات فی النفس الانسانیة

۲۔ دراسات فی النفس الانسانیة

۳۔ فی النفس والمجتمع

Marfat.com

اور راحت و عافیت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

جہاں تک پیشِ نظر ترجمے کا تعلق ہے اس میں چند باتیں بطور خاص ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں:

(۱) ترجمہ سلیس و رَواں کیا گیا ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ترجمے میں قلم مصنف کی مراد و منشاء کا اظہار بھرپور طریقے پر کرے اور ربطِ مضامین میں مصنف کی ترتیب سے ہٹنے نہ پائے۔

(۲) لفظی ترجمے کے بجائے ترجمانی کے اسلوب کو ترجیح دی گئی ہے کہ یہی اسلوب اس قسم کی کتاب کے لیے موزوں بھی ہے اور مفید بھی۔

(۳) عربی تصانیف اکثر ذیلی عنوانات سے خالی ہوتی ہیں۔ نیز عرب مصنفین قرآنی آیات کے حوالوں کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ ترجمے میں ذیلی عنوانات کے ساتھ آیات کے حوالے بھی مندرج کر دیے گئے ہیں۔

(۴) اکثر مقامات پر فٹ نوٹ دے کر اصطلاحات کی ضروری تشریح دے دی گئی ہے۔ اس طرح اصطلاحات سے ناواقفیت اردو داں طبقے کے لیے کتاب کے سمجھنے میں حارج نہیں رہی ہے۔

(۵) اصطلاحات کے اُردو ترجمے اکثر و بیشتر وہی استعمال کیے گئے ہیں جو اُردو میں پہلے سے مستعمل ہیں۔ البتہ جن اصطلاحات کے مروّجہ اُردو ترجمے زیادہ ادق محسوس ہوئے یا اُردو ترجمے کا علم نہ ہو سکا وہاں وضع اصطلاحات کے ناگوار فرض کو اس طور پر انجام دیا گیا ہے کہ قارئینِ کرام کو مضمون کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ جیسے عشقِ مادر کی اُلجھن (Oedipus Comple.) اور عشقِ پدر کی اُلجھن (Electra Complex)۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ عبارت نفسیات کے فریم میں فٹ آ سکتی ہے یا نہیں؟

مَیں محترم جناب ملک غلام علی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اِس کتاب کے اُردو ترجمے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، نظرِ ثانی فرمائی اور بیشتر مقامات پر مترجم کی بڑی وقیع علمی، فنی اور ادبی رہنمائی فرمائی۔ وما توفیقی الّا باللہ۔

سجاد احمد کاندھلوی

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

(الشمس : ۷ تا ۱۰)

"قسم ہے نفس کی اور جس نے اس کو ہموار کیا

پھر اس کو نافرمانی اور پرہیزگاری کا الہام کیا، جس نے

اپنے نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اسے

خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ مصنّف طبع سوم

اس کتاب میں میں نے کچھ ایسے تجربات وافکار بیان کیے ہیں جن سے انسانی ذہن دوچار ہوتا ہے، اس کے ساتھ میں نے اسلامی نظریات اور مغرب کے مادہ پرستانہ نظریات کا بھی موازنہ کیا ہے، خواہ ان کا تعلق بنیادی نظامِ فکر سے ہو یا اس کی تفصیلات وجزئیات سے ہو۔

اِس ایڈیشن میں میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ کتاب میں کوئی ترمیم و اضافہ نہ کروں اور جس طرح دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا اسی طرح اس تیسرے ایڈیشن کو بھی رہنے دوں، حالانکہ میری خواہش یہ تھی کہ اس کتاب میں اسلامی نفسیات اور اجتماعیات کے جملہ مباحث زیرِ بحث آجائیں۔ بہرحال اس وقت جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں انھیں اسلامی نفسیات کا ابتدائی خاکہ کہا جا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر جامع اور مکمل طریقے پر اسلامی نفسیات مرتّب کی جا سکتی ہے۔ اور مجھے خُدا کی ذات سے اُمید ہے کہ مجھے ایسا موقع میسّر آجائے گا کہ میں اس بحث کو مکمل کر سکوں۔

واللہ ولی التوفیق

محمد قطب

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں فرائڈ سے بہت زیادہ متاثر تھا، یہ وہ دور تھا جب میرے اندر کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں نئی سے نئی معلومات حاصل کرنے کا ایک زبردست جوش اور ولولہ موجود تھا اور میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ فرائڈ کے نظریۂ لاشعور نے مجھے کوئی الٰہ دین کا چراغ بخش دیا ہے جس سے نفسِ انسانی کے سارے پردے ایک ایک کر کے اُٹھتے چلے جائیں گے اور میں بلا تکلف نفس کے حالات کا مشاہدہ کر لوں گا۔

سالوں یہی سودا ذہن میں سمایا رہا، فرائڈ اور اس کے متبعین و شارحین کے اقوال پر جو کچھ جہاں کہیں سے میسّر آتا فوراً پڑھ ڈالتا۔ اگرچہ فرائڈ کے اس نظریے نے مجھے اس وقت بھی حیرت زدہ کر دیا تھا کہ "بشارتی خواب" بے حقیقت ہے اور انسان کا دنیائے نامعلوم سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکتا۔"

غرض میں اپنی ثانوی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی میں آگیا اور طبعی طور پر کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں میری معلومات میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب فرائڈ میں وہ پہلی سی کشش باقی نہیں رہی تھی بلکہ اب رفتہ رفتہ میں اس کا ناقد بنتا جا رہا تھا۔

پھر میں تربیتی ادارے (Training Institute) میں داخل ہو گیا۔ وہاں نفسیات کا بخوبی مطالعہ کیا اور فرائڈ کو بڑی تفصیلی نظر سے دیکھا۔ دورانِ مطالعہ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ ایک طرف تو فرائڈ ہے جو نفس کو ہر بندش سے آزاد کر دیتا ہے اور اس کی پوشیدہ جبلتوں (Instincts) سے

Marfat.com

اخفاء[1] (Suppression) ختم کر دیتا ہے اور دوسری طرف وہ متقشفانہ اور راہبانہ طرزِ عمل ہے جو انسان کی حیوانی قوتوں پر پہرے لگا کر انھیں کچل کر رکھ دیتا ہے —— اور ان دونوں روشوں کے درمیان اسلام کا معتدل اور درمیانہ راستہ ہے کہ اسلام نہ تو اس قدر بندشیں عائد کرتا ہے کہ نفس گھٹ کر رہ جائے اور زندگی کا جوش و ولولہ ہی سرد پڑ جائے اور نہ انسان کو اس قدر آزاد چھوڑتا ہے کہ انسان اپنے مقام سے گر کر حیوان بن جائے اور انسان نے انتہائی محنتوں اور کاوشوں کے بعد جن جذبات کو لگام دی ہے وہ پھر سے آزاد ہو جائیں اور سارا سرمایۂ انسانیت ہی ملیامیٹ ہو جائے۔

اسلام ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک ایسا متوسط اور معتدل موقف اختیار کرتا ہے جس کی وسیع حدود میں انسان ایک متوازن اور پُرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہوئے مجھے تقریباً دس سال ہو گئے ہیں جب ہی سے اِس فکر میں منہمک رہا اور میری یہ فکر روز بروز پختہ ہوتی گئی کہ اسلام نفسِ انسانی کے بارے میں ایک مستقل نظریہ رکھتا ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے اور جس کا باقاعدہ اور خصوصی طور پر مطالعہ ہونا چاہیے۔ میری یہ لگاتار فکر بالآخر مجھے اس مرحلے تک لے آئی کہ اب میں یہ کتاب سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

مجھے اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان، ہمارے دانش ور اور حریتِ فکر کے علم بردار جب نفسیات کے موضوع میں اسلام کا نام سنیں گے تو بُری طرح بدک جائیں گے، ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار پیدا ہو

---

[1] نفسیات کی زبان میں انسان کے جذبات و اعمال پر خارجی کنٹرول اور گرفت اخفاء (Suppression) کہلاتی ہے۔ یہی اخفاء، رفعت —— (Sublimation) کا سبب بنتی ہے۔

Marfat.com

جائیں گے اور وہ یقیناً بیزاری کے عالم میں یہی کہیں گے کہ سائنسی مضامین سے مذہب کا کیا واسطہ؟ اسی لیے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری اس کتاب کا انداز بحث خالص نفسیاتی ہے اور میں اس کتاب میں اسلام کو معروضی طریقے (Objective Method) پر زیرِ بحث لایا ہوں۔ اس معروضی اور خالص فنی بحث (Purely Scientific Study) کے باوجود بھی اگر اسلام کی حقانیت ثابت ہوتی ہے تو رجعت اور جمود کی تہمت سے نہ ڈرنا چاہیے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے اسلام کی بات کی تو لوگ تنگ نظر مُلّا خیال کر بیٹھیں گے!

پھر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یورپ میں سائنس و مذہب کی کشمکش وہاں کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔ کلیسا نے کچھ مفروضہ فلسفیانہ نظریات کو مقدس آسمانی وحی قرار دے کر ان سے انحراف کو کفر کا درجہ دے دیا تھا۔ مگر جب سائنس نے ان نظریات کے بودے پن کو ثابت کر دیا تو طبعی طور پر لوگوں نے تجربی علوم کی تصدیق کی اور جھوٹے کلیسا کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے اور مذہبی افکار سے گلوخلاصی کی کوششیں شروع کر دیں۔

اسلام میں مذہب و سائنس کی ایسی کوئی کشمکش کبھی برپا نہیں ہوئی۔ بلکہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار ماہرینِ فلکیات، طبیعیات، کیمیا، طب، ہندسہ اور ریاضیات پیدا ہوئے ہیں اور سب نے مسلمان اور دیندار رہتے ہوئے سائنسی تحقیقات اور اکتشافات (Discoveries) کیے ہیں۔ یہاں نہ مذہب و سائنس کی جنگ ہوئی اور نہ بادشاہوں نے سائنس دانوں کو قتل کرایا اور انھیں تعذیب خانوں میں ڈالا، جیسا کہ یورپ میں کوپرنیکس اور گلیلیو کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے۔ بلاشبہ اسلام میں بھی بعض مفکرین دورِ مصیبت اور ابتلاء سے گزرے ہیں، مگر اس ابتلاء کی وجوہات سیاسی تھیں۔ خود سائنس اور علم، اسلامی تاریخ میں کبھی بھی محبوس اور پابند نہیں رہے۔ اس لیے اگر ہمارے دانش ور اسلام کے نام سے بدکیں تو اسے آزادیٔ رائے اور علم پروری نہیں، بلکہ

Marfat.com

یوروپ کی اندھی تقلید کہا جائے گا۔

135038

Marfat.com

مسیحی نقطۂ نظر

جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، اس وقت تمام بنی اسرائیل اور ساری رومی دنیا (Roman Empire) سرتاپا مادیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسی سنگین مادیت کہ سب کچھ دنیا اور دنیاوی قدروں کو ہی سمجھ لیا گیا تھا اور "دنیائے روح" اور "نوید آسمانی" سے ہر رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ مسیحیت اسی انتہا پسند مادیت کے مقابلے کے لیے آئی تھی اور اس مقابلے کے لیے ناگزیر تھا کہ مسیحیت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین روحانیت کی علمبردار بنے تاکہ مادیت میں قدرے اعتدال پیدا ہو اور لوگوں کے نفوس کی اصلاح ہو سکے۔

اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام تعلیمات پاکبازی اور روحانیت پر مشتمل ہیں اور انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ اپنی ذات سے بالا اور اپنے جسم اور مادی زندگی سے بلند ہو کر اُس وسیع دنیا اور بلند آفاق سے اپنا رشتہ جوڑ لے جو دنیاوی قیود اور شہوانی میلانات سے بالکلیہ پاک ہے۔

مگر ان بلند پرواز تعلیمات کو انسانیت کے لیے مستقل اور دائمی نظامِ زندگی بنانا خدا کو منظور نہ تھا، چنانچہ اللہ سبحانہ نے صرف چھ صدیوں بعد اپنا آخری نظامِ زندگی انسانیت کو عطا فرما دیا[1]

---

[1] ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہودیت انسان کا دورِ طفولیت ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ بچپن میں ایک قسم کا اشتیاق اور خود نمائی ہوتی ہے اور بچپن میں انسان اپنی خواہشوں پر کنٹرول نہیں کر سکتا — مسیحیت انسانیت کے دورِ نوعمری کی نمائندگی کرتی ہے،

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

بہرحال عیسائیت کی یہ پاکیزہ اور مثالی تعلیمات حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد ایسی بوجھل قیود بن گئیں، جن کے ذریعے اہلِ کلیسا اور اہلِ مذہب عام لوگوں پر ظلم توڑنے لگے، اور اہلِ مذہب نے تعلیماتِ مسیحؑ کو عملی زندگی سے بے تعلق رہبانیت بنا کر رکھ دیا، اور ان تعلیمات کے ذریعے انسان کی فطری جبلتوں (Instincts) پر پہرے بٹھا دیئے، اور دلیل یہ دی گئی کہ یہ جذبات و میلانات ایسی گندگی ہیں جس سے ان پاکباز اور متقی لوگوں کو بچنا چاہیے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور روزِ قیامت خدا کی ملاقات کے امیدوار ہیں، یا —— ان کی تعبیر کے مطابق —— "جو مسیحؑ کے راستے بیں ہیں"۔

شاید کلیسا اور اہلِ مذہب کو مسیحی تعلیمات کے متشددانہ رہبانیت بنانے میں حضرت عیسیٰؑ کے اس قسم کے اقوال نے مدد دی ہو —— کہ

"اگر تیری آنکھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس آنکھ کو نکال پھینک کیونکہ ایک عضو کا ضائع ہو جانا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ تیرا پورا وجود جہنم میں ڈال دیا جائے۔"

مگر ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کی ہدایات پوری طرح نافذ ہو جائیں تو نو بہ نو، لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی رواں دواں یمِ زندگی ٹھٹھر کر رہ جاتی اور بالآخر کاروانِ حیات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جس میں ایک نوجوان سدا خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ اور اسلام انسان کی پختگی کے دور کو ظاہر کرتا ہے جس میں انسان ہر شے کو اس کا صحیح مقام دیتا ہے، نہ بالکل دنیاوی معاملات میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے، اور نہ دنیا سے ناطہ توڑ کر صرف روحانیت میں کھو کر رہ جاتا ہے، بلکہ ان دونوں اُمور میں توازن اور اعتدال برتتا ہے۔ اس لحاظ سے مسیحیت نے بلاشبہ اپنا صحیح کردار تو ادا کیا مگر اس میں دائمی نظامِ زندگی بننے کی بہرحال صلاحیت نہ تھی۔

Marfat.com

ہی لُٹ جاتا۔ بلاشبہ نزولِ مسیحیت کا نہ یہ مقصد تھا اور نہ انسانی فلاح کے اس پیغام سے حضرت عیسیٰؑ کی یہ منشاء تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسیحیت کو اس کے اصل مقصد سے دُور کر کے اسے انتہا پسندانہ شکل خود پیروانِ مسیحؑ نے دی ہے۔

مسیحی تعلیمات اور نفسیاتی اُلجھنیں

مسیحیت اپنی اِس شکل میں کبھی بھی عملی زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ اس عملی صورت میں نہ صرف یہ کہ اس کے مطالبات انسان کی طاقت سے زیادہ ہیں بلکہ اس طرح طبعی تقاضوں کا مٹا دینا بھی ایک امرِ محال ہے۔ جسم کے تقاضے بڑے تُند و تیز ہُوا کرتے ہیں، جو بڑی شدت اور زور کے ساتھ انسان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان تقاضوں کی تکمیل کرے۔ اگر انسان جبلت کے پیہم اور مسلسل دباؤ اور اس جبلت کی تکمیل کو گندگی قرار دینے والے عقیدے کے درمیان گِھر کر رہ جائے، تو اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ یا تو انسان اگر ممکن ہو ـــــ تو عقیدے کی پکار پر لبیک کہہ کر راہب بن جائے اور ترکِ دنیا کر کے دنیا والوں سے ہر رشتہ منقطع کر لے، یا جسمانی تقاضوں کی بپھرتی ہوئی لہروں کا راستہ نہ روکے اور محبوس توانائیوں کو پوری طرح آزاد کر دے۔ مگر اس کے باوجود انسان ذہنی اذیت سے نہیں بچ سکتا، بلکہ ضمیر کی ایک سخت تکلیف دہ کش مکش سے دو چار ہو جائے گا۔ کشمکش ان افعال کے درمیان جو انجام دیے ہیں اور جو انجام دیے جانے چاہیے تھے۔ کش مکش جسم اور روح کے درمیان۔ ایسی کش مکش جو بالآخر ان نفسیاتی اُلجھنوں پر منتج ہوتی ہے جن کی فرائڈ نے نشاندہی کی ہے اور جن کی تحقیق میں عمر کا ایک بڑا حصہ لگایا ہے ـــــ یا پھر یہ کشمکش ایسے اعصابی اضطرابات پر منتہی ہوتی ہے، جن سے انسان کی ساری عملی صلاحیتیں اور قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور انسان اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی صلاحیتوں سے خود فائدہ اٹھائے یا بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچائے۔

ہم مندرجہ بالا بیان کی وضاحت کے لیے بطور مثال جنسی توانائی کو پیش

Marfat.com

کرتے ہیں۔ مسیحیت تجرُّد کی زندگی کو مثالی زندگی (Ideal Life) قرار دیتی ہے۔ گویا کہ اس طرح انسان جسم کو کمزور اور روح کو پامال کرنے والی تباہ کن شہوانی قوت سے بچا رہتا ہے۔ مشہور یہی ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ نے شادی نہیں کی تھی۔ چنانچہ بہت سے اہلِ مذہب اور پرہیزگار لوگ اس سنت پر عمل کرتے ہیں اور مسیحیت کی نظر میں ایسے لوگ ہیرو خیال کیے جاتے ہیں جو جسم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کر کے شیطانی جذبات پر غالب آجائیں، کیونکہ مسیحیت کی نظر میں سب سے بڑا شیطان عورت ہے جو مرد کو فریب دے کر اس کے دل میں وہ جذبات اُبھار دیتی ہے جن سے پرہیزگار لوگوں کو بچنا چاہیے۔

اہلِ مذہب اور پارسا لوگوں کے علاوہ ظاہر ہے کہ باقی ساری قوم شادیاں کرتی ہے اور تمام لوگ زندگی کی رنگینیوں سے کٹ کر رہبانیت نہیں اختیار کر لیتے ــــــ مگر مشکل یہ ہے کہ مسئلہ صرف شادی سے حل نہیں ہوتا۔ ایک ایسا بچہ جو مسیحی عقیدے کی فضا میں پروان چڑھتا ہے، اس کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کے نفس میں جنس کو بُرا سمجھنے کی الجھن بھی بڑھتی جاتی ہے کیونکہ مذہبی ہدایات، اہلِ مذہب، مقدس کتابیں، والدین، اسکول اور موعظت و نصیحت پر مشتمل کتابیں۔ غرض تمام ذرائع اس کے ذہن میں جنس کی بُرائی اتارتے رہتے ہیں۔ مگر جب بچہ جوان و بالغ ہوتا ہے تو اس کے گرد تند و تیز جسمانی تقاضے گردابِ بلا کی طرح لپٹ جاتے ہیں اور اسے دن کے ہر لمحے اور رات کی ہر گھڑی جسم کی یہی پکار سُنائی دیتی رہتی ہے کہ اُٹھ اور میرے تقاضے پورے کر، اور تیرے بدن میں لذتوں کا جو سوتا اُبل رہا ہے اس سے لطف اندوز ہو ــــ ایک طرف تو یہ پکار سُنائی دیتی ہے اور دوسری طرف کسی نادیدہ ہاتھ میں ننگی تلوار ہوتی ہے اور فضا میں سرزنش کا کوڑا معلّق ہوتا ہے جو اس نوجوان کی پیٹھ پر برس رہا ہوتا ہے، یہ کوڑا خدا، پادری، باپ یا استاد کسی بھی دھمکانے اور ڈرانے والے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

یہیں سے کشمکش کا آغاز ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

جسم کی پکار نو بہ نو اور مسلسل ہے اور دینی تعلیمات جو جنس کو گندگی اور آلودگی قرار

Marfat.com

دیتی ہیں اور جو بچپن سے اس کی لوحِ ذہن پر مرتسم کی جا رہی ہیں، وہ بھی بار بار مسلسل یاد دہانی کراتی رہتی ہیں۔ اسی کش مکش سے نفسیاتی الجھنیں اور اعصابی اضطراب پیدا ہوتے ہیں جو شادی کے بعد بھی زائل نہیں ہوتے، بلکہ علم طب اور تحلیلِ نفسی (Psycho Analysis) نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ازدواجی زندگی کی ناکامیوں کے بیشتر اسباب، جو بچپن اور ابتدائے شباب سے متعلق ہوتے ہیں، شادی سے یہ اسباب دُور ہونے کے بجائے پھیل کر اس طرح وسیع ہو جاتے ہیں، جیسے خود ذہن کے سامنے کوئی چھوٹا سا نقطہ پھیل جاتا ہے۔

مسیحی تعلیمات کے انسانی طبیعتوں سے متصادم ہونے سے انسانی طبائع میں جو اضطراب رونما ہوتا ہے یہ اس کی ایک واضح اور نمایاں مثال ہے۔ مگر یہی تنہا مثال نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کا درج ذیل قول بھی اس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے:

"اگر کوئی تمھارے داہنے رخسار پر چانٹا مار دے تو دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو۔"

بلاشبہ یہ معافی اور عفو و درگزر کی انتہائی پاکیزہ دعوت ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسے کتنے لوگ ہیں جو فرشتہ بن کر اور اپنی آتشِ غضب کو سرد کر کے ایسی معافی اور درگزر سے کام لیں گے۔ ایسے لوگ یقیناً انتہائی کم ہوں گے۔ اکثریت تو ایسے ہی لوگوں کی ہوگی جن کے دلوں میں اس موقع پر انتقامی جذبات پیدا ہوں گے۔ جو اپنی توہین پر تلملائیں گے اور اپنی خودداری اور ذاتی وقار کے تحفظ کے لیے برسرِ پیکار ہو جائیں گے۔ اس مرحلے پر جب ایک طرف جذبۂ انتقام زور کر رہا ہوگا (جسے مسیحیت شیطانی اکساہٹ قرار دیتی ہے) اور دوسری طرف وہ اعلیٰ تر تعلیمات ہوں گی جو اللہ یا مسیح کی رضا کے لیے عفو و درگزر کے محبوب کا فتویٰ دے رہی ہوں گی، اس وقت ایک سچے اور مخلص عیسائی کا موقف کیا ہوگا؟ یہیں سے اس کشمکش کا آغاز ہوگا جس کا انجام ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات ہوگی کہ یا تو یہ بلند تعلیمات کامیاب ہو جائیں گی اور انسان جذبۂ انتقام کو اپنے دل کی

Marfat.com

گہرائیوں میں دھکیل دے گا جس کے بارے میں تحلیلِ نفسی (Psycho Analysis) بتاتی ہے کہ بیشتر جرائم اسی دباؤ (Repression)[1] کا نتیجہ ہوتے ہیں — یا یہ جذبۂ انتقام غالب آجائے گا تو آتشِ غضب سرد ہونے کے بعد نفس میں ندامت و افسوس اور احساسِ گناہ پیدا ہوگا، جو کسی صورت چین نہیں لینے دے گا۔ غرض مسیحیت کی جملہ پاکیزہ اور سخت گیر تعلیمات کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی عقیدے اور فطری جبلتوں کی دائمی کشمکش میں گزار دے اور تمام زندگی ایک ایسے کربِ مسلسل کی نذر ہو جائے کہ انسان کو زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا کوئی لمحہ نصیب نہ ہو سکے۔

مسیحیت اور عملی زندگی

انسانی طبیعت اور مسیحی تعلیمات کے اس واضح تعارض کے پیشِ نظر یہ تاریخی حقیقت قابلِ تعجب نہیں ہے کہ مسیحیت کبھی بھی پوری طرح عملی زندگی میں نافذ نہیں ہو سکی ہے، سوائے ان چند افراد کے جنھوں نے زندگی سے کنارہ کشی کر کے رہبانیت

---

[1] دباؤ (Repression) وہ عمل جس کے زیرِ اثر کچھ خواہشیں، جذبات اور میلانات شعور سے لاشعور میں چلے جاتے ہیں کیوں کہ ان کا شعور میں رہنا غیر سماجی (Anti Social) ہوتا ہے۔ یہ خواہشیں لاشعور میں چھپ کر الجھن بن جاتی اور شعور میں گڑبڑ مچاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بچے کو ماں باپ مسلسل یہ نصیحت کرتے رہیں کہ وہ اپنی چھوٹی بہن سے پیار کرے، تو وہ اپنے ماں باپ کی خوشنودی کی خاطر اپنی بہن کے لیے اپنے حاسدانہ جذبے (Jealous Feeling) کو چھپا لے گا، مگر بڑے ہو کر یہی جذبۂ حسد اس میں عدمِ تحمل، دوسروں پر غصہ اور اپنے اوپر رحم کھانے کی عادت پیدا کر دے گا، اور اپنی بہن کے خلاف جارحانہ جذبات خود اس میں جھنجھلاہٹ (Frustration) اور بیماری پیدا کر دیں گے۔ (س۔ صدیقی)

دیکھیے: R. Macdonald Ladell : *A dictionary of Psychological Terms.*

Marfat.com

اختیار کرلی کیونکہ رہبانیت ہی ایک ایسا طرز عمل تھا جس کے ذریعے وہ مسیحیت کو مطلوبہ مکمل شکل میں اپنی زندگی میں نافذ کرسکتے تھے۔

یہ بہرحال انسانیت کی خوش نصیبی تھی کہ مسیحیت اس قدر محدود دائرے میں بند رہی ورنہ اگر تمام انسان "آسمانی احکام" کی بجا آوری میں عملی زندگی سے رشتہ توڑ کر عبادت خانوں میں محصور ہو جاتے تو انسانیت کو کس قدر تباہی کا سامنا کرنا پڑتا، نسل انسانی منقطع ہو جاتی اور انسانی پیش رفت کا ہر سلسلہ بالکلیہ ختم ہو کر رہ جاتا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ کچھ سیاسی اور تاریخی اسباب کے زیر اثر مسیحیت روئے زمین کے ایک بڑے حصے میں پھیل تو گئی، مگر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسیحیت عملی زندگی سے پوری طرح کبھی بھی ہم آہنگ نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ کلیسا کی حدود میں بند رہ کر لوگوں پر اس وقت سایہ فگن ہوتی جب وہ کلیسا میں عبادت کر رہے ہوتے یا کتاب مقدس کی آیات سن رہے ہوتے۔ مگر جب یہی لوگ اپنی عملی زندگی میں آتے تو یہ مسیحی نہ ہوتے بلکہ صرف انسان ہوتے۔ ان میں سے کوئی بھی داہنے رخسار پر چانٹا مارنے والے کے سامنے اپنا بایاں رخسار پیش نہ کرتا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی آنکھ اس وجہ سے نکال کر نہ پھینکتا کہ یہ آنکھ گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس بات پر تیار نہ ہوتا کہ اس کے کسی گناہ کے کفارے میں اس کا کوئی حصۂ بدن ضائع ہو جائے۔

غرض تمام مغربی مسیحی معاشرے اگرچہ بظاہر مسیحیت پر یقین رکھتے تھے، اور اکثر و بیشتر انتہائی وحشیانہ پن اور نہایت بہیمیت کے ساتھ اس کے دفاع میں جنگیں بھی لڑتے رہتے تھے (جیسا کہ صلیبی جنگوں اور تحقیقاتی عدالتوں (Inquisition Courts) میں یہی کچھ ہوا)۔ مگر اس کے باوجود عملی زندگی میں مغربی معاشرے ہمیشہ رومی قانون اور سلطنتِ روما (Roman Empire) کی بت پرستانہ تعلیمات کے زیر اثر رہے۔

مسیحیت کی عملی زندگی سے عدم ہم آہنگی کے باوجود ان آثار میں کوئی کمی نہیں آئی جو مسیحیت اور انسانی طبیعت کے تعارض سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ مسیحیت کے

Marfat.com

ماننے والوں میں نفسیاتی کش مکش اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ ماضی قریب کے دَور میں انھوں نے مذہب سے بالکلیہ چھٹکارا نہ پالیا۔ کیونکہ بچپن کی تعلیمات ذہنِ انسانی پر انمٹ نقوش مرتسم کردیتی ہیں اور مسیحی تعلیمات پر عمل نہ کرے اور والدین اور اسکول اور کلیسا کے اقتدار سے آزاد ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مسئلہ ختم ہو گیا اور پوشیدہ کش مکش کو سکون میسر آگیا بلکہ تحلیلِ نفسی (Psycho Analysis) کے ماہرین نے ثابت کر دیا ہے کہ مغربی دنیا کے لوگوں کی بیشتر نفسیاتی الجھنوں کی اصل وجہ مذہب کا ذہن پر تسلط ہے (اگرچہ وہ بڑے ہو کر مذہب کے پابند نہیں رہتے)۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف مسیحیت کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر مذہب نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کے مغرب کے ماہرینِ نفسیات جہالت سے یا بدنیتی سے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور شرقِ اسلامی میں علمِ نفسیات سے شغف رکھنے والے لوگوں نے ان کی پیروی کی اور کہنے لگے کہ تمام مذاہب انسانی طبیعتوں کے خلاف ہیں، اس ذہنی غلامی کا خاتمہ کر کے اسے ان زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے، تاکہ انسان سعادت و راحت محسوس کرے اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو۔

زیرِ نظر کتاب کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ نفس انسانی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر انسانی طبیعت سے بخوبی ہم آہنگ ہے۔ اس حقیقت کو خصوصیت کے ساتھ ایک علیحدہ باب میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اسلام انسانی وجود کے تمام جذبات اور میلانات کا لحاظ رکھتا ہے اور ان جذبات و میلانات کو مہذب بناتا اور انھیں ان حدود میں رکھتا ہے جو اجتماعی مصلحتوں اور فرد کے مفاد کے لیے ضروری ہیں۔ اسلام جب یہ مطالبہ کرتا ہے کہ نفسِ انسانی بلندی اور رفعت اختیار کرے تو وہ اسے ایسا فرض نہیں قرار دیتا کہ اس کا مخالف اللہ کے سامنے اور شریعت کی نظر میں گناہگار سمجھا جائے بلکہ اس کے لیے ایک کم سے کم حد مقرر کر دیتا ہے جس کے بغیر زندگی کا نظام دُرست نہیں رہ سکتا۔ اور اس معمولی سی حد کو فرض قرار

Marfat.com

دینے کے بعد فضیلت اور پاکیزگی کے لیے بڑا وسیع میدان چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ریاضتیں بطورِ نفل حاصل کی جاتی ہیں اور یہ ایسا بوجھل فرض نہیں ہوتیں جو نفس پر بار پہنچائیں اور زندگی کے میلانات کو دبا کر رکھ دیں۔

سائنس اور کلیسا کی جنگ

اس مرحلے پر یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم بعض ایسے تاریخی واقعات کا تذکرہ کریں جو علم النفس سے متعلق نظریات کے ارتقاء پر اثر انداز ہوئے ہیں اور ان تبدیلیوں کا جائزہ لیں جو نتیجۃً انسانی زندگی اور معاشرے میں رونما ہوئی ہیں۔

مغرب میں مسیحیت کی نمائندگی کلیسا نے سرانجام دی مگر اس نے مسیحی تعلیم کے مطابق صرف روحانی دعوت پر اکتفا نہیں کیا اور نہ اس بات کی کوشش کو کافی گردانا کہ انسانیت اس بلند درجے تک ارتقاء حاصل کرلے جو انبیاءؑ اور مقدس لوگوں کا شیوہ رہا ہے، بلکہ کلیسا خود اقتدار کا دعوے دار بن کر ایک زمانے تک لوگوں کی عقل وروح اور ان کے جسموں پر مسلط رہا اور بڑی وحشیانہ اور سنگدلانہ آمریت قائم کیے رکھی۔

کلیسا جسے محبت والفت اور نرمی ومہربانی کا گہوارہ ہونا چاہیے تھا، وہ ایک خوفناک بھوت بن کر لوگوں کو لپٹ گیا کہ لوگ سوتے جاگتے اس سے ڈرتے۔ کلیسا ان پر تاوان لگاتا اور عوام پر ان اہلِ دین کی تقدیس لازمی قرار دیتا تھا جو اپنے آپ کو تمام انسانوں سے زیادہ مقدس اور برگزیدہ خیال کرتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیسا نے ان پر کچھ مخصوص خیالات، آسمانی افکار قرار دے کر ٹھونس دیے تھے۔ ان سے گریز کرنے والے کو مسیحیت اور کلیسا کا منکر سمجھا جاتا اور اس پر خدا کی، پادری کی، حکومت کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی تھی۔ چنانچہ جب کچھ سائنسدانوں نے زمین کے گول ہونے کا نظریہ اختیار کیا تو انہیں کلیسا کے مقدس افکار کے برخلاف نقطۂ نظر رکھنے پر سخت سزائیں دی گئیں اور

Marfat.com

شدید ظلم وستم کیا گیا۔

ایسی صورت میں بلا شبہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ سائنس اور کلیسا کی جنگ میں لوگ کلیسائی افکار سے منکر ہو کر صرف ان باتوں پر یقین کر لیں جنھیں سائنس ثابت کرتی ہے۔ اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کلیسا کے استبداد اور آمریت کے مدِّمقابل آجائیں، اور سائنس کا زبردست ہتھیار ہاتھوں میں لے کر کلیسائی اوہام کے بت پاش پاش کر دیں، اس کے وجود کو جھنجوڑ ڈالیں اور اس کے ماننے والوں کے دلوں سے اس کی تقدیس وعظمت کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں!

کلیسا کو سب سے بڑا صدمہ اس وقت سہنا پڑا جب ڈارون[1] (Darwin) نے اصل انواع (Origin of Species) کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اور اس کے بعد مسلسل سائنس دان اور محققین کاری ضربیں لگاتے رہے، یہاں تک کہ کلیسا کا تختِ اقتدار لرز کر رہ گیا اور اس میں اس قدر قوت وشوکت باقی نہ رہی کہ وہ زیادہ دیر لوگوں کے عقل وضمیر پر حکمرانی کر سکے۔

---

[1] چارلیس رابرٹ ڈارون (Charles Robert Darwin, 1809—1882.) انگریز سائنس دان جس نے نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کا اصول پیش کیا۔ پیدائشی طور پر ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن طبعًا سائنس اور سائنٹفک مطالعے سے انتہائی شغف رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے نظریات کی براہِ راست زد کلیسائی نظام پر پڑی۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف جو ادبی اعتبار سے بھی ایک شہ پارہ ہے (Origin of Species) 'اصل الانواع' ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی جس سے یورپ کے علمی اور مابعد الطبیعاتی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ دوسری اہم تصنیف (Descent of Man) 'نسب نامہ آدم'، ۱۸۷۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ہر دو کتابوں پر مذہبی حلقوں میں تو بڑی لے دے ہوئی مگر سائنس دانوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ (س۔ صدیقی)

Marfat.com

یوروپ سے کلیسا کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ مذہب کا اقتدار بھی ختم ہو گیا کیونکہ مذہب کی نمائندگی کلیسا ہی کرتا تھا اور مذہب کو جس شکل میں کلیسا نے پیش کیا تھا اس میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جو خلافِ عقل اور فہم و دانش کے لیے بارگراں تھیں۔ (چنانچہ مسئلہ تثلیث بھی اسی قسم کے تضادات کی ایک مثال ہے)۔

بہرکیف یوروپ کلیسا اور مذہب کے اقتدار سے نکل کر کلیتہً رومی تہذیب کا حامل بن گیا اور یہ رومی تہذیب جو محض جسم کے مطالبات سے آشنا تھی اور مادیات و محسوسات کے ماسوا کسی شے پر ایمان نہ رکھتی تھی اس کے سامنے کوئی دوسری چیز نہ ٹھہر سکی۔

اس کے بعد کلیسائی مذہب کے کھنڈرات پر ایک خالص مادّی فلسفہ کی عمارت قائم کی گئی جس نے انسان کو دنیا اور مادے کا ایسا اسیر بنا دیا کہ اس کی نظر قطعاً اس قابل نہ رہی کہ ذرا بھی دنیاوی سطح سے بلند ہو سکے۔

اس تاریخی انقلاب کا اوّلین ہیرو ڈارون ہے جس نے پورے زور اور قوت سے اعلان کیا کہ انسان میں کوئی خدائی روح موجود نہیں ہے اور وہ صرف ایک مادّی حیوان ہے اور اس طرح انسان کو فرشتوں کی دنیا سے نکال کر دوبارہ زمین پر لا پھینکا۔

اس موقعے پر ڈارون کے نظریات کا بیان پیشِ نظر نہیں ہے اور نہ ہی اس کلیسائی غلطی کا تذکرہ مقصود ہے جو اس نے ڈارون کے سائنسی نظریات کا اپنے فلسفیانہ تصورات سے کر کے کی تھی، بلکہ میں صرف اس حقیقت کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں کہ ڈارون کے نظریے کا (ان صحیح واقعات کے علاوہ جن میں سے بیشتر کی صحت سائنس نے ثابت کر دی ہے) اصل محرک ایسا خالص مادی اور دنیاوی فلسفہ ہے جس میں دنیا اور محسوس مادے سے بالاتر ہو کر سوچنے کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی ہے۔ ڈارون کے پیروکار ابتدائے حیات کے مسئلے پر بحث سے پہلو تہی بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ کسی ایسے برتر وجود کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

Marfat.com

جو زندگی کا نگران ہو اور جس کا تخلیق حیات اور انشائے زندگی میں کوئی دخل ہو، کیونکہ ڈارونزم تمام تر ایک مادی فلسفہ ہے جو ایسی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا جو محسوسات کے دائرے سے باہر ہو اور جو اس محسوس دنیا سے علیحدہ ہو، جس کو انسانی عقل دیکھ سکے اور جہاں تک سائنس رسائی حاصل کر سکے۔

وقت کے تمام غالب فلسفے اور مغرب کے تمام جدید نظریات اسی مادی فلسفے سے اُبھرے ہیں۔ مشرق میں کارل مارکس[1] (Karl Marx) کی اشتراکیت، مغرب میں فرائڈ کی نفسیات اور امریکہ میں عملیت[2] (Pragmatism)، سب اسی فلسفۂ مادیت

---

[1] کارل مارکس (Karl Marx, 1818—1883.) جدید اشتراکیت کا بانی جرمنی میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ فلسفہ میں پی ایچ ڈی کیا، ابتداءً ہیگل کا حامی تھا، ۱۸۴۳ء میں پیرس چلا گیا، وہاں انگلز سے ملاقات ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں پیرس سے نکال دیا گیا تو بلجیم چلا گیا، انگلز کے ساتھ مل کر اپنا منصوبہ اشتراکی منشور (Communist Manifesto) کے نام سے پیش کیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے مزدوروں کی پہلی انٹرنیشنل کیمونسٹ انجمن قائم کی۔ زندگی کے آخری برسوں میں اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" (Das Kapital) تصنیف کی، جو اشتراکیوں اور اشتمالیوں کے لیے ایک الہامی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

[2] عملیت (Pragmatism) ایک امریکی فلسفہ جس میں انسانی جدوجہد سے حاصل ہونے والے عملی نتائج کو فلسفیانہ افکار کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا پیمانہ قرار دیا جاتا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیے — منیر البعلبکی، المورد، دار العلم، بیروت)۔

پراگماٹزم کے بارے میں تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

Paul Edwards, *Encyclopeadia of Philosophy*, Vol. 6. P. 424.

London

Marfat.com

کے برگ و بار ہیں اور ان سب کی اصل ایک ہی ہے، اگرچہ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ہیں۔

نفسیات کے مختلف اسکولوں پر تنقید اور تبصرے سے پہلے یہ تاریخی پس منظر بیان کرنا ضروری تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ مختلف نظریات کس طرح پیدا ہوئے اور وہ کس قسم کے حالات تھے جو ان کے وجود میں آنے کا ایک منطقی سبب بنے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جن افکار کو ہم شک و شبہ سے بالا اور ثابت شدہ سائنسی حقائق سمجھتے ہیں یا جنھیں ہم خالص معروضی (Objective) مسائل خیال کرتے ہیں، وہ سب اسی مادی فلسفے کا نتیجہ ہیں اور کچھ مخصوص نفسیاتی محرکات کا ایک لازمی اور ناگزیر ردِعمل ہیں۔

اس موقعے پر میرا خیال یہ ہے کہ میں فرائڈ کے افکار و نظریات ذرا تفصیل سے بیان کر دوں اور نفسیات کے دیگر اسکول اجمالی طور پر بیان کر دوں۔ اس خیال کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کتاب کا مقصد تمام نفسیاتی نظریات کو پیش کر کے پھر اسلامی نظریے سے موازنہ نہیں ہے، بلکہ پیشِ نظر یہ ہے کہ صرف اہمیت کے حامل اور سماج پر گہرے اثرات چھوڑنے والے نظریات کو بیان کر دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر نظریات جو اپنی جزئیات اور تفصیلات میں بظاہر فرائڈ کے افکار سے مختلف نظر آتے ہیں، وہ بالآخر انسان کی حیوانیت اور مادیت کی اصل بنیاد پر آکر باہم متحد ہو جاتے ہیں اور اس اصل بنیاد کے لحاظ سے ان میں اور فرائڈ کے افکار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس لیے فرائڈ کے افکار کو بالتفصیل بیان کر دینے سے نفسیات کے ان تمام مکاتیبِ فکر کی کسی نہ کسی درجے میں وضاحت ہو جائے گی۔

Marfat.com

Marfat.com

فرائڈ کے افکار و نظریات

مغربی دنیا میں فرائڈ[1] (Freud) ایک عظیم شخصیت کا حامل ہے۔ جدید

---

[1] سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud, 1856—1939.) آسٹریا کا یہودی باشندہ۔ فیرمبرگ میں پیدا ہوا۔ نازیوں نے جب ۱۹۳۷ء میں آسٹریا کا الحاق کر لیا تو اس نے انگلستان میں پناہ لی۔ ۱۸۸۱ء میں ویانا یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی اور وہیں طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۶ء تک پیرس میں رہ کر اس نے شارکت (Chroct) کے طریقِ علاج کا مطالعہ کیا۔ ویانا واپس آکر اس نے ڈاکٹر جوزف بریور (Joseph Breuer) سے ایک اور طریقِ علاج سیکھا۔

۱۸۹۰ء میں فرائڈ نے تحلیل ذات (Self Analysis) کے طریقے پر اپنے ہی لاشعور کی طاقتوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا اور اپنے خوابوں کی تحلیل و تعبیر بھی۔ اسی زمانے میں اس نے اپنے زیرِ علاج مریضوں کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر انسانی شخصیت کے بارے میں ایک جدید نظریے کی داغ بیل ڈالی۔

۱۹۰۰ء میں اس کی کتاب تعبیر خواب (Interpretation of dreams) شائع ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں اس کی کتاب "روزمرہ زندگی کی نفسیات" (The Psychology of Every day Life) شائع ہوئی۔ جس میں اس نے بتایا کہ معمولی غلطیاں، فروگذاشتیں، حادثات، ناقص حافظہ، لغزشِ زبان وغیرہ سب لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہیں۔ فرائڈ جدید علم نفسیات کا بانی اور تحلیلِ نفسی کا موجد ہے۔ (س۔ صدیقی)

Marfat.com

علمِ نفسیات پر اس کے افکار و نظریات کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ حد یہ ہے کہ فرائڈ کے اثرات نفسیات، تربیت و تعلیم سے گزر کر ادب و فن، طب و تجارت۔ غرض زندگی کے ہر ہر شعبے میں سرایت کر گئے ہیں۔ مگر اس کے سب سے زیادہ گہرے اور شدید اثرات یورپ اور امریکہ کی موجودہ اجتماعی زندگی پر مرتسم ہوئے اور وہیں سے ایک متعدی بیماری کی طرح مشرق میں بھی پھیل گئے۔ اس کے نظریۂ لاشعور ——— (Unconscious) اور انسانی اعمال کی جنسی تعبیر (Sexual Interpretation) نے دورِ جدید کی اجتماعی زندگی میں ایک تہلکہ مچا کر رکھ دیا ہے۔ ہر چند کہ نفسیات میں نئے نئے نظریات بھی فروغ پا رہے ہیں، مگر مغرب کی بیشتر فکری پیش رفتوں میں اصل محرک فرائڈ کے افکار ہیں اور ہر ذہنی اُپج کے پروان چڑھنے کے لیے توانائی اسی کے نظریات سے ملتی ہے۔

بلاشبہ فرائڈ عبقریت (Genius) کی حامل ایک عظیم شخصیت ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کے تمام افکار و خیالات درست سمجھ لیے جائیں اور یقین کر لیا جائے کہ اس نے نفسِ انسانی کی تعبیر میں کوئی بنیادی غلطی نہیں کی ہے۔

فرائڈ کے افکار و نظریات پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں، خاص طور پر انسانی زندگی کو جنس کی آلودگیوں میں تھیڑنے پر تو بہت واویلا مچا ہے۔ یہ نقاد کہتے ہیں کہ فرائڈ نے غیر مستقیم (Abnormal) لوگوں کا جائزہ لے کر ان سے عام احکامات مستنبط کر لیے اور انھیں مستقیم (Normal) لوگوں پر بھی چسپاں کر دیا۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ فرائڈ کا خود انسان کے بارے میں نقطۂ نظر غلط ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسان ایک خالص مادّی وجود ہے اور وہ جب تک خلافِ معمول (Abnormal) حالات سے دوچار نہ ہو اس کے میلانات و جذبات کسی طرح ارضی کشش سے نہیں نکل سکتے۔

فرائڈ کے افکار پر نظریہ ڈارون کے اثرات

گزشتہ باب میں اس جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فرائڈ ڈارون سے

Marfat.com

متاثر ہے۔ اور ڈاروِن اس بات کا قائل ہے کہ انسان ایک مادی حیوان ہے۔ اس موقعہ پر ہم اس بات کی قدرے وضاحت مناسب خیال کرتے ہیں:

نظریۂ ڈاروِن کی اصل غلطی ان سائنسی حقائق میں پنہاں نہیں ہے جو اس نے اپنی کتابوں میں بیان کیے ہیں اور جن کو اس کے پیروکاروں نے آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ حقیقی خرابی اس نظریہ کے پسِ پردہ ان تصورات میں کارفرما ہے، جنھوں نے اس کے دَور سے لے کر تا دَورِ جدید عام لوگوں اور سائنس دانوں کے ذہنوں پر اپنے سنگین اثرات مرتب کیے ہیں۔

اگرچہ آج بھی کچھ سائنس دان ڈاروِن کے نظریات اور اس کے بیانات کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر اس کے سائنسی بیانات میں سے بہت سی باتیں پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ چکی ہیں۔ اس لیے ہم اس موقعہ پر اس کے سائنسی بیانات کے درپے نہیں ہونا چاہتے۔ بلکہ ہم تو اس فلسفے کو بیان کرنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ نظریہ وجود میں آیا اور جو بعد میں اس کے انطباقات (Applications) پر اثر انداز ہوتا رہا۔ یہ فلسفہ نہ تو کوئی سائنسی حقیقت (Scientific Fact) ہے اور نہ ایسی ثابت شدہ معروضی حقیقت (Proved Objective fact) ہے کہ اسے تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔ بلکہ یہ ایک شخص کا اپنا ذاتی خیال اور اپنا مخصوص نقطۂ نظر ہے جس پر یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس سے بہت سے حقائق بھی منکشف ہوئے ہیں، بخوبی گرفت کی جا سکتی ہے۔ اصل میں حقائق بذاتِ خود اثر انداز نہیں ہوا کرتے (یہاں تک کہ تجرباتی سائنس میں بھی اثر انداز نہیں ہوتے جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں) بلکہ اثرات ان اسالیب اور ان مقاصد سے مرتب ہوا کرتے ہیں جو ان حقائق کے پیش کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔

اس حقیقت پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اہلِ مشرق سائنس کا نام سنتے ہی مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس اب حقیقت اس قدر کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ اس حقیقت سے اعراض کوئی جاہل اور درماندہ عقل ہی

Marfat.com

کر سکتا ہے۔ حالانکہ سائنسی معلومات پر یقین کرنے میں ہمیں محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ (اگرچہ ان معلومات کا تعلق ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا جیسے حسابی علوم ہی سے کیوں نہ ہو)۔ جبکہ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ سائنس آج بھی اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی ہے۔ آئے دن تحقیق و اکتشاف کے نئے نئے پہلو سامنے آکر ان حقائق کو باطل قرار دیتے رہتے ہیں جنھیں کل تک شک و شبہ سے بالا، ناقابلِ انکار آخری اور حتمی حقیقتیں سمجھا جاتا رہا ہے۔

ابھی قریب کے دور میں آئن اسٹائن[1]، نیوٹن[2] کے نظریہ کشش کو رد کر چکا ہے اور بتا چکا ہے کہ یہ نظریہ کرۂ ارض پر تو منطبق ہو سکتا ہے۔ مگر عظیم تر کائنات پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ ایک محدود حقیقت اور ترمیم —— (Modification) و تبدیلی کے قابل ہے۔

اور آج ایٹم (Atom) کی دریافت سے کائنات اور زندگی کے بارے میں

---

[1] آئن اسٹائن (Professor Albert Einstein, 1879—1955)
جو من نژاد یہودی جسے ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت نے دیس نکالا دیا۔ اس وقت تک وہ برلن میں قیصر ولہیلم کے ادارۂ طبیعیات کا ناظم تھا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد وہ امریکہ میں طبیعیات کا پروفیسر رہا۔ ۱۹۲۱ء میں نوبل پرائز ملا۔ اور ۱۹۲۵ء میں کوپلے میڈل (Copley Medal) دیا گیا۔

آئن اسٹائن کے نظریات نے کوپرنیکی نظام کو تہ و بالا کر دیا، نیوٹن کے کلیات کی بنیادیں منہدم کر دیں اور کائنات کی ایسی تصویر پیش کی جس نے زمان و مکان کی ماہیت کے بارے میں ہمارے نقطہ ہائے نگاہ کو یکسر بدل ڈالا۔ (س۔ صدیقی)

[2] نیوٹن (Sir Issac Newton, 1642—1727.)
جدید سائنس کا ابوالآباء۔ ریاضیات، فلکیات اور طبیعیات کا ماہر۔ کلیات تجاذب اور قوانین حرکت کا موجد۔ اس کی عظیم الشان تصنیف (Principia) ہے جو ۱۶۸۷ء میں شائع ہوئی جس نے اس عہد کی سائنس میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ (س۔ صدیقی)

Marfat.com

ایسے ایسے نظریات سامنے آرہے ہیں جن کا پہلے کوئی علم نہ تھا اور ماضی میں جو اُمور ناقابلِ تردید سائنسی حقائق خیال کیے جاتے تھے، وہ آج فرسودہ خیال کیے جارہے ہیں۔

سائنس اور تجرباتی اُمور کا یہ حال ہے تو نفسیات کے بارے میں اور ان تمام نظریات کے بارے میں جو تجربے کے خراد پر نہیں چڑھ سکتے، زیادہ محتاط روش اختیار کرنی چاہیے اور یہ غرّہ باقی نہ رہنا چاہیے کہ چونکہ یہ سائنس کا بیان ہے اس لیے ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔

میں اس بات کا ذرا اعادہ کر دوں کہ میرا مقصد ڈاروِن کے وہ نظریاتی بیانات پیش کرنا نہیں ہے، جو قطعی طور پر ثابت ہو چکے ہیں اور آج تک اہمیت کے حامل ہیں۔ بلکہ میں وہ فلسفہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس کے زیر اثر اس کا یہ مخصوص نقطۂ نظر ابھرا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ خالص مادی فلسفہ ہے جو انسان کا وسیع تر کائنات سے مادی تعلق کے علاوہ ہر رشتہ قطع کر کے رکھ دیتا ہے۔ (اس فلسفہ میں مستقبل کے علوم و معلومات تک کی رعایت نہیں ہے۔ بلکہ آج بھی ایٹمی توانائی (Atomic Energy) کے ماہرین فلسفہ ارتقاء کے برخلاف رائے کے حامل ہیں[1]) وہ بالارادہ اپنی بحث و تحقیق کو اس کرۂ ارض تک محدود رکھتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس نظامِ شمسی تک، اس کے علاوہ کائنات کی وسعتوں کو یک لخت فراموش کر دیتا ہے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ارضی مخلوقات کے نشوو ارتقاء میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ زمین میں اوّلین مخلوق کی پیدائش یا مردہ اور خالی زمین پر ابتدائے حیات کے

---

[1] اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ دو امریکی سائنسدانوں نے کسی غار میں انسانِ اول کے آثار تلاش کیے ہیں اور اس انکشاف سے کچھ ایسے نتائج سامنے آئیں گے جو ڈاروِن کے نظریے کے برخلاف ہوں گے۔

Marfat.com

مسئلے کو بڑی جلد بازی سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس مرحلے پر آکر ڈارون بھی کہتے ہیں کہ یہ بحث غیر اہم ہے اور مسئلے کی نوعیت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا کہ انسان کے نشوو ارتقاء پر کچھ خارجی اثرات ہیں یا نہیں؟ اور پھر خارجی اثرات ہونے کی کوئی یقینی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بے شک اس امر کی کوئی دلیل یقینی موجود نہیں ہے کہ انسانی ارتقاء خارج سے بھی متاثر ہے، مگر اس بات کی اہمیت ضرور ہے اور اس اہمیت کا تعلق نقطۂ نظر سے ہے۔ خالص مادی نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہ بات قطعاً قابلِ اعتناء نہیں ہے، کیونکہ مادی نقطۂ نظر صرف محسوس مادی اشیاء ہی کے وجود کو تسلیم کرتا ہے جبکہ اس بات کا تعلق کہ ابتدائے خلق کا مسئلہ ایک ایسی قوت سے وابستہ ہے جو غیر مادی اور غیر محسوس ہے۔ ایک اندرونی اور باطنی احساس سے ہے جو ایک مکمل اور جامع نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کے اثرات تمام انسانی زندگی اور پورے انسانی معاشرے پر مرتسم ہوتے ہیں۔

فلسفۂ مادیت اور وجودِ خداوندی

مادی نقطۂ نظر ارضی حدود اور محسوسات کے دائرے میں گھرا رہتا ہے۔ وہ کسی خالقِ کائنات ہستی کا وجود تسلیم نہیں کرتا اور اُس کی نظر میں ایسی کسی ہستی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔[1] اس انکارِ خالق کے نتیجے میں روحانی اور اخلاقی قدریں بیکار قرار پاتی ہیں اور خود مذہب کے وجود سے بھی انکار کر دیا جاتا ہے کیونکہ مذہب تو نام ہے اس خالق کی عبادت کا جس کے حکم سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں۔

---

[1] ڈارون کہتا ہے: "مسائلِ زندگی کی تعبیر میں کسی صاحبِ ارادہ خالق کے وجود کو ماننا ایسا ہے جیسے کسی خالص میکانکی عمل میں کوئی خلافِ طبیعت (نیچر) عنصر داخل کر دیا جائے۔

Marfat.com

اور جو سوسائٹی خالص مادّی نقطۂ نظر کے زیرِ اثر تشکیل پائے گی وہ لازمی طور پر خود بھی مادّی ہوگی۔ اُس میں معنوی اقدار کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور نہ یہ سوسائٹی غیر محسوسات کو تسلیم کرے گی، بلکہ لوگ اپنے تمام معاملات مادی مفادات کی بنیاد پر کریں گے، خواہ ضمیر کتنا ہی چیخے اور اخلاقی حس کتنی ہی تڑپے!

اس قسم کے سماج میں 'نفسِ انسانی' اور 'دنیائے شعور' کے بارے میں لوگوں کا نقطۂ نظر اس مادی فلسفہ کی زد سے نہیں بچ سکتا، بلکہ یہاں نفسِ انسانی کی پیمائش بھی خالص مادّی پہلو سے ہوگی اور مادّی پہلو کے سوا ہر پہلو خارج از بحث قرار دے دیا جائے گا۔

اس لحاظ سے انسانیت کے لیے ڈارون کے افکار دورِ جدید کے دیگر سائنس دانوں کے افکار سے زیادہ خطرناک ہیں۔ خود فرائڈ کے نظریات فلسفۂ ڈارون سے متاثر ہیں اور اسی تاثر کا ایک طبعی نتیجہ ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم فرائڈ کے نظریات کو سائنسی حقائق اور ایسے مطلق معروضی کلیات خیال نہ کر بیٹھیں جو ماحول، حالات اور گرد و پیش کے اثرات قبول نہیں کرتے۔

جہاں تک مغربی سائنس دانوں کا تعلق ہے ان کے لیے ڈارون کا فلسفۂ مادیت کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، کیوں کہ سارا مغرب ہمیشہ ہی سے اپنے ماحول اور تاریخی عوامل کے زیرِ اثر مادی زندگی کا پرستار رہا ہے۔ وہ تو اس وقت بھی جب کہ یورپ میں مسیحیت کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے تھے، مسیحیت کا اثر اپنے دلوں میں اسی وقت محسوس کیا کرتے تھے جب وہ کلیسا میں ہوا کرتے تھے، مگر جوں ہی کلیسا سے باہر قدم رکھتے ان کے بدن کی رومی خون کی گردش تیز ہوجاتی اور وہ عیش کوشی میں منہمک ہوجاتے اور اس وقت ان کے سامنے محسوس مادی مفادات کے سوا کچھ نہ ہوتا سوائے چند افراد کے جو فی الحقیقت مذہب پر پکا سچا ایمان رکھتے تھے اور دین ان کی روح پر غالب آجاتا تھا!

Marfat.com

مگر ہم مسلمان کیوں اس قدر اندھا یقین رکھے ہوئے ہیں کہ ہر فرمودۂ مغرب درُست اور صحیح ہے؟

ہم کیوں آنکھیں بند کیے ایک سحر زدہ انسان کی طرح ہر اُس بات کی جانب لپکتے ہیں جس کا تعلق مغرب سے ہو؟ ہم مسائل کی جستجو کیوں نہیں کرتے؟ ہم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جن حالات اور تاریخی عوامل کے زیرِ اثر مغرب ان راہوں پر چلا ہے نہ وہ ہمارے حالات ہیں، نہ ہماری تاریخ ہے اور نہ ہم ان راہوں پر چل سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم زندگی کے جملہ مسائل پر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق غور کریں اور ایسی راہیں نکالیں جو ہمارے حالات کے موافق اور ہماری تاریخ سے ہم آہنگ ہوں اور ہم ان معاملات کا زیادہ دقتِ نظر سے گہرا اور مکمل مطالعہ کر سکیں۔

بہر حال میری یہ تمام باتیں ان عظیم سائنس دانوں کی بارگاہ میں ایک جسارت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خواہ اس جسارت کی وجہ فریب خوردگی ہو یا شاید یہ ہو کہ مَیں ان سائنسی نظریات سے ناواقف ہوں! بلکہ میرے خیال میں تو ڈاروِن کو یہ اعتراف کرنا چاہیے تھا:

> "کچھ دلائل اور شواہد کی روشنی میں مَیں نشو و ارتقاء کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر تک پہنچا ہوں۔ مگر بہت سی باتیں ایسی ہیں جن تک میری رسائی نہیں ہو سکی اور مَیں انھیں نہیں سمجھ سکا۔ مثلاً یہ کہ زندگی کی ابتداء کیوں کر ہوئی؟ وہ کیا راز ہے جو زندہ اشیاء کو زندگی سے چمٹے رہنے پر مجبور کیے ہوئے ہے اور زندگی اپنے وجود کو بچانے کے لیے کیوں کر اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھالتی رہتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ باقی رہنے کی خواہش اس کی طبیعت میں شامل ہے؟ بہر حال ان اسرار سے خالقِ زندگی ہی واقف ہے اور ابھی تک ان سے پردہ نہیں اٹھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں

Marfat.com

سائنس کی رسائی ان امور تک ہو جائے اور یہ راز بے نقاب ہو جائیں "

ڈارون، اگر یہ اعتراف کر لیتا تو اس سے آزادیٔ فکر، عقل کی بالادستی اور عظمتِ سائنس کو کوئی صدمہ نہ پہنچتا کیونکہ کسی خالقِ زندگی کے وجود کا اعتراف نہ تو سائنس کے منافی ہے اور نہ سائنسی ترقی ہی کے راستے میں رکاوٹ ــــ بلکہ:

اگر ڈارون خالقِ زندگی کے وجود کا معترف ہوتا تو آج جدید معاشرے کی شکل کافی مختلف ہوتی اور تاریخ کا دھارا کسی اور رُخ پر بہہ رہا ہوتا، اور اگر ڈارون اپنے سائنسی تجربات اور فکری بلند پروازیوں میں خالقِ کائنات کے وجود کی کوئی گنجائش باقی رہنے دیتا تو اس کے پرستارانِ مغرب کے لیے یہ ممکن ہو جاتا کہ وہ سائنس کی عظیم ترقیات کو عقیدے کے پہلو بہ پہلو آگے بڑھائیں اور عقیدے سے اُبھرنے والی اخلاقی اور روحانی قدروں کو بھی تازگی اور بالیدگی بخشیں۔

مگر ڈارون نے اس قسم کا کوئی اعتراف نہیں کیا اور اس کے وجودِ خداوندی کے اعتراف سے گریز کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اس وقت سائنس اور کلیسا میں زبردست جنگ برپا تھی۔ کلیسا سائنس دانوں پر ہر قسم کے مظالم توڑ رہا تھا جس کے نتیجے میں سائنس دانوں اور کلیسا میں اس قدر کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ سائنس دان کسی ایسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جس کو کلیسا بھی مانتا ہو، خواہ خدا کے وجود کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔ گویا ڈارون کلیسا کے خدا کا اس لیے منکر تھا کہ کلیسا خود متلاشیانِ حقیقت کی کوئی بات انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

(۲) کلیسا کے خداوند کا اعتراف دراصل ان تمام خرافات کا تسلیم کر لینا تھا، جو کلیسا نے مذہب کے نام پر گھڑی ہوئی تھیں اور عوام نے انھیں مذہب سمجھ کر

Marfat.com

اپنا لیا تھا۔

گویا ڈارون کا خدا کے وجود کا اعتراف نہ کرنا ان وجوہات کا ایک منطقی نتیجہ تھا، اگرچہ وہ ذاتی طور پر خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہو۔[1]

یہ حالات تھے جنھوں نے سائنس دانوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ سائنس کی ترقی صرف مذہب دشمنی کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔

ہمارے لیے ــــ بہر حال ــــ مذہب و سائنس کو بر سر پیکار سمجھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے اور نہ ہمارے لیے یہ مناسب ہے کہ ہم علمی تحقیق کے میدان سے مذہب کو رخصت کر دیں ــــ اگر ہم ایسا کریں تو ہماری یہ روش صرف مغرب کی اندھی تقلید اور یورپ کی ذہنی غلامی ہی کہلائے گی ــــ اور کچھ نہیں ــــ کیونکہ ہمارے اپنے مخصوص حالات ہیں، ہمارے کچھ قومی خصائص ہیں اور ہمارا اپنا منفرد نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات ہے، اور یہ سب اُمور ہمیں مل کر مجبور کرتے ہیں کہ ہم مذہب و سائنس میں کوئی نہ کوئی تعلق اور رشتہ قائم رکھیں۔ اسی صورت میں ہم اپنے وجود کو بیرونی فکری یلغار اور داخلی ذہنی انتشار سے بچا سکتے ہیں اور جس وقت ہم یہ طرزِ عمل اختیار کر لیں گے، ہمیں محسوس ہو جائے گا کہ ہمارا مغرب کی ہر بات بلا چون و چرا تسلیم کر لینے کا رویہ درست نہ تھا، بلکہ خود فکرِ مغرب میں اس قدر جھول اور ژولیدگی نظر آئے گی کہ ہمیں اپنی سادہ لوحی اور فریب خوردگی پر افسوس ہونے لگے گا۔

---

[1] ڈارون نے اپنے کسی دوست کو لکھا تھا: "نہ معلوم لوگ مجھ پر کفر کا الزام کیوں لگاتے ہیں۔ حالانکہ میرے نظریے سے وجودِ خدا کی نفی نہیں ہوتی۔" اس سے پہلے ڈارون کا وہ قول گزر چکا ہے جس میں اس نے کارزارِ حیات میں خدا کی اثر انگیزی سے انکار کیا ہے۔

Marfat.com

نقطۂ انقلاب

مغربی تاریخ بتاتی ہے کہ ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء، علوم وفنون کی تاریخ میں ایک ایسا نقطۂ انقلاب ہے جس نے سوچ کے دھارے بدل کر رکھ دیئے اور اس کے بعد آنے والے تمام سائنس دانوں کی فکر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی — یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ خود فرائڈ ڈارون سے حد درجہ متاثر ہے اور اس کے اس تاثر کے تین پہلو ہیں:

۱۔ انسان کے بارے میں اس کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ وہ ایک ارضی اور مادّی مخلوق ہے۔ اور اپنی مادی ضروریات میں گھرا ہوا ہے۔

۲۔ انسان میں کسی قسم کی کوئی شرافت، برتری اور روحانیت موجود نہیں ہے اور اس مخلوق پر خدا کی کرم نوازی اور اس کی تکریم محض ایک بکواس ہے، جو تمام تر تخلیق آدم سے متعلق گھڑی جانے والی خرافات کا نتیجہ ہے۔

۳۔ انسان کی تمام جبلتیں (Instincts) ان گزشتہ حیوانات کی جبلتوں کی توسیع ہیں جو ارتقائی مراحل میں اس کے پیش رو رہے ہیں۔ اور ان انسانی جبلتوں کی موجودہ شکل میں وہ ارتقائی عمل بھی شامل ہے جس سے انسان کے جدِّامجد کو اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے نتیجے میں گزرنا پڑا اور جن حالات سے گزر کر ہی وہ "حضرت انسان" کہلائے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ فرائڈ کے افکار دراصل نظریہ ڈارون کا ایک طبعی عکس ہیں، بالخصوص انسان کے بارے میں فرائڈ کے افکار بعینہٖ وہی ہیں جو اس کے پیش رو ڈارون کے تھے۔ اس لیے ان افکار میں جو بنیادی غلطیاں پنہاں ہو سکتی ہیں ان سے ہمیں باخبر رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ نظریۂ ڈارون کے پس پشت جو نکات کارفرما ہیں وہ کوئی معروضی حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک شخص کا اپنا ذاتی زاویہ نگاہ اور اپنا مخصوص فلسفہ ہے جس کا تانا بانا اس کی اپنی ذاتی الجھنوں سے پیوستہ ہے۔ یہ نظریات

Marfat.com

دراصل اس ماحول سے بغاوت اور ردِّ عمل کا اظہار ہیں جس میں کلیسا اور کلیسا کے مذہب سے دشمنی آزادیٔ رائے کے لیے ضروری اور ناگزیر خیال کی جاتی تھی۔ مگر یہ حالات اور یہ ماحول اب ہمارے راستے کی رکاوٹیں نہیں ہیں اور نہ ایسا کوئی امر مانع ہے کہ ہم ان افکار و نظریات پر سلجھے ہوئے علمی اور منطقی انداز میں تنقید نہ کر سکیں۔

یہ کہنا کہ انسان اور خالقِ انسان میں کوئی رشتہ اور تعلق موجود نہیں ہے، بلکہ طبیعت (Nature) خود ہی زندگی کی رکھوالی کرتی ہے اور طبیعت ہی زندگی کو ارتقائی مراحل سے گزار کر تخلیقِ انسان تک لے آئی ہے، اور ماحول کے اثرات نے انسان کو مخصوص اعضاء اور جبلتیں عطا کر دی ہیں —— یہ ایک ایسا مضحکہ خیز مغالطہ ہے جس پر صرف اہلِ مغرب ہی یقین کر سکتے ہیں —— اہلِ مغرب تو کلیسا اور خداوندِ کلیسا سے نجات پانے کے لیے ہر خرافات کو ماننے پر آمادہ تھے۔ انھیں تو کلیسا کے ہولناک اقتدار سے ہر حال میں پیچھا چھڑانا تھا خواہ کلیسا کے خدا کو چھوڑ کر نیچر ہی کو خدا کیوں نہ ماننا پڑے۔ کیونکہ کلیسا تو اپنے خدا کے نام پر انسانوں کو اپنا غلام بناتا تھا۔ مگر نئے خدا —— نیچر —— کا تو کوئی کلیسا نہیں ہے۔ یہاں تو عقل کو پراگندہ کرنے والے تضادات نہیں ہیں۔ یہاں تو تثلیث (Trinity) کا چکر نہیں ہے۔ یہاں تو مذہبی جکڑ بندیاں نہیں ہیں —— بلکہ یہاں تو آزادی ہے کلیسا سے، کلیسا کے جابرانہ اقتدار سے، کلیسا کے ظلم و ستم سے، اور یہاں آزادی ہے لذت کوشی اور پُرعیش زندگی کی، اور یہاں آزادی ہے اپنی دولت و ثروت میں اضافے کے لیے دوسری قوموں کو غلام بنانے کی، اور ان سب باتوں کی جو انھیں رومی تہذیب سے ورثے میں ملی تھیں۔

ہم مسلمانوں کے لیے مندرجہ بالا باتوں میں سے کوئی بھی بات قابلِ قبول نہیں ہے۔ ہم کیوں آخر اس ساری خرافات کو تسلیم کر لیں؟ ہم تو بہر حال یہ سوال ضرور کریں گے کہ یہ طبیعت (جس کی طاقتیں ڈارون کی نظر میں لامتناہی ہیں، اور جو ہر چیز

Marfat.com

پیدا کر سکتی ہے۔) خود کیا چیز ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ اگر اس کی حدود معلوم نہیں ہیں اور اس کی ماہیت قابل فہم نہیں ہے تو اس بات کا کیا علمی یا منطقی یا جذباتی یا شخصی جواز ہے کہ تصورِ خدا کو چھوڑ کر طبیعت کو خدا مان لیا جائے؟ اور ایسی کیا مجبوری آن پڑی ہے کہ خالق کائنات کا نظریہ ترک کر کے نیچر کو خالق تسلیم کر لیا جائے؟

خدا اور بندے کے ہر رشتے کو کاٹنے کے بعد انسانی شرافت اور برتری پر جو آرا چلایا گیا ہے اس کا مقصد بھی کلیسا اور اہلِ کلیسا سے ایک نئے انداز سے جنگ کرنا ہے اور لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ اہلِ کلیسا کس طرح خرافات اور مہمل باتوں کا پرچار کرتے اور انھیں دین کے نام پر عوام سے تسلیم کراتے ہیں۔ چنانچہ تخلیقِ آدمؑ کا واقعہ دونوں گروہوں میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ڈارون اور اس کے حامیوں نے اسے کلیسا کی مخالفت میں خوب خوب رنگ دیا اور اہلِ کلیسا نے اسے ڈارون اور اس کے متبعین کی تکفیر کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

مگر اب تو یہ سارا معرکہ نمٹ چکا اور یہ جنگ کبھی کی سرد پڑ چکی۔ اب تو سائنس خود ہی انسانی رفعت، بلندی اور برتری کی پرچارک بنتی جا رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ انسان ساری کائنات میں افضل ترین مخلوق ہے اور اس کی عقلی ترقیات (Intellectual Advancements) بڑی حیرت انگیز ہیں۔

انسان کی ذہنی رسائی اور سائنسی ترقی کی ایک بڑی حیران کن علامت یہ ہے کہ اس نے ایٹم (Atom) کو پھاڑ کر اس کے رازوں سے پردہ اٹھایا اور اس کی طاقتوں کو آشکارا کیا ہے۔

پھر انسان ہی تو ہر علم و فن کا موجد ہے۔ ساری مادی اور روحانی تہذیبیں اسی کے ظہور کا نو عکس ہیں —— انسان کی یہ تمام امتیازی خصوصیات اگر اسے گزشتہ ارتقائی کڑیوں سے ممتاز کرتی ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ انسان ہی بزرگی اور برتری کا مستحق ہے اور وہی اشرف المخلوقات ہے۔

Marfat.com

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ انسانی جبلتیں حیوانی جبلتوں کی توسیع شدہ شکل ہیں؛ تو اس قول کو ڈارون نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس نے حیوانات اور ان کے ارتقائی مراحل کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کیا کہ انسان اور اس کے پیش رو حیوانات میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان اور دیگر حیوانات کے جسمانی اعضاء میں بھی مماثلت موجود ہے؛ اس لیے انسان کے نفس کی ترکیب اور اس ترکیب کے نتیجے میں ظہور میں آنے والے اعمال بھی حیوانات کے مشابہ ہونے چاہئیں۔

یہ بالکل غلط تصوّر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تمام جانداروں میں کچھ اُمور بطورِ قدرِ مشترک پائے جاتے ہیں۔ جیسے زندہ رہنے کی خواہش اور اس کے لیے کھانا پینا اور تحفّظِ نوع کا احساس اور اس کے حصول کے لیے جنسی خواہش ـــــ یہ اُمور تمام جانداروں میں مشترک ہیں اگرچہ ان کی تکمیل کے ذرائع اور وسائل ارتقائی کڑیوں کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

انسان اُمورِ بالا میں ایک گونہ اشتراک کے باوجود بہرحال حیوانات سے یقیناً ممتاز ہے اور اسے کسی بھی طرح حیوانیّت کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس بات کو فلسفۂ ارتقاء (Evolution Theory) کے ماتحت اس طرح سمجھیے کہ ایک جانور جو ارتقائی سلسلے میں اپنے پیش روؤں سے زیادہ ترقی یافتہ سننے اور دیکھنے کی قوتوں کا مالک ہے؛ اس کے ان احساسات کے اظہار کا مقیاس وہ نہیں ہو سکتا جو اس کے پیش رو حیوانات کا ہے یا اُن حیوانات کا ہے؛ جو سرے سے یہ احساسات ہی نہیں رکھتے۔ یہ بات بالکل واضح ہے؛ اس میں کسی قسم کے جدل اور مناظرے کی گنجائش نہیں ہے، گو کہ انسان سب سے زیادہ مناظرہ باز ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

مغرب کے مادہ پرست یہ تو مان سکتے ہیں کہ انسان تمام حیوانات میں اپنی عقل کی بناء پر ممتاز ہے، اگرچہ عقل و فہم تمام جانوروں میں پائی جاتی ہے؛ تاہم انسان کو جو عقلی قوتِ فکر کا خاصہ عطا ہوا ہے، وہ دیگر حیوانات سے مختلف ہے ـــ مگر یہ مادہ پرست یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ انسان اپنی روح کی وجہ

Marfat.com

سے تمام حیوانات میں ممتاز ہے کیوں کہ اگر وہ روح کا اعتراف کر لیں تو دوبارہ انھیں وہ ساری ذمے داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں جن سے بچنے کے لیے انھوں نے کلیسا سے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ چنانچہ روح اور روحانیت سے گریز کی وجہ آج بھی مذہبی اقدار سے فرار کی خواہش ہے کیونکہ رومی تہذیب سے جو مادّیت انھیں ورثے میں ملی ہے وہ انھیں شعوری یا لاشعوری طور پر کشاں کشاں مادّیت ہی کی راہوں پر لیے چلی جا رہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ انسان کے بارے میں مادہ پرستوں کا حیوانی نقطۂ نظر حیاتیات (Biology) میں درست ہو مگر نفسیات (Psychology) میں تو یہ طرزِ فکر انتہائی مہلک اور خطرناک نتائج کا حامل ہے۔

Marfat.com

فرائڈ اور یہودیت

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ فرائڈ ڈارون سے کافی حد تک متاثر ہے اور اس نے ڈارون سے جو اثرات قبول کیے ہیں وہ بالارادہ، سوچ سمجھ کر اور شعوری طور پر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ فرائڈ اپنی یہودیت سے بھی لاشعوری طور پر متاثر ہے اور اس کا یہودی ہونا غیر محسوس طریقے پر اس کے تمام افکار و خیالات پر سایہ فگن رہا ہے۔

اس سے قبل کہ فرائڈ کے پرستار اور اس کے متبعین اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کہنے پر زیادہ پریشان ہوں اور عالمِ حیرت میں یہ کہنے لگیں کہ 'وہ ایک عظیم مفکر ہے کوئی عام انسان نہیں ہے'۔۔۔۔ اس سے قبل میں خود فرائڈ کا اپنی ذات کے بارے میں وہ اعتراف نقل کیے دیتا ہوں، جس میں وہ خود اپنے آپ کو خواہشِ نفس سے بالا نہیں سمجھتا، بلکہ وہ بھی انہی جذبات و میلانات کا اظہار کرتا ہے جو عام انسانوں میں ہوا کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب 'تعبیرِ خواب' میں بیان کرتا ہے کہ اس کا نفسیاتی مطالعہ غیر معمولی (Abnormal) لوگوں تک محدود ہے اور صحت مند اور نارمل لوگوں تک اس کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے گرد و پیش کے حالات سے واقفیت اور ان کے مکمل نفسیاتی کوائف معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جب کہ ابنارمل لوگ خود برائے علاج آتے ہیں اور ان سے وہ تمام معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں جو نفسیاتی الجھنوں کا سراغ لگانے میں معاون ہوتی ہیں۔

فرائڈ نے مذکورہ بیان کی توجیہ خود اپنے خواب سے کی ہے، اس بنیاد پر کہ وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہے اور اپنے نفس میں چھپے ہوئے خیالات سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔

Marfat.com

(خواب نمبر ۲۳ - ۲۴ر جولائی ۱۸۹۵ء)

اس خواب کی اس نے اپنے مخصوص طریقے کے مطابق کئی صفحات میں تشریح کی ہے جس کا بالتفصیل یہاں نقل کرنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ چند جملے نقل کیے جاتے ہیں :

"میں نے ڈاکٹر "م" کو خواب میں دیکھا کہ وہ احمقانہ باتیں اور جاہلانہ حرکتیں کر رہا ہے —— میں نے اصل میں اس ڈاکٹر کو مذکورہ حالت میں اس لیے دیکھا کہ وہ میرے طریقۂ علاج سے متفق نہیں ہے۔ گویا میرے لاشعور نے اس سے میری مخالفت کا بدلہ اس طرح لیا کہ اسے جاہل اور بیوقوف بنا دیا۔"[1]

"اسی طرح میں نے خواب میں دیکھا کہ ڈاکٹر اوٹو (Otto) غلطیوں کا مرتکب ہو رہا ہے —— یہ خواب میرے لاشعور نے مجھے اس لیے دکھایا کہ ڈاکٹر اوٹو میرے بارے میں سمجھتا تھا کہ مجھے "اِرما" کا علاج نہیں آتا۔ اس طرح اس کو غلطیوں کا مرتکب دکھا کر اس سے بھی بدلہ لیا گیا ہے۔"[2]

یہ تو تھا فرائڈ کا خود اپنی ذات کے بارے میں اعتراف۔ مگر میں انسانی محرکات اور لاشعور کے بارے میں اس کے نظریات خود اس کے اوپر منطبق کرتے ہوئے یہ کہوں تو میں کوئی زیادتی نہیں کروں گا کہ اس کے افکار پر یہودیت کی گہری چھاپ ہے اور لاشعوری طور پر یہودیت اس کے تمام نظریات پر اثر انداز ہوئی ہے۔

یہودی تمام دنیا میں علی العموم اور مسیحی دنیا میں بالخصوص ایک ناپسندیدہ

---

[1] تعبیر خواب، مطبوعہ سن ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۲

[2] بحوالۂ سابق۔

Marfat.com

اور مجبور اقلیت رہے ہیں۔ البتہ اسلامی حکومت میں جب تک یہودی رہے تمام انسانی حقوق سے مستفید ہوتے رہے۔ ہر قسم کی جائز و ناجائز اقتصادی سرگرمیوں میں بلا روک ٹوک لگے رہے۔ مگر مسیحی دنیا میں صورت حال مختلف تھی۔ وہاں انھیں خوب خوب ذلیل و رُسوا کیا گیا۔ سزائیں دی گئیں اور بلا جھجک علانیہ تحقیر کی گئی۔ کبھی انھیں انسانی حقوق تک نہیں دیے گئے۔ مگر جب دَورِ جدید میں انھوں نے مسلمانوں کو فریب دینا چاہا تو ان کی ساری ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ ہو گئیں، ان کی ہر طرح مدد کی گئی۔ اور انھیں ہر قسم کی طاقت بہم پہنچائی گئی۔ تاکہ وہ عالمِ اسلامی پر مسلط ہو جائیں اور اس طرح عالمِ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کو مؤخر کیا جا سکے۔ اور یہ سارا کام اسلام دشمن صلیبی جذبے کے ماتحت کیا گیا۔ اور باوجودیکہ اہلِ مغرب مسیحیت سے بطور ایک مذہب کے پوری طرح دست بردار ہو چکے ہیں مگر ان میں اسلام دشمنی کے جذبات آج تک سرد نہیں ہو سکے ہیں[1]۔

یہودیوں سے ہمدردی اور غم خواری کا سبب کوئی انسانی جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے مکروہ مفادات اس کے پسِ پشت کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ جو یہودیوں کا سب سے بڑا غم خوار ہے اسی امریکہ میں بعض مقامات پر یہ بورڈ لگے ہوئے نظر آتے ہیں:

"کتوں اور یہودیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

انگریزی کا قدیم اور جدید ادب اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جو انگریزوں کی یہودیوں سے شدید نفرت کا پتہ دیتی ہیں اور جن سے ان کی حقارت اور ان سے کراہیت کا اظہار ہوتا ہے، جیسے مشہور ناول (Scarlet Pimpernel) ہے، اور جیسے شیکسپیئر کا ڈرامہ 'بندوق کا تاجر'۔

اسی طرح اٹلی میں انھیں حقیر اور ذلیل سمجھا گیا اور جرمنی تو بہت شدت سے یہودی نسل کشی کے پروگرام پر عمل پیرا رہا ہے۔

---

[1] اسلام دوراہے پر، لیوپولڈ۔ ترجمۂ عربی عمر فروخ۔

Marfat.com

یہودیوں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ حد درجہ مادّہ پرست ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر ہر اخلاق اور ہر اصُول کو پامال کر دیتے ہیں اور ان کا ضمیر معمولی سے معمولی مفاد کی خاطر خسیس ترین حرکتیں کرنے سے بھی نہیں روکتا۔ ان کی نظر میں اخلاقی اور روحانی قدریں محض بے معنی باتیں ہیں جن سے انسان کی ذات کو سوائے نقصان اور خسارے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

یہودیوں کی طرف سے انتقام

ظاہر ہے کہ فرائڈ بچپن سے یہ باتیں سنتا آرہا تھا اور یہودیوں پر جبر اور ظلم کی داستانیں اس کے احساسات پر اثر انداز ہو رہی تھیں کیونکہ وہ خود یہودی گھرانے میں پیدا ہُوا تھا اور یہودیوں پر اٹھنے والی حقارت آمیز نظریں خود اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یہی احساسات اس کے لاشعور میں مرتکز ہو گئے اور اس کے لاشعور نے مسیحی ظالم اور جابر لوگوں سے معقول اور بہ ظاہر بے ضرر سا انتقام لے لیا۔

اس نے اپنا اور تمام یہودیوں کا انتقام لیتے ہوئے کہا:

"اے لوگو! تم ہمارے بارے میں کہتے ہو کہ ہم اپنی جبلتوں (Instincts) کی خاطر زندہ ہیں، ہم مفاد پرست ہیں اور ہم اخلاقی اقدار کے منکر ہیں۔ تم بتاؤ تم کیا ہو؟ آؤ میں تمھیں ایسا آئینہ جہاں نما دکھاؤں جس میں تمہارے نفس کی گہرائیاں تک سامنے آجائیں گی اور تمھارے لاشعور کی تاریک تہیں بھی روشن اور منوّر ہو جائیں گی ـــــ دیکھو! تم بھی یہودیوں جیسے ہو۔ تم بھی اپنی جبلتوں کی تکمیل کی خاطر زندہ ہو۔ تمھارا بھی کوئی ضمیر نہیں ہے۔ تم بھی اخلاق سے تہی داماں ہو۔ تم بھی معنوی قدروں سے بیزار ہو ـــــ جو بھیانک اور بدنما تصویر تم نے یہودیوں کی تیار کی ہے، وہ تمہاری اپنی ہی تصویر ہے۔ یہودیوں کو کیا کہتے ہو؟ ساری انسانیت ہمیشہ سے گندگیوں میں لتھڑی

Marfat.com

چلی آرہی ہے اور یہ تصویر صرف ہماری نہیں ساری انسانیت کی تصویر ہے ۔"

اس طرح لاشعوری طور پر فرائڈ نے وہ ساری ذلت و رُسوائی جو انسانیت نے یہودیوں کی جھولی میں ڈالی تھی، اٹھا کر خود انسانیت کے دامن میں اُلٹ دی۔

اس کے علاوہ ـــــ

وہ جب کہتا ہے کہ سوسائٹی فرد کے وجود کو کچل ڈالتی اور اس کی ذات کو پامال کر دیتی ہے، تو اس وقت اس کے لاشعور میں سوسائٹی کا مفہوم وہ مسیحی اکثریت اور عام انسانیت ہوتا ہے جس نے یہودی وجود کو کچل ڈالا اور اس کی ذات کو پامال کر دیا۔

پھر جب وہ کہتا ہے کہ فرد (Individual) سماج سے نفرت کرتا ہے اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالنا چاہتا ہے جو سماج نے اس کے پیروں میں ڈال دی ہیں، تو اس کے لاشعور میں فرد کی تصویر وہ یہودی اقلیت ہوتی ہے جو انسانیت سے نفرت کرتی ہے اور اس پر غلبہ پانا چاہتی ہے۔

اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ سماج، مذہب اور اخلاقی قدریں فرد پر ایسا دباؤ (Suppression) ڈالتی ہیں کہ اس کا وجود محرومیوں سے دوچار اور نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے ـــــ اس وقت بھی اس کا لاشعور یہودیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی بے چینیوں کا انتقام عام انسانیت سے لے رہا ہوتا ہے۔

غرض فرائڈ کی بیشتر بنیادی آراء عالمی نفرت اور خواہشِ انتقام کے ان جذبات کا ایک لاشعوری ردّعمل ہیں جو ایک یہودی کی حیثیت میں اس کے نفس میں سرایت کیے رہے اور جنھیں اس نے بے غبار علمی انداز میں عقلیت (Rationalism) اور فلسفے سے آراستہ کر کے پیش کر دیا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک مفروضہ ہے اور کوئی بھی شخص ان معاملات میں یقین کے

Marfat.com

ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر پھر بھی یہ ایک ایسا معقول مفروضہ ہے جس پر حالات پوری طرح دلالت کرتے اور واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس مفروضے کی تردید و تغلیط کا بھی کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے۔

بہرکیف فرائڈ کے شعور اور لاشعور، اسے جہاں چاہیں لیے پھریں، ہم اس تنقید میں اس کے ان ذاتی تاثرات پر تکیہ نہیں کریں گے بلکہ ہم اس کے افکار پر خالص علمی اور معروضی (Objective) انداز میں تنقید کریں گے۔ جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی تعبیر کے بارے میں فرائڈ کے زاویۂ نگاہ کی مزید وضاحت ہو جائے۔ اور قارئین کو یہ معلوم ہو جائے کہ کم از کم اس کی بعض آراء کا واسطہ علمی حقائق سے کم اور اس کے شخصی میلانات سے زیادہ ہے۔

Marfat.com

انسان فرائڈ کی نظر میں

ہم اس موقع پر فرائڈ کے نظریات پر ایک اجمالی بحث کرنا چاہتے ہیں۔ تفصیلی گفتگو "فرد اور معاشرہ"، "جنسی مسئلہ" اور "اقدارِ عالیہ" کے زیرِ عنوان آئے گی۔

فرائڈ نے انسان کو جبلتوں اور خواہشوں کا مجموعہ بتا کر دراصل انسان کی تذلیل کی ہے۔ فرائڈ کی نظر میں انسان نہ اپنی مادی دنیا سے بالاتر ہو سکتا ہے اور نہ کسی فن کی تخلیق، فکر کی بلندی اور رُوح کی پرواز میں جبلّی قیود سے آزاد ہو سکتا ہے، سوائے اس صورت کے کہ جبلّی قوت کی راہ میں کوئی زبردست رُکاوٹ پیدا ہو جائے اور وہ شہوتوں کو اُبھرنے سے باز رکھے۔

فرائڈ انسانیت کو ایک ایسے فرد کی صورت میں پیش کرتا ہے جو اپنی زندگی میں شہوانی طاقت (Libido) کی منہ زوریوں سے مجبور ہو کر اپنی لذّتوں کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اگر اس کی خواہشوں کی تکمیل بر وقت ہوتی رہے تو بہت خوب! ورنہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ تمام رُکاوٹیں دُور کر کے تکمیلِ خواہش کا کوئی طریقہ دریافت کر لے۔ وہ اس وقت بڑا خوش ہوتا ہے جب سماج کے پہرہ داروں سے بچ بچا کر اسے کسی اخلاقی یا معاشرتی بندش کو توڑنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے اور وہ پھر بھی معاشرے کی نظر میں پاکباز اور شبہ سے بالاتر رہتا ہے، حالانکہ اس کے مَن میں وہ کچھ پنہاں ہوتا ہے کہ اگر سوسائٹی اس سے واقف ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دے۔

اکثر اوقات انسان کے یہ حیلے شعوری نہیں ہوتے۔ بلکہ ان گنت مغالطے اور حیلے بہانے لاشعور میں چھپے ہوتے ہیں[1] جن کا مجموعی مقصد یہی ہوتا ہے کہ

---

[1] فرائڈ اپنی کتاب (The Ego and the Id) میں کہتا ہے کہ طاقتِ شہوانی

Marfat.com

شہوانی قوت کی نکاسی کے لیے راستہ بنائیں کیونکہ اس کا دباؤ کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ اب اگر لاشعور عالمِ بیداری میں اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتا تو وہ خواب کا سہارا لیتا ہے اور خواب میں ہر اس خواہش کی تکمیل کی گنجائش ہے جس کی تکمیل عالمِ بیداری میں نہ ہو سکتی ہو۔ (فرائڈ کے خیال میں تمام خواب کسی نہ کسی کچلی ہوئی خواہش یا دبی ہوئی نفرت کے عکاس ہوتے ہیں۔) فرد اپنی خواہشوں کی تکمیل سے کسی حال نہیں رُکتا سوائے اس کے کہ وہ سماج کے بالمقابل بالکل عاجز ہو جائے اور اس کا کوئی حیلہ بہانہ کارگر نہ ہو۔ یا اس میں ایسا جسمانی اور عضویاتی نقص پیدا ہو جائے جو اسے تکمیلِ خواہش سے عاجز کر دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد اعصابی بے چینی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے جو انسان کی طبیعت میں فساد برپا کر دیتی ہیں۔ اس کی زندگی کی امنگ ختم کر دیتی ہیں اور اسے راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہیں۔

فرائڈ کے خیال میں انسان کی نفسیاتی ساخت کے تین[۳] درجات ہیں:

پہلا درجہ شہوانی قوت (Libido) ہے جس کا مرکز ذاتِ سفلی[۱] (Id) ہے۔ یہ بنیادی طور پر جنسی قوت ہے۔ اگرچہ ذاتِ سفلی ایک بالمقابل قوت پر مشتمل ہے جس کا کوئی معین عنوان تو نہیں ہے مگر وہ قطعی طور پر اپنے مالک کے تصرف میں ہوتی ہے۔

دوسرا درجہ ذاتِ انا (Ego) کا ہے جو دراصل شعور ہے، جو معاشرے

---

(۳) اور حقیقتِ خارجی کے مابین ذات کا موقف منافقانہ اور مفاد مانہ ہوتا ہے اور وہ ہر مرحلے پر موقعے کی گھات میں رہتی ہے۔ جیسے کوئی سیاسی لیڈر حقائق سے آشنا ہونے کے باوجود عوام کے سامنے لب کشائی نہ کر سکتا ہو۔

[۱] ذاتِ سفلی (Id) ماہرینِ تحلیلِ نفسی یہ لفظ لاشعوری ذہن کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں انسان کی دبی ہوئی (Repressed) خواہشات پڑی رہتی ہیں۔ (م۔ صدیقی)

Marfat.com

سے برتاؤ کرتا اور نفس کی متناقض خواہشوں اور مادی اور خارجی حقیقت کے درمیان ربط و ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔

اور تیسرا درجہ ذاتِ اعلیٰ[1] (Super Ego) کا ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بچہ باپ کی شخصیت کی نقل کرتا ہے۔ اور اسی سے عشق مادر کی الجھن[2]

---

[1] ذاتِ اعلیٰ (Super Ego) ایگو یا انا کا وہ حصہ جس نے امتناعی اور تعزیری کارکردگی کو اپنے ذمے لے رکھا ہے اور جس کا کام خارجی دنیا میں والدین اور اربابِ اقتدار سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی کارگزاریاں بیشتر لاشعوری ہوتی ہیں۔ جب ہم اس سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو اسے ضمیر (Conscience) کہتے ہیں۔ بچے کے ذہن میں جابر والدین کے تہدید آمیز رویہ کے جو اثرات موجود ہوتے ہیں ان کے ساتھ بچہ نفرت اور عداوت کے وہ میلانات بھی شامل کر لیتا ہے جو بچے عام طور پر اپنی من مانی باتوں سے روکنے والوں کی طرف محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح تہدید آمیز رویہ کے اثرات اور نفرت و عداوت کے میلانات مل کر سب انا (ایگو) کے خلاف صف آراء ہو جاتے ہیں۔ یوں "سپر ایگو" ماں باپ اور دیگر اربابِ اقتدار سے بھی ایک بڑا ہوا بن جاتی ہے۔ اور "سپر ایگو" ایڈ سے اپنے تعلقات کی بنا پر انسان کو جنسی ناکامیوں، ذہنی الجھنوں اور دیگر پریشانیوں سے سزا دیتی ہے، بیماریوں اور حادثوں کا باعث بنتی ہے۔ فرائڈ کے نزدیک یہ ایڈپس اُلجھن کا نتیجہ ہے۔

[2] عشق مادر کی اُلجھن (Oedipus Complex) فرائڈ کے خیال میں ہر لڑکا اپنی ماں کی طرف اور لڑکی باپ کی جانب جنسی کشش رکھتے ہیں۔ بلوغ کے بعد یہی کشش الجھن بن جاتی ہے جو لڑکوں میں عشق مادر کی الجھن (Oedipus Complex) اور لڑکیوں میں عشق پدر کی الجھن (Electra Complex) کہلاتی ہے۔

(س۔ صدیقی)

Marfat.com

(Oedipus Complex) پیدا ہوتی ہے جو بچہ کی ماں سے جنسی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ باپ بچہ کی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ بنتا ہے جس سے بچے کے شعور میں محبت و نفرت بیک وقت جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ پھر بچہ اس کشمکش سے اس طرح پیچھا چھڑاتا ہے کہ وہ طبعی طور پر اپنے باپ کی شخصیت کی زیادہ سے زیادہ نقل کرتا جاتا ہے۔ (اسی طرح لڑکی جوں جوں اپنی ماں کی شخصیت سے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے عشق پدر کی الجھنوں (Electra Complex) سے آزاد ہوتی جاتی ہے۔) اسی الجھن سے ضمیر پیدا ہوتا ہے جو اپنی ناموافق جنسی خواہشوں کو دباتا اور کچلتا ہے تاکہ ذات (انا) کو باپ، معاشرہ، مذہب اور روایات کے بیرونی تسلّط اور اس کی زیادتیوں سے محفوظ رکھ سکے[1]

ضمیر انسانی، فرائڈ کی نظر میں

فرائڈ کی پیش کردہ نفسِ انسانی کی اس تصویر میں جو سب سے پہلی بات ہمیں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے یہاں ضمیر کے اخلاقی معنی کا کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مضحکہ خیز خرافات پر مشتمل ہے۔ فرائڈ کی نظر میں ضمیر فطری جذبات کے کچلے جانے سے پیدا ہوتا ہے، جو صاحب ضمیر کے مفاد کی خاطر اس کے جذبات پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے، تاکہ وہ خارجی قوتوں کے ٹکراؤ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

فرائڈ اخلاقی ضمیر کی جگہ مفاد پرست ضمیر کو رکھ کر گویا تمام اخلاقی اقدار کا انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ اخلاقی اقدار کی بنیاد یہ ہے کہ فرد تمام انسانوں کو انسانیت میں شریک خیال کرکے اور انھیں انسانی برادری کا ایک رکن سمجھ کر اپنی خوشی سے اپنے مفاد سے دست بردار ہو جائے۔ یا اس میں دوسروں کو بھی شریک

---

[1] (The Ego and the Id)

Marfat.com

کرلے۔

ان اخلاقی قدروں کا ضامن صرف وہ اخلاقی ضمیر ہے جس کا فرائڈ انکار کرتا ہے اور اس انکار کے نتیجے میں وہ اس سے ابھرنے والے تمام خیر و رحمت اور عدل و انصاف کے جذبات کا انکار کرتا ہے، اور اس بات سے منکر ہے کہ طاقت ور کمزور کی مدد کرے اور دولت مند غریب کی اعانت کرے، اور بدلے کی کوئی تمنا یا تو رکھے نہیں اور رکھے تو بدرجۂ آخر اس کے سوا کوئی اُمید نہ ہو کہ اگر طاقت ور اور دولت مند کمزوروں اور غریبوں کی مدد کریں گے تو اس سے بالآخر پوری سوسائٹی فلاح پائے گی۔

اگر ہم فرائڈ کی مندرجہ بالا فکر کو مسترد کر دیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ اخلاقی ضمیر ایک واقعی حقیقت ہے جو کبھی کبھی فرد پر لازم کرتا ہے کہ وہ کسی ایسے بلند تر مقصد، یا اعلیٰ ترین آئیڈیل کے لیے تکلیف اٹھائے اور لذت و آرام سے محروم رہے جس کا فائدہ خود اس کی ذات کو نہ پہنچتا ہو اس فائدے میں دوسرے بھی شریک ہوں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، جیسے بڑے بڑے راہنما اور مصلحین — (ہم انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی مثال نہیں دے رہے ہیں، حالانکہ ان کی مثال سے ہماری رائے کی زیادہ تائید ہوتی ہے۔) اس قسم کے لوگوں کا قلیل تعداد میں ہونا ان کے عدم وجود کی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اس امر کی دلیل ہے کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ جو بات ایک مرتبہ ظہور میں آسکتی ہے وہ دوبارہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ ایسے لوگ آج کے دور میں فرائڈ جیسے تنگ نظر اور مادہ پرست لوگوں کے اثرات کی بناء پر کم ہیں، مگر یہ لوگ انسانیت کی روحانی ترقی اور روشنی کے اس دور میں کم نہیں ہوتے جب انسانیت انبیاء، اولیاء، اتقیاء اور مصلحین کی آواز پر لبیک کہتی ہے اور انسانیت بغیر کسی دباؤ اور بغیر کسی جبر کے بلندی کی جانب جاتی ہے اور صرف جذبے کے ذاتی محرک سے حرکت میں آجاتی ہے اور نفس

Marfat.com

میں پیوست آفاقیت کے جذبۂ پنہاں کو قبول کرتی ہوئی ارتقاء حاصل کر لیتی ہے۔

عملِ صالح، اور کسی اعلیٰ تر مقصد اور عمومی مصلحت کی خاطر تکلیف اٹھانا اور محروم رہنا فرائڈ کی پیش کردہ تعبیر ضمیر کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے خیال میں ضمیر اس وقت اُبھرتا ہے جب انسان پر خارج سے ایک ایسی جبری قوت مسلط کر دی جائے۔ جس سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ عملِ صالح، بلند مقصد اور عمومی مصلحت کی خاطر تکلیف اٹھانا اس بات کی تائید کرتا ہے کہ انسانوں میں وہ معنوی اور اخلاقی قدریں موجود ہیں، جو خود انسان کے اندر سے اُبھری ہیں اور جو نہ اس پر خارج سے مسلط کی گئی ہیں، اور نہ وہ ان کے اپنانے پر مجبور کیا گیا ہے۔

جذبات کی دوئی

مگر فرائڈ کو انسان کے ان پاکیزہ محرکات کی یہ پاکیزہ تعبیر پسند نہیں ہے۔ وہ ان کی ایسی تعبیریں ڈھونڈ کر لاتا ہے جن سے ان کی رونق جاتی رہے اور ان کی نورانیت دھندلا جائے۔ اس کی نظر میں انسانی کردار و اخلاق کی ہر بلندی کسی خسیس اور گرے ہوئے جذبے پر پردہ ڈالنے کا ایک لاشعوری بہانہ ہوا کرتی ہے۔ اور انسان جس قدر پاکیزگی اختیار کرتا ہے اور جس قدر انسانیت کے میدان میں قدم بڑھاتا ہے، وہ اس کا ایک ظاہری عمل ہوتا ہے مگر فی الحقیقت اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس کے لاشعور میں چھپے ہوئے مجرمانہ جذبات مزید شدت اختیار کر گئے ہیں۔

اگر فرائڈ اپنے ان افکار کو کبھی کبھی پیش آنے والے مخصوص حالاتِ مرض کے ساتھ ہی خاص رکھتا تو اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب (Totem and Taboo) میں صفحہ ۶۸ پر کہتا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ ان اعصابی حالات میں جن میں مریض پر ایک معین فکر مسلط ہو جاتی ہے، مریض کے ضمیر میں شدید ترین حساسیت

Marfat.com

پیدا ہو جاتی ہے، جو اس معکوس قوت کا مظہر ہوتی ہے جو لاشعور میں چھپے ہوئے بُرائی پر آمادہ کرنے والے جذبے کے خلاف سرگرم عمل ہوتی ہے۔"

مگر اس نے اس بات کو تمام انسانیت کا ایک عمومی قانون قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ ۶۰ پر کہتا ہے:

"وہ تمام حالتیں جن میں کسی مخصوص شخص سے شدید جذباتی وابستگی پائی جائے، ان تمام حالتوں میں اس شدید محبت کے پسِ پردہ لاشعور میں شدید نفرت بھی موجود ہوتی ہے۔"

گویا کہ اس نفرت کا سبب نامعلوم، اور اس سے اجتناب ناممکن ہے۔ اور یہ امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت آگے چل کر کسی وقت اس نفرت سے اپنا دامن چھڑا لے گی کیونکہ جذبات کی دوئی انسان کی طبیعت میں شامل ہے محبت کے ساتھ خود بخود شعورِ نفرت اُبھرتا ہے، خوشی اپنے ساتھ رنج لاتی ہے، اور دلچسپی کے پس پردہ نفرت پنہاں ہوتی ہے۔ غرض نفس انسانی میں جو بھی احساس گزرتا ہے، لازمی طور پر اور بغیر کسی سبب کے وہ شعور بھی آتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ اب چونکہ عملی طور پر (Practically) یہ ممکن نہیں ہے کہ دو متضاد احساسات پردۂ شعور پر بیک وقت ظاہر ہو سکیں، اس لیے صرف ایک ہی احساس دنیائے شعور میں جگہ پاتا ہے۔ اور وہ وہی ہوتا ہے جسے سماج سامنے آنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ دوسرا احساس لاشعور میں چھپ جاتا ہے اور اس موقعے کی تاک میں رہتا ہے کہ اسے ظاہر ہونے کا موقع ملے تو وہ ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ یہ احساس کبھی خواب میں رونما ہوتا ہے اور کبھی ایسی حرکات، اعمال اور جذبات کے ذریعے اس کا اظہار ہوتا ہے، جو اگرچہ دیکھنے میں اصل احساس سے بہت دُور معلوم ہوتے ہیں، مگر فرائڈ جیسی عبقریت ان کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے دلائل اور اسباب تلاش کر ہی لیتی ہے!

Marfat.com

فرائڈ اپنی کتاب (The Ego and the Id) میں صفحہ ۵۹ پر کہتا ہے:۔

" طبی مشاہدات بتاتے ہیں کہ جذبۂ محبت کے ساتھ نفرت کے جذبات ایک ایسی ترتیب کے ساتھ اُبھرتے ہیں جو اندازے سے باہر ہے۔ انسانی تعلّقات میں نفرت اکثر محبت پر سبقت رکھتی ہے، بلکہ طبی تجربات تو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ نفرت بیشتر موقعوں پر محبت میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح نفرت محبت بن جاتی ہے ـــــ یہ بات واضح ہے کہ وہ حالتیں ہماری گفتگو کا موضوع نہیں ہیں جن میں ایک شخص کسی مخصوص شخص سے محبت کرتا ہے، اور پھر بعد میں اس سے نفرت کرنے لگتا ہے، کیونکہ یہ شخص اس تبدیلی کے اسباب بیان کر سکتا ہے۔"

فرائڈ نفسِ انسانی میں پیدا ہونے والی تمام جذباتی وابستگیوں کی اسی طرح تعبیر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تعبیر کے مطابق بیٹا اپنے باپ سے نفرت کرتا ہے،[1] بیٹی اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے، اور بیوی اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے اور شوہر کی موت کی آرزومند رہتی ہے۔ اور جب کسی رشتے دار کی موت پر اس کے اقرباء رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں تو وہ بھی بے میل حقیقی رنج نہیں ہوتا، بلکہ اس رنج کے اظہار سے مقصود اس پوشیدہ خوشی کو چھپانا ہوتا ہے جو انھیں اس رشتہ دار کی موت پر ہوتی ہے، جس سے وہ پہلے ہی نفرت کرتے تھے اور اس کی موت کے خواہاں رہتے تھے۔

فرائڈ کی نظر میں یہ مظہر (Phenomenon) صرف انفرادی جذبات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلاؤ افراد اور معاشروں کی پوری نفسیاتی زندگی پر محیط ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب (Totem and Taboo) میں صفحہ ۷۵ پر لکھتا ہے:

---

[1] (Totem and Taboo P. No. 50)

Marfat.com

"میں کئی موقعوں پر اس جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ جذبات کی دوئی (Ambivilence) ـــــ یعنی محبت و نفرت کا ایک ہی وقت میں ایک ہی شے کے لیے موجود ہونا ـــــ ہی وہ بنیاد ہے، جس پر بہت سی تہذیبوں کی عمارت قائم ہوتی ہے اور ہمیں جذبات کی اس دورنگی کے ماٰخذ و مبداء کا کچھ علم نہیں ہے۔"

گویا انسانیت کے نامۂ اعمال پر یہ سیاہی پھیر دی گئی ہے کہ انسان کا کوئی بھی شعور صاف ستھرا اور گندگیوں اور آلائشوں سے پاک نہیں ہو سکتا، اور نہ کبھی انسانیت اس قابل ہو سکتی ہے کہ مقدر کی اس سیاہی کو چھڑا دے کیونکہ نفس میں جو بھی پاکیزہ جذبہ اُبھرے گا لازمی طور پر لیکن نامعلوم اور ناقابلِ فہم طریق پر اس کے ساتھ ایک اور جذبہ بھی پیدا ہو گا جو غیر پاکیزہ ہو گا ـــــ اس لیے تاریخ میں یہ کبھی ہوا ہی نہیں کہ بچے نے اپنے والدین سے، والدین نے اپنے بچوں سے، بھائی نے بھائی سے یا کسی بھی انسان نے دوسرے انسان سے محبت کی ہو، سوائے اس صورت کے کہ وہ جس سے محبت کرتے تھے اس سے جبری اور غیر ارادی اور بلا سبب نفرت بھی اپنے لاشعور میں چھپائے رکھتے تھے، اور یہ جذبۂ نفرت بھی اسی قدر شدید ہوتا جس قدر کہ جذبۂ محبت!

اور یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ انسانیت کے کسی فرد نے فطری میلانات کو کچلے اور دبائے بغیر کوئی رفعت حاصل کی ہو، کیونکہ انسان کے فطری میلانات اپنی طبیعت اور مزاج کے لحاظ رفعت اور پاکیزگی سے متصادم ہیں اس لیے طبعی تقاضوں اور جذبۂ پاکیزگی میں ہم آہنگی اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ طبعی میلانات کو کچل (Suppressed) دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرائڈ کی نظر میں کوئی بھی شخص کسی فکرِ بلند اختیار کرنے، یا لوگوں کے پاس خاطر سے یا اپنے ضمیر کی پکار سُن کر بخوشی اور اپنے ارادے سے ان طبعی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس کی نظر میں فطری جذبات کو کچلے بغیر من چاہتوں سے گریز

Marfat.com

کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

فرائڈ یہ نہیں کہتا کہ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں سے کسی بھی وقت باز نہیں آتا، بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب بھی باز رہتا ہے وہ باپ، سماج، مذہب اور روایات جیسی جابر قوتوں کے روکنے سے باز رہتا ہے۔ کیونکہ فرد ان قوتوں کے سامنے اپنے آپ کو بالکل مجبور و مقہور پاتا ہے۔

فرائڈ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ کبھی کبھی انسان اپنی مرضی سے بھی اپنی بہت سی خواہشوں سے دست بردار ہو جاتا ہے مگر اس عمل کی تعبیر وہ یہ کرتا ہے کہ یہ اختیار ظاہری ہوتا ہے جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ذات اعلیٰ (Super Ego) یا نفسیاتی ضمیر اس صورت میں ذات (انا) کو اس عمل سے باز رہنے پر آمادہ کر لیتے ہیں یا مجبور کر دیتے ہیں تاکہ اربابِ اقتدار کی ناراضگی اور ان کی تکلیف دہی اور ایذا رسانی سے محفوظ رہ سکے۔ اس طرح لاشعور میں ایک پیچیدہ مغالطہ سرایت کر جاتا ہے۔ جو خود فرد کو قائل کر دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس کام سے باز رہا ہے، اور کسی جابر قوت نے اسے نہیں روکا ہے۔ اس مغالطے کے دو فائدے ہیں؛ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ذات اعلیٰ (Super Ego) یہی سمجھتی ہے کہ 'انا' اسی کی تابع ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہے، اور اس طرح بظاہر فرد اپنی خوشی سے اس عمل سے باز رہتا اور سماج کی ناراضگی سے بچا رہتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح فرد کا اپنی ذات کا احساس مجروح نہیں ہوتا اور ظاہری طور پر اس کا شعور خارجی دباؤ کے وجود کا انکار کر دیتا ہے، اور فرد اس قابل ہو جاتا ہے کہ سماج میں ہنسی خوشی رہ سکے۔ یہ ذاتِ اعلیٰ (Super Ego) کا ایک دلچسپ اور عجیب کھیل ہے کہ وہ اس طرح فرد کو خواہشوں کی تکمیل سے روکتا ہے، اور ہمارے جیسے سادہ لوح یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اخلاقی ضمیر فرد کو خواہشوں اور من چاہتوں کی تکمیل سے باز رکھتا ہے۔

ضمیر و اخلاق کی یہ کیا ہی خوب تاویل ہے! بلاشبہ نفسِ انسانی میں یہ عمل متواتر

Marfat.com

ہوتا رہتا ہے، اور اس بار یکی سے ہوتا رہتا ہے کہ عام انسانوں کو اس کا ذرا سا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور یہ فرائڈ ہی کا کمال ہے کہ اس نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا ہے

پاکیزہ انسانی اعمال

مگر نفسِ انسانی کی جو حدود فرائڈ نے مقرر کی ہیں، وہ بہرحال اس کی آخری حدود نہیں ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نفسِ انسانی کچھ اعمال بخوشی انجام دیتا ہے اور کچھ سے بخوشی باز رہتا ہے۔ اور جو اعمال وہ انجام دیتا ہے ان میں سماجی قوتوں کے جبر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ یہ اُمور کسی خواہش کی تکمیل کے لیے کیے جاتے ہیں؛ بلکہ رفعت و پاکیزگی اور عظمتِ نفس خود بخود شہوانی قوت کی پکار پر لبیک کہنے سے روک دیتی ہے اور انسان رُک جاتا ہے۔ اس طرح کہ نہ نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور نہ اعصابی اضطراب رونما ہوتا ہے — اس سے قبل مَیں اس کی مثال میں انبیاء، مقدس لوگوں، راہنماؤں اور مصلحین کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایسے افراد خاص طور پر اسلامی دنیا میں لاکھوں گنوائے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ آج کے دَور میں تہذیبِ مغرب کی یلغار اور اس کے اثرات سے بہت حد تک کم ہو گئے ہیں، مگر ایک زمانہ تھا کہ ایک ہی نسل میں اس قدر افراد ہوتے تھے کہ ان کا نگاہوں سے اوجھل رہنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو اپنی خوشی سے ایسے اُمور انجام دیتے تھے جو مذہب، سماج اور روایات نے ان کے ذمے نہیں کیے تھے۔ یہ لوگ ابنارمل (Abnormal) بھی نہ تھے کہ ان کا طرزِ عمل کسی خارجی قوت کے دباؤ کی بنا پر مضطرب ہو گیا ہو، بلکہ ان کے اعمال پاکیزہ انسانی جذبات کی تکمیل ہوتے تھے جو وہ رضاکارانہ طور پر اپنے ذمے لگا لیتے تھے۔ مَیں جب اسلامی نقطۂ نظر بیان کروں گا اس وقت اس قسم کے افراد کی متعدد مثالیں پیش کروں گا۔ البتہ یہاں پر ایک ایسی عمومی مثال پیش کیے دیتا ہوں جس کی تصدیق ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جس نے اپنے سے پہلی نسل پائی ہے یا ان کے بارے میں اپنے بزرگوں سے کچھ سُنا ہے۔

Marfat.com

پہلے زمانے میں کوئی تنگ دست اپنی کوئی ضرورت لے کر کسی مال دار کے پاس جاتا تو بڑی انکساری اور عاجزی سے جاتا، اور جوں ہی مال دار کو اس کی ضرورت کا علم ہوتا، اُس کی خوب عزت افزائی کرتا، پھر خاموشی سے اور چھپا کر اُس کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ نیز وہ اُس قرض کی کوئی تحریر لکھوانے پر رضامند نہ ہوتا بلکہ اُس بات کی قسم کھاتا تھا کہ وہ قرض کی واپسی اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک کہ مقروض آسودہ حال نہ ہو جائے اور اُس کے پاس مال اس حد تک زاید از ضرورت نہ ہو جائے کہ وہ قرض اُدا کر سکے۔ اور وہ یہ احتیاط رکھتا کہ کسی کو اُس قرض کا علم نہ ہونے پائے!

غور کیجیے —— اس مال دار کو اُس قسم کے طرزِ عمل پر کس چیز نے مجبور کیا ہے؟ کیا مذہب نے؟

جی نہیں، مذہب قرض دینے والے کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ مقروض سے رسید لکھوا لے۔ مذہب کسی کو اُس پاکیزہ روش کے اختیار کرنے کا حکم نہیں دیتا ہے جس میں قرض کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو۔

کیا سماج نے اسے اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے؟

جی نہیں، سماج کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے حقوق اُس طرح قرض دار کی معمولی سی نیت کی خرابی کی بھینٹ چڑھا دے۔ یہ درست ہے کہ سماج اس پاکیزہ عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، مگر کسی چیز کا پسند کرنا ایسی کوئی جابر قوت نہیں ہے جو کسی کو جبرًا قہرًا اپنی اطاعت پر مجبور کر دے۔ پھر جب قرض دینے والا اس بات پر مُصِر ہے کہ اُس معاملہ کو لوگوں سے چھپایا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس عمل سے اُس کا مقصد اپنی تعریف و توصیف کرانا نہیں ہے۔ ایک جھگڑالو آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا تعاون اور اُس کی پردہ داری اس وقت کے معاشرے کی ایک رِیت تھی، جس پر لوگ عامۃ الناس کی تنقید سے بچنے کے لیے عمل کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اُس بات کا بھی یہی مطلب ہوا کہ نیکی اور پاکیزہ اعمال کا دائرہ

Marfat.com

معاشرے میں اس قدر وسیع تھا کہ بجائے کسی ایک شخص کے جو کسی ایک نسل میں پیدا ہو جائے، نیکی اور خیر سارے معاشرے کی امتیازی خصوصیت بن گئی تھی۔ اور اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائے معاشرہ پہ یہ روایت کس نے لازم کر دی تھی۔ ایسی کوئی قوت قاھرہ نہیں تھی جس نے بجبر اس روایت کو سماج میں رواج دے دیا ہو ــــ بلکہ یہ ایک خوش دلانہ روش تھی جسے ابتداءً ایک فرد یا چند افراد نے کیا، اور پھر لوگ اپنی خوشی سے اس روشِ خیر کو اپنانے گئے اور پاکیزہ اور نکوکار لوگوں میں شامل ہونے گئے۔

اگر فرائڈ اپنی مادیت پسندی سے متاثر ہو کر اور اپنی یہودی خصلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسانیت میں موجود کسی سرچشمۂ خیر کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تو نہ کرے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرے کا فرد ہے جو ہمیشہ سے مادیت میں سر تا پا غرق رہا ہے، جسے مادیت رومی سلطنت سے وراثت میں ملی ہے اور جس نے یہ عادت بھی رومیوں ہی سے ورثے میں پائی ہے کہ اقوامِ عالم کو غلام بنا کر اور ان کے سارے سرمایۂ حیات کو لوٹ کر اپنی لامتناہی خواہشوں کی تکمیل کرتے رہیں۔ غرض فرائڈ کو اس بات کا جواز مل سکتا ہے کہ وہ انسانیت میں موجود کسی خیر کو تسلیم نہ کرے۔ مگر ہمارے لیے اس اندھی تقلید کا کیا جواز ہے کہ ہم فرائڈ کی ہر فکرِ غلط کو جوں کا توں تسلیم کرتے جائیں جبکہ ہماری نظروں کے سامنے اسلام کی صورت میں وہ عظیم سرچشمۂ خیر موجود ہے جس سے ہمیشہ نیکیوں کے سوتے اُبلتے رہے ہیں، اور آج تک اس رودِ کوثر کے بہاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے!

خوابوں کی تعبیر

فرائڈ کی شخصیت میں جو مادیت سرایت کیے ہوئے تھی اور وہ جس معاشرے میں سانس لے رہا تھا اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ تمام غیر محسوسات کا انکار کر دے۔ چنانچہ خوابوں کی تعبیر میں وہ مادیت کی راہوں پر چلتا ہوا بہت دُور نکل گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ارضی حدود سے باہر، بلکہ خود

Marfat.com

انسان کی اپنی ذات کی حدود سے باہر کسی شے کو نہیں مانتا اور بشارتی خوابوں کا کھلم کھلا انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان خوابوں کی بنیاد 'روح' ہے اور وہ تعلق ہے جو روح کا عظیم تر کائنات اور نامعلوم غیب سے ہے۔ اور یہ باتیں ایسی 'خرافات' ہیں، جن کو سیدھے سادھے لوگ تو تسلیم کر سکتے ہیں مگر فرائڈ جیسے 'مفکرین' کے لیے تو کسر شان ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو تسلیم کریں۔ اسی لیے وہ خوابوں کی تعبیر میں 'اشاری طریقے' کو بھی خرافات قرار دیتا ہے!

فرائڈ کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ ایک صفحے پر کہتا ہے کہ خوابوں کی تعبیر کا اشاری طریقہ (جیسے فرعون کے مشہور خواب کی تعبیر) محدود دائرے میں منطبق ہو سکتا ہے، اور اسی کتاب کے دوسرے صفحے پر کہتا ہے کہ 'اشاری طریقہ مہمل ہے'!

اگر فرائڈ صرف یہی کہتا کہ اشاری طریقہ محدود دائرے میں منطبق ہو سکتا ہے، تو اس میں کسی کو اختلاف نہ ہوتا۔ کیونکہ بلاشبہ عوام الناس کے بیشتر خواب ان کی اپنی گھٹی ہوئی خواہشات کا اظہار ہوتے ہیں۔ مگر بعض خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تشریح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک فرد کی ذات کا 'عظیم تر کائنات اور نامعلوم غیب سے کوئی نہ کوئی 'تعلق تسلیم نہ کر لیا جائے۔

اس مرحلے پر دو بنیادی حقیقتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے خوابوں کا خال خال وقوع پذیر ہونا ان کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہے، اور نہ ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس قسم کے خوابوں کو زیر بحث ہی نہ لایا جائے۔ کیونکہ اس بات کا تو کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ تمام خواب بشارتی ہوتے ہیں، بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی رُوح پاکیزہ اور نفس شفّاف ہوتا ہے۔ وہ بشارتی خواب دیکھتے ہیں اور اُن کی رُوح غیب کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی کسی نامعلوم بات کا پتہ لگا لیتی ہے۔ اس قسم کی ایک مثال بھی ہو تو بھی وہ اس دائمی نفسیاتی حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے: حالانکہ یہ ایک ہی مثال نہیں ہے بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں لوگ اس قسم کے خواب

Marfat.com

دیکھتے ہیں جن کی تعبیر دن کے اُجالے کی طرح سامنے روشن ہو جاتی ہے۔

فرائڈ اور اس کے متّبعین کہتے ہیں کہ یہ محض اتفاق ہوتا ہے کہ بعض خواب عالم بیداری میں متحقق ہو جاتے ہیں، اور لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انھیں پہلے سے بشارت دی گئی ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ خواب خود غیر شعوری طور پر انسان کو اس امر پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنے خواب کو عملی صورت دے دے!

فرائڈ کا یہ کہنا کہ خواب کا عملی طور پر وقوع پذیر ہو جانا محض اتفاق ہوتا ہے، یا خواب دیکھنے والے کی اس بات کی لاشعوری کوشش ہوتی ہے کہ اس کا خواب سچا ہو جائے؛ بلاشبہ ان دونوں باتوں سے بہت سے خوابوں کی تشریح ہو سکتی ہے، مگر کچھ خواب تو بہر حال ایسے ہوں گے جن کی اس بنیاد پر تشریح نہیں ہو سکتی ـــــ غیر علمی حیلہ سازی اور لاگ لپیٹ ہی اس بات پر مجبور کر سکتی ہیں کہ کسی غیر وزنی رائے کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

فرائڈ کا یہ اعتراف کہ اشاری طریقہ محدود دائرے میں منطبق ہو سکتا ہے، یہ بتلاتا ہے کہ کچھ خواب ایسے بھی ہیں جن پر اس کی وہ تشریح منطبق نہیں ہوتی جو عالمِ روح کے وجود سے انکار کرتی ہے، اور جو انسانی حدود سے خارج ہر شے کی منکر ہے، اور صرف اس لاشعور کو مانتی ہے جو فرد کے ذاتی تجربات کا خزانہ اور اس کی محدود زندگی کے حالات کا ٹھکانہ ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس راز کا پتہ نہ چلنا کہ انسان کا عظیم تر کائنات اور غیب نامعلوم سے کیا تعلق ہے، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ سرے سے کوئی تعلق ہی موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کی ابھی تک اس تعلق تک رسائی نہیں ہو سکی ہے، مگر ممکن ہے مستقبل میں اس راز سے پردہ اٹھ جائے۔ جو سائنس آج ٹیلی پیتھی[1] (Telepathy) کو تسلیم

[1] دُور خیالی (Telepathy)

حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ آپؓ نماز پڑھا رہے تھے،

Marfat.com

کرچکی ہے، جو فی الواقع انسان کی محدود طاقتوں اور محدود حواس کے لحاظ سے ایک عجیب شے ہے، وہ سائنس کسی وقت نفسِ انسانی کی تعبیر کے لیے مزید وسیع پہلو اور روشن گوشے بھی ڈھونڈ سکتی ہے، بالخصوص اس وقت جب وہ ایٹم اور اشعاع کے رازوں سے بخوبی آشنا ہو جائے گی!

غرض فرائڈ کا یہ قول کہ انسانی زندگی میں روحانیت کا کوئی دخل نہیں ہے، کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت نہیں ہے، بلکہ ایک شخص کے اپنے ذاتی تاثرات ہیں جن کا علم و سائنس سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ ہم مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ ہم یہ باتیں بلاچون وچرا تسلیم کرلیں۔

---

(۴) دوران نماز ہی آپؓ نے پکار کر فرمایا: اے ساریہ پہاڑ پر! پہاڑ پر! ساریہ نے ہزاروں میل کے فاصلے پر یہ آواز سنی اور اس پر عمل کر کے دشمن پر فتح حاصل کی۔

Marfat.com

فرائڈ اور مذہب

مذہب کے موضوع پر آ کر تو فرائڈ نے انسانیت کی اقدارِ عالیہ کو پامال کرنے اور انسانیت کو بدترین صورت میں پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے!

—— اس کے خیال میں مذہب ایک بدترین جرم کی پیداوار ہے —— وہ اس طرح کہ انسانیتِ اولیٰ کی کسی نسل میں بیٹوں نے اپنی ماں میں زبردست جنسی کشش (Sexual Appeal) محسوس کی، (یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ انھوں نے اپنی نسل کی دوسری عورتوں میں کیوں دلچسپی نہیں لی!) مگر باپ کا اقتدار اس گناہ کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ اس پر اولاد نے یہ سازش کی کہ باپ کو قتل کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے اور اس طرح ماں کو حاصل کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے اپنی اس سازش کو عملی جامہ پہنا دیا —— مگر فوراً ہی انھیں شرمندگی محسوس ہوئی اور احساسِ گناہ ان پر غالب آ گیا؛ اس لیے انھوں نے یہ عزم کیا کہ وہ اپنے مردہ باپ کی یاد منائیں گے!

باپ کی شخصیت ان کے شعور میں کچھ حیوانات سے مربوط ہو گئی —— فرائڈ کے خیال میں یہ ایک طبیعی اور نفسیاتی عمل ہے[1] —— چنانچہ باپ کے قتل کے کفّارے کے طور پر اور اس کی مقدس یاد منانے کی خاطر کچھ جانوروں کو مقدس قرار دے کر ان کا مارنا حرام قرار دے دیا —— اسی سے دنیا کے اوّلین مذہب

---

[1] یہ نہیں بتلایا گیا کہ یہ طبعی عمل کیوں کر بن گیا۔ حالانکہ دلیل میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ ان بیمار اور ابنارمل بچوں کے حالات ہیں، جنھوں نے اپنے لاشعور میں چھپی ہوئی اپنے باپ کے خلاف نفرت کو کچھ جانوروں سے نفرت اور خوف میں بدل لیا۔

Marfat.com

طوطمیت (Totem) نے جنم لیا اور اس کے بعد جس قدر مذاہب آئے ہیں وہ دراصل اسی احساسِ جرم کے مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ مذاہب تہذیبی اختلاف اور اپنے وسائل کے فرق کی بناء پر مختلف ہوتے ہیں، مگر ان سب کا اصل ہدف (Target) ایک ہی ہوتا ہے، یعنی باپ کے قتل کے عظیم واقعہ کا ردِّ عمل، جس نے آج تک انسانیت کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور جو تنہا تمام تہذیبوں کا سرچشمہ بنا[۱]!

اس مرحلے پر آ کر فرائڈ کو یہودیت کی بدترین دشمن مسیحیت پر بھی تعریض کا موقع ملتا ہے، بلکہ یہ کہیے کہ یہ سارے مقدمات اسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ دراصل مسیحی دیومالا (Mythology)، بیٹے (مسیحؑ) کی اپنے باپ (خدا) کے سنل کی خواہش کا سراغ دیتی ہے، اگرچہ بیٹے نے اپنی اس خواہش کو کچل ڈالا، اور باپ کی جگہ خود قتل ہو گیا: مگر اس کے ساتھ ہی وہ باپ کی جگہ خدا بھی بن بیٹھا[۲]!!

یہ مسئلہ صرف مذہب کی تحقیر و تذلیل پر اور اس دعوٰی پر کہ مذہب عشقِ مادر کی اُلجھن (Oedipus Complex) یعنی کچلی ہوئی جنسی خواہش کی پیداوار ہے، ختم نہیں ہو جاتا بلکہ فرائڈ کے خیال میں آج تک تمام افکار و جذبات کا سوتا اسی جنسی خواہش سے اُبلتا رہا ہے۔

اس کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ مذہب زندگی کی اُمنگ کو کچل ڈالتا ہے، کیونکہ مذہب کا سرچشمہ بدوی اور غیر مہذّب ابتدائی دَور کے لوگوں کی من گھڑت کہانی ہے، مگر اب چونکہ سائنس وجود میں آ چکی ہے اور انسانیت کی بہتری راہنما بن چکی ہے اس لیے سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے اور اس لیے مذہب کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے[۳]۔

۱؎ Totem and Taboo

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً

Marfat.com

سماج، اخلاق اور روایات

سماج، اخلاق اور روایات ایسے چوکیدار ہیں، جو ہر وقت فرد کی گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی فرد کو پامال کر کے اپنا ماتحت اور اپنا تابع فرمان بنا لیتے ہیں۔ مگر دوسری جانب فرد بھی اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کھلم کھلا بغاوت کر کے یا اگر بُرے انجام کا ڈر ہو تو حیلے بہانے اور فریب سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح اقتدار کا یہ پھندا گلے سے نکال پھینکے۔

فرائڈ واضح الفاظ میں یہ نہیں کہتا کہ سماج، اخلاق اور روایات بکواس ہیں اور فرد کی خوش باش زندگی اور اس کی ذات کے اثبات اور خواہشوں کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ یہ رُکاوٹیں اس کے راستے سے ہٹا دی جائیں۔

مگر وہ کہتا ہے کہ پاگل، من چلے، ہسٹریا کے مریض، مرگی زدہ، ایسے مجنون جن کے دماغ کے عضویاتی عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے، عدالتی کٹہرے اور پھانسی کے تختے کی جانب جانے والے مجرم — سب ایسے لوگ ہیں جو سماج اور روایات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جو مذہب اور غلطیٔ ضمیر کی قربان گاہوں پر نثار ہو گئے، اور جو ان رُکاوٹوں کی نذر ہو گئے جو فرد کے راستے میں کھڑی کر دی گئی ہیں، جو اس کی جبلتوں کو کچل ڈالتی ہیں، اس کے وجود کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، اور اس کی زندگی کی اُمنگ کو مُرجھا دیتی ہیں۔

یہ بات کہہ کر فرائڈ آپ کو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ ان نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی اضطرابات سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فرد کے راستے سے یہ تمام نقصان دہ رُکاوٹیں ہٹا دی جائیں اور اس کے کچلے ہوئے جذبات کو روایات کے قید خانے سے آزاد کرایا جائے۔

اس کے مندرجہ بالا افکار پر جب شدید ترین تنقید کی گئی۔ (جیسا کہ وہ اپنی کتاب (The Ego and the Id) میں بیان کرتا ہے۔) تو اس نے انسان کے افکارِ عالیہ — مذہب، اخلاق اور اجتماعی شعور — کو سندِ قبول عطا کی، مگر اس

Marfat.com

بات پر بدستور اصرار کیا کہ یہ افکارِ عالیہ عشقِ مادر کی اُلجھن (Oedipus Complex) میں پیوست کچلے ہوئے فطری جذبات سے پیدا ہوتے ہیں۔

کسی شخص کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ فرائڈ نے دباؤ کے عمل (Suppression) کو انسانیت کی ناگزیر ضرورت قرار دیا ہے، کیونکہ یہی دباؤ انسانی رفعت — (Sublimation)[1] کا واحد راستہ ہے، اور فرائڈ رفعت کو حیوانات سے جُدا گانہ انسانی خصوصیت تصور کرتا ہے۔

مگر یہ گمان غلط ہے۔ اس لیے کہ اُس نے انسانیت کے مرتبے کو گرانے اور ہر اچھی بات کو بُرا بنا کر پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب (نظریۂ جنسی کے اطوارِ ثلاثہ) (Three Contributions to the Sexual Theory) میں رفعت کے زیرِ عنوان صفحہ ۸۲ پر لکھتا ہے:

"جنسی کجروی (Sexual Perversion) کی تیسری قسم وہ ہے جس کے نتیجے میں رفعت کا عمل اُبھرتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں فرد کے جنسی سرچشموں سے اُبلنے والی شہوانی قوت کو جنس کے علاوہ دیگر اُمور میں کھپا دیا جاتا ہے اور وہاں اس قوت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس ذخیرے سے انسان میں ایک عظیم نفسیاتی استعداد پیدا ہوتی اور زبردست نفسیاتی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔"

اس سے زیادہ وضاحت سے اسی کتاب کے صفحہ ۸۵ پر کہتا ہے کہ:

---

[1] رفعت یا تصعید (Sublimation)

لاشعور کا وہ طرزِ عمل ہے جس کے تحت جنسی جذبہ یا جنسی توانائی کسی غیر جنسی دلچسپی میں تبدیل ہو کر سوسائٹی کے لیے قابلِ قبول ہو جائے۔ (س۔ صدیقی)

دیکھیے: James Drever : *A dictionary of Psychology*, Penguin, 1962.

Marfat.com

"تہذیب اور جنسی قوت کے آزاد نشو و نما میں تعارض ہے"۔

اگر اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ چاہتے ہیں تو آپ (The Ego and the Id) کے صفحہ ۸۰ پر یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

"اخلاق خواہ اپنے طبعی اور معمولی درجے ہی میں کیوں نہ ہو مگر اس پر سماجی جبر کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں"۔

نفسیاتی شذوذ

مَیں یہ نہیں کہتا کہ فرائڈ نے مذہب، سماج، اخلاق اور روایات کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بلا سبب ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان خیالات کی ایک اہم وجہ موجود ہے اور وہ یہ کہ فرائڈ نے جس مسیحی سماج میں آنکھ کھولی اور جس معاشرے سے اپنے تجربات و تحقیقات میں استفادہ کیا وہ معاشرہ خود اس قدر سخت گیر اور متشدّد تھا کہ اس تشدّد کی بناء پر لوگوں میں سینکڑوں اضطرابات اور ہزاروں قسم کی بے راہ رویاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سخت گیر مسیحی تعلیمات انسانوں اور انسانوں کی طبیعت و مزاج سے بہت زیادہ متعارض تھیں اور ان تعلیمات کا نفسِ انسانی میں ابھرنے والے فطری میلانات سے تصادم اور اس تصادم کے نتیجے میں کشمکش کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فرائڈ کو ان خیالات کے اظہار میں معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے، مگر جس طریقے پر اس نے احکامات کا استنباط کیا ہے خود اس میں وہ معذور نہ تھا، کیونکہ اس طریقۂ استنباط میں فنّی غلطیاں موجود ہیں۔ اس کے تمام تجربات کا انحصار غیر مستقیم (Abnormal) لوگوں پر تھا، اور انہی لوگوں سے اس نے مستقیم (Normal) لوگوں کے احکامات بھی اخذ کیے اور دلیل یہ دی کہ سب ہی لوگوں میں کسی نہ کسی درجے میں شذوذ ——

Marfat.com

(Abnormality) پایا جاتا ہے[1]۔ اور خود شذوذ نفس کی طبعی حالت سے پیدا ہوتا ہے اور اسی طبعی حالت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے[2]۔

اس نقطۂ نظر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ طبعی قوتِ کارکردگی مستقیم حالت (Normal) میں جو کردار ادا کرتی ہے، وہ اس وقت ادا نہیں کرتی جب یہ قوت ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے یا اس میں کمی پیدا ہو جائے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ شذوذ (غیر طبعی حالت) کو صرف اس حیثیت سے نہیں دیکھنا کہ اس کے اور طبعی حالت کے مظاہر اور بیرونی شکلیں باہم ملتی جلتی ہیں، بلکہ اس حیثیت سے دیکھنا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے اور کس قسم کا کردار ادا کرتا ہے۔

اس نفسیاتی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہم ایک جسمانی مثال بیان کرتے ہیں:

ایک معمولی جسم میں ہمہ وقت مخصوص مقدار اور مقررہ طریقے پر خلیے — (Cells) بنتے رہتے ہیں۔ نئے خلیے ان خلیوں کی جگہ لیتے رہتے ہیں جو مختلف حیاتیاتی عمل کی بناء پر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ جسم کی افزائش و نمو کا یہ ایک مخصوص طریقہ ہے، اور جب تک یہ نشوونما طبعی طریقے پر ہوتا رہتا ہے، جسم باقی رہتا ہے۔ مگر جب جسم کچھ نامعلوم اسباب کی بناء پر مرض کا شکار ہوتا ہے تو خلیوں میں نمو کا عمل تیز ہو جاتا ہے، اور وہ اپنا طبعی فریضہ انجام دینے کے بجائے جسم کی تمام غذا چوسنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح جسم کے طبعی عمل میں حائل ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خلیوں کی طبعی حالت میں اضافہ ہو گیا ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ بدورم یا آماس ہے جو جسم کی نارمل حالت میں اس کے طبعی عمل سے پیدا نہیں ہوا، اگرچہ ظاہری طور پر

---

[1] ملاحظہ فرمایئے: (Three Contributions to the Sexual Theory)

[2] بحوالۂ سابق۔

Marfat.com

طبعی عمل سے مشابہ ضرور ہے، فرق جو کچھ ہے وہ صرف مقدار کا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ نماؤ کا یہ عمل دونوں صورتوں میں یکساں کردار انجام نہیں دیتا۔ بلکہ نارمل حالت میں وہ ایک ایسا ضروری اور ناگزیر کردار انجام دیتا ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے جبکہ دوسری صورت میں یہی عمل مضرت رساں اور زندگی کے لیے خطرناک بن جاتا ہے[1]

بعینہٖ یہی صورت نفسیاتی شذوذ (Psychological Abnormality) کی بھی ہے۔ اس میں بھی نفس کے طبعی عمل سے مشابہت موجود ہے، مگر کردار بہرحال دونوں حالتوں میں مختلف ہے۔ اس لیے شذوذ کی حالت میں بھی اسی طریقے سے حکم نہیں لگایا جا سکتا جس طریقے سے نارمل (Normal) حالت میں لگایا جاتا ہے، کیونکہ نارمل حالت میں نفس کے لیے مفید کردار انجام پا رہا ہوتا ہے جو نفس کے اصل وجود سے متصادم نہیں ہے۔ جبکہ شذوذ کی صورت میں رُو بہ عمل آنے والا کردار نفس کے لیے تباہ کن اور موجبِ فساد ہوتا ہے۔ اس لیے جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شذوذ طبعی حالت کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے، اسی طرح اس کے برعکس یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ طبعی حالت شذوذ کی ایک گھٹی ہوئی شکل ہے، جیسا کہ فرائڈ کہنا چاہتا ہے تاکہ اس کے لیے دونوں حالتوں پر یکساں حکم لگانے کا جواز پیدا ہو جائے۔

---

[1] اس سلسلے میں ماہرینِ طبیعیات کا یہ کلیہ بھی پیشِ نظر رکھیے جو اقتصادیات و اجتماعیات میں بھی مستعمل ہے کہ:

"جب کوئی چیز اپنی مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تو یہ تغیرِ کمیت، تغیرِ نوعیت بن جاتا ہے۔"

یعنی زیادتی سے صرف یہی فرق پیدا نہیں ہوتا کہ مقدار میں اضافہ ہو گیا، بلکہ اس اضافے سے اس شے کی ماہیت ہی میں فرق آجاتا ہے۔

Marfat.com

مساکیّت

اس موقعے پر ہم سادیت[1] (Sadism) کی منفی صورت مساکیت[2] (Masochism) کی مثال بیان کرتے ہیں۔ مساکیت کا مطلب ہے تکلیف سے لذّت حاصل کرنا۔ ہر نارمل شخص میں اس جذبے کی ایک مقدار موجود ہوتی ہے جو اپنا مخصوص کردار انجام دیتی ہے۔ کیونکہ نشو ونما کے بعض اعمال میں بھی انسان کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے (جیسے دانت نکلنا)۔ اور کبھی کبھی ضرورت بھی انسان کو مجبور کردیتی ہے کہ وہ بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کرے، بلکہ اخلاق اور بلند احساسات، کچھ اُمور سے باز رہے بغیر وجود میں نہیں آسکتے' اور خود اس امتناع میں ابتداءً ایک درجہ اذیت موجود ہوتی ہے[3] اگر جسم اور نفس میں

---

[1] سادیت (Sadism)

ایک قسم کی جنسی کجروی (Perversion)، جس میں مبتلا شخص محبوب کو جسمانی تکلیف دے کر خود جنسی لطف محسوس کرتا ہے۔ دیکھیے:

James Drever : *A Dictionary of Psychological Terms*. Penguin, 1962.

(س۔ صدیقی)

[2] مَساکیت (Masochism)

اپنے آپ کو جسمانی اذیت دے کر جنسی لطف حاصل کرنا۔ اس کے مریض بسا اوقات اپنے آپ کو باندھ کر لٹکا دیتے ہیں۔ اور کسی وقت المناک انجام سے بھی دوچار ہوجاتے ہیں۔ دیکھیے:

R. Macdonald Ladell : *A Dictionary of Psychological Terms*

(س۔ صدیقی)

[3] فرائڈ کے خیال میں بلند مشاعر دباؤ (Repression) سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم اپنی رائے اس کتاب کے آئندہ باب "اسلام کا نقطۂ نظر" میں بیان کریں گے۔

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

Marfat.com

تکلیف برداشت کرنے اور تکلیف سے لذت پانے کا جذبہ موجود نہ ہو، تو اخلاق اور بلند مشاعر وجود میں نہیں آ سکتے۔

مگر مرض کی حالت میں یہ جذبہ اپنے کردار اور اپنے مقصد کے لحاظ سے مختلف ہو جاتا ہے اگرچہ ظاہری صورت میں نارمل حالت کے مشابہ کیوں نہ ہو؟ کیونکہ شذوذ کی حالت میں لذت صرف الم اور تکلیف ہی سے حاصل ہوتی ہے خواہ معاملہ جنس کا ہو یا کوئی اور شعور ہو۔ اور اس طرح حالت شذوذ (Abnormal States) زندگی کے طبعی عمل کو معطل کر دیتی اور زندگی کو مفید اور کار آمد راستے سے منحرف کر دیتی ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ مساکیت (Masochism) طبعی حالت کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے۔ یا خود طبعی حالت مساکیت کی سکڑی ہوئی صورت ہے، کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

فرائڈ کے تمام افکار اسی طرح شاذ حالتوں (Abnormal State) سے اخذ کردہ خطرناک نتائج ہیں، جن کا غلط ہونا یا کم از کم مبالغہ آمیز ہونا ہر وقت محتمل ہے، جب کہ وہ خود اس بات کا معترف ہے کہ اس نے غیر مستقیم حالتوں سے ہی تمام نتائج اخذ کیے ہیں۔

اس کا یہ کہنا ہی کس قدر غلط اور مبالغہ آمیز ہے کہ نوع انسانی کا ہر فرد عشق مادر کی الجھن (Oedipus Complex) کا شکار ہوتا ہے اور پھر کسی نہ کسی طرح اپنی اس الجھن پر قابو پا لیتا ہے ــــ فرائڈ نے یہ بات صرف اس لیے کہی ہے تاکہ جو غیر مستقیم حالتیں اس کے سامنے تھیں اور جو بچے فی الواقع اس الجھن سے دوچار اس کے زیر علاج آئے تھے، ان کی کوئی نہ کوئی عمومی تعبیر اختیار کر سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بہرحال یہ بات تو محل نزاع نہیں ہے کہ انسان جب تک عمل غریزی سے باز رہنے کا عادی نہ ہو جائے، اس امتناع میں احساس الم موجود رہتا ہے۔

Marfat.com

مگر یہ بات ایسی ہی ہوئی جیسے چھ انگلیوں والے بچوں کو دیکھ کر بجائے یہ کہنے کے کہ یہ استثنائی صورتیں ہیں، یہ کلیہ بنایا جائے کہ فی الحقیقت تمام بچوں کی چھ انگلیاں ہوتی ہیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح چھٹی انگلی سے نجات پا جاتے ہیں اور پیدائش کے وقت ان کے صرف پانچ انگلیاں رہ جاتی ہیں جس سے ہم جیسے "جہلاء" یہ خیال کرتے ہیں کہ تمام بچے پانچ انگلیاں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

فرائڈ کی تنگ نظری

فرائڈ کی ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ اُس نے ایک مخصوص نسل اور معین سماج سے اخذ کردہ آراء و افکار کو پوری انسانیت پر تھوپ دیا ہے۔ اور دینِ مسیحی اور اس سے پہلے کے مذاہب سے متعلق جملہ آراء کو مطلقاً ہر مذہب پر چسپاں کر دیا ہے جس میں مذہب اسلام بھی شامل ہے، حالانکہ اسلام کا نفس کے بارے میں نقطۂ نظر تمام مذاہب اور تمام نقطہ ہائے نظر سے مختلف ہے۔ بلاشبہ فرائڈ کی تنگ نظری اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اس کی اس کھلی فضا کو محسوس کرے جس میں نہ کوئی جکڑ بندی (Repression) ہے اور نہ عشق مادر کی الجھن (Oedipus Complex)، کیونکہ اسلام میں جنسی جذبے کے تحت سرے سے کوئی قاتل بیٹا اور مقتول باپ ہی نہیں ہے!

کہا جاسکتا ہے کہ فرائڈ کو ان نظریاتی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے جس قسم کے کیس آئے وہ ان کا معائنہ کرتا اور ان پر غور کر کے اپنی مخصوص رائے بطور ایک سائنسی تجربے کے پیش کر دیتا، قطع نظر اس بات سے کہ اس رائے کے مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی لحاظ سے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

مگر یہ بات اُسی وقت درست اور معقول قرار دی جاتی جب فرائڈ

Marfat.com

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم انسانیت پر عمومی احکام جاری نہ کر دیتا، اور اس بات پر اصرار نہ کرتا کہ انسانیت کی جو تصویر اس نے بنائی ہے وہی دُرست ہے، اور اسی طرح مذہب کی جو تعبیر اس نے اختیار کی ہے بلا استثناء سارے مذاہب اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔

بہرحال اگر ہم یہ چاہیں کہ فرائڈ کے اِن افکار پر اس کی ذاتی زندگی کے کوائف سے، اور جس زمانے میں وہ موجود تھا اس کے اثرات سے، اس کے لیے کچھ معذرتیں ڈھونڈ کر نکال لائیں تو ہم بیشک ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کہ ہم اس کے جملہ افکار کو صحیح مان لیں اور مذہب اور انسانیت کی جو تعبیریں اس نے کی ہیں، ان کی صحت پر یقین کر لیں — تو اس بات کے لیے نہ ہمارے پاس کوئی جواز موجود ہے اور نہ ہم اس کا کوئی عذر تلاش کر سکتے ہیں۔

بلکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کے تمام افکار و نظریات کا از سرِ نو جائزہ لے کر ان میں سے صواب و ناصواب علیحدہ علیحدہ کر دیں۔ ہو سکتا ہے اس چھان پھٹک میں بہت سی باتیں دُرست ہی نکلیں، مگر سب سے بڑی اور سب سے خطرناک غلطی تو یہی سامنے آئے گی کہ اُس نے انسان کو حیوان کے درجے کے مساوی کر دیا ہے اور ایسی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، جس کے ذریعے انسان دنیاوی ضرورتوں سے ذرا سا بھی بلند ہو سکے۔

اگر یہی ہوتا کہ جو کچھ انسانیت کے بارے میں اس کی آراء تھیں انھیں بیان کر کے آئندہ کے لیے اس بات کا دروازہ کھلا رہنے دیتا کہ نفسِ انسانی کے بلند، رفیع اور پاکیزہ پہلوؤں میں مزید اضافہ کیا جا سکے اور اپنی پیچیدہ اور کج تعبیرات سے انسانیت کا چہرہ مسخ کرنے پر اصرار نہ کرتا تو اس پر ہمارے اعتراضات بہت کم رہ جاتے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ انسانیت کے بیشتر احساسات اسی دنیائے رنگ و بو سے متعلق اور اسی کی ضرورتوں سے وابستہ ہیں، مگر کچھ احساسات ایسے بھی ہوتے ہیں جو جسمانی گرفت سے آزاد اور اس معیار سے بلند ہوتے ہیں۔ اور یہی انسانیت

Marfat.com

کا ایسا پہلو ہے جس کا پرچار ہونا چاہیے اور جس کی اہمیت واضح ہونی چاہیے۔
چونکہ یہی حقیقی انسانیت ہے، یہی وہ ارتقاء ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے، بلکہ خود نظریۂ ارتقاء کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انسان نے اپنے اسلاف کی بہ نسبت جو عظیم ترقی حاصل کی ہے اس کا ذکر کیا جائے، کیونکہ اس ارتقاء کی بدولت اس میں کچھ ایسی نفسیاتی اور روحانی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جن کا کائنات کے دیگر جانداروں میں وجود نہیں ہے اور جو انسان کے اس قدر بنیادی خصائص ہیں کہ نہ تو ان سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کی حیوانی طریقے پر تعبیر ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

مغربی معاشرے پر فرائڈ کے اثرات

فرائڈ کے افکار میں صواب و ناصواب کی شرح خواہ کچھ بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے افکار نے مغربی معاشرے پر بہت بڑے اور دُور رس اثرات ڈالے ہیں۔ کوئی دوسرا نظریہ ایسا نہیں ہے جس نے سماج کی روش پر اس قدر گہرے اثرات ڈالے ہوں، سوائے نظریۂ ڈارون اور نظریہ کارل مارکس کے جو فرائڈ سے پہلے پیش کیا گیا مگر عملی صورت میں اس کے بعد آیا۔

اس کے افکار و نظریات کو عوام میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی اور اہلِ علم نے بھی تائید و توثیق کی۔ بلکہ اپنے طور پر اس کی آرا میں کافی اضافہ بھی کیا اور سب ہی اس بات پر ایمان لے آئے کہ طبعی طریقہ یہی ہے کہ جبلّتیں ہر قید سے آزاد ہو جائیں اور ان کی پوری پوری طرح تسکین ہو جائے۔ اب چونکہ سماج، مذہب، اخلاق اور روایات سب ہی اس بے قیدی کی راہ میں رُکاوٹ تھے، اس لیے جمہور نے بالعموم اور نوجوانوں نے بالخصوص از خود یہ باور کر لیا کہ یہ رُکاوٹیں غیر طبعی اور غیر منطقی ہیں اور اُس فرسودہ ماضی کی یادگاریں ہیں جب انسان جہالت کے سمندر میں غرق تھا۔ ہم تو اب سائنس اور علم کی روشنی سے روشناس ہو چکے ہیں، ہم کیوں کر پابندِ روایات رہ سکتے ہیں۔

اس طرح مغرب میں ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جو تمام تر ان غلط اور مبالغہ آمیز افکار کی حامل تھی۔ اس نئی نسل کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ان کے نزدیک ایک راستہ تھا، سماج کا خیال، مذہب کا احترام اور معنوی اور اخلاقی اقدار کی پابندی — اس راستے پر چل کر دباؤ (Repression) بیماریوں اور اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ سماجی روایات کے بندھن توڑ ڈالے جائیں، مذہب کو پسِ پشت ڈال دیا جائے اور اخلاقی اور معنوی اقدار کو ملیا میٹ کر دیا جائے تاکہ فرد کو سعادت و خوشی حاصل ہو، اس کی لذاتِ جسمانی کی تکمیل ہو اور

Marfat.com

افراد کا شعورِ ذات پختہ ہو کہ انھیں استقلال عطا کرے اور آزادی سے ہم کنار کرے۔

اس نسل کے لوگوں نے دوسرا راستہ منتخب کیا جیسا کہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ کیوں کہ اس راستے پر چلنے میں انھیں اس بھیانک کش مکش نے بھی مدد دی جو سائنس اور کلیسا میں برپا ہوئی تھی، اور جو کلیسا کی تباہی پر منتج ہوئی تھی اور جو اپنے ساتھ تمام اچھی بُری معنوی قدریں بھی بہا کرلے گئی۔ اور اس راستے پر چلنے میں انھیں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) اور اس کے جلو میں آنے والے اجتماعی اُتھل پُتھل اور اخلاقی دیوالیے پن نے بھی سہارا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ راستہ آسان اور رنگین ہے اور اس راستے پر چلنے میں وہ لطف ولذّت ہے جو پہلے راستے پر چلنے میں نہیں ہے، بلکہ پہلا راستہ تو انسان کو انسانی فرائض اور ذمے داریوں سے گرانبار بنا دیتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم آئی تو امریکہ اور یورپ کے لاکھوں نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے سالہاسال زہریلی گیسوں اور تباہ کن بموں کی آغوش میں خندقوں میں گزارے۔ ایک طویل عرصہ موت کی چوکھٹ پر کھڑے کھڑے ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ اور جوں ہی جنگ ختم ہوئی یہ خندقوں میں گھرے ہوئے اور جیلوں میں پابہ زنجیر پڑے ہوئے، تھکے ماندے اور کچلے ہوئے (Repressed) لوگ بھوکے دیووں کی طرح اپنی جسمانی غذا پر ٹوٹ پڑے اور بھڑکتے ہوئے جسم کی آگ بجھانے لگے۔

جنگ عظیم میں بے شمار مرد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ جن عورتوں کے شوہر مرگئے یا ان کے مردوں نے جنگ کی تباہ کاریوں سے نکل کر ان کی کفالت پر اپنی آسودگی کو ترجیح دی، تو وہ عورتیں روزی کی تلاش میں نکلیں اور کارخانوں میں پہنچ گئیں۔ عورت ہر قسم کی بھوک کا شکار ہوگئی، معدے کی بھوک، لباس اور زیب و زینت کی بھوک اور جنس کی بھوک —— کیونکہ جنگ کے بعد عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہوگئی اور ہر عورت کے لیے شوہر کا میسّر آنا ناممکن ہو گیا۔

Marfat.com

فرائڈ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا یہ ایک سنہرا موقع تھا۔ خیر یہ تو نہیں تھا کہ اب بھی انھیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو انھیں حیوانی آزادی کی جانب بلائے کیونکہ خود تمام حالات و عوامل انھیں اسی راستے پر لے جا رہے تھے، البتہ یہ ہے کہ انھیں اپنے بھڑکتے ہوئے جسموں کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے فرائڈ کے افکار بطور دلیل میسر آ گئے اور وہ سماج کے سامنے اخلاقی مجرموں کی طرح پیش ہونے کے بجائے، سماج سے نظریں ملا کر برملا یہ کہنے لگے کہ ہم تو علم اور سائنس کے پیروکار ہیں اور سائنس کی اتباع ماضی کی دیومالائی کہانیوں کی پیروی کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

جنگ عظیم کے بعد آنے والی نسلیں فرائڈ پر اندھا یقین رکھتی رہی ہیں اور اسے تاریخ کا عظیم ہیرو (Hero) قرار دیتی ہیں۔ امریکی رسالہ (Look) اسے اُن بیس شخصیات میں سے ایک قرار دیتا ہے جو بیسویں صدی کے معمار ہیں اور تاریخی حوالے اسے دَورِ جدید کا ہیرو قرار دیتے ہیں۔

ایسی بہت سی اجتماعی اور فلسفیانہ بحثیں وجود میں آئیں جن کی اصل بنیاد فرائڈ کی پیش کردہ نفس انسانی کی تعبیریں تھیں۔ ان بحثوں کا منشا ہی یہی تھا کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ سماج، کائنات کی اشیاء اور انسانی طبیعت سے متصادم ہے اور معاشرے کی قیود و روایات جو اس کے تحفظ کی ضامن ہیں، وہ محض تحکمانہ ہیں اور ان کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور سعادت و خوشی کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ انسان خاندانی اور عائلی بندھنوں سے آزاد ہو جائے۔

فرائڈ کے انانیت پسندانہ انفرادی نقطۂ نظر کے نتیجے میں لوگوں کو معاشرے سے اس قدر نفرت ہو گئی تھی کہ معاشرے کا لفظ ظلم و ستم اور استبداد کے ہم معنی خیال کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح مذہب، اخلاق اور روایات کا جب بھی ذکر آتا، ناپسندیدگی، ناگواری اور مذاق ہی کے ساتھ آتا۔

بالآخر یورپ اور امریکہ کی تمام اقوام میں معاشرتی شیرازہ بکھر گیا۔ عائلی نظام

Marfat.com

درہم برہم ہوگیا اور نئی نسلیں پُرانے دَور کی اخلاق و روایات کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوگئیں۔

فرانس کی تحریک وجودیت (Existentialism) دراصل فرائڈ کے افکار ہی کی ایک تباہ کن جھلک ہے۔ اس تحریک کا کہنا یہ ہے کہ فرد کی اپنی ذات کے اثبات میں جو چیز بھی حائل ہو اسے بالکلیہ مٹ جانا چاہیے، خواہ وہ رکاوٹ ارضی ہو یا سماوی۔ فرد کو بھرپور آزادی ہے کہ وہ وہی کچھ کرے جس کو وہ خود صحیح سمجھے، اگرچہ اس کا یہ عمل سماج کی روش اور عقل ومنطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ یہ سماجی قیود فرد (Individual) پر ذاتِ اعلیٰ (Super Ego) نے اس لیے عائد کی ہیں تاکہ اس سے سماجی قوانین کی پابندی کرا سکے، حالانکہ قوتِ شہوانی (Libido) کو بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ اور جو اس کا من چاہے، وہ کرے۔ معاشرہ اس کی بلا سے جہنم میں جائے، اور جن انسانی قدروں کی نشوونما کے لیے انسانیت نے صدیاں کھپائی ہیں انھیں بھی یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ فرد کی ذاتِ مقدس کے خلاف آواز اٹھائیں، اس کے مزاج سے ٹکرائیں اور اس کی آزادی اور حریتِ کاملہ پر ضرب لگائیں۔ البتہ فرد آزاد ہے جو چاہے سو کرے اور زندگی کی جس قدر کو چاہے ملیا میٹ کر دے۔

غرض یورپ اور امریکہ کی آزادیٔ کامل کی تمام تحریکات مثلاً جنس کے بارے میں فرائڈ ہی کے افکار سے متاثر ہیں اور انہی مہلک اثرات کے نتیجے میں ننگی صحافت، عریاں فلمیں اور جنسی ادب وجود میں آئے ہیں۔

فرائڈ ہی کے افکار کے زیرِ اثر ایک قسم کی جبریت (Determinism) کا تصور ابھرا ہے۔ باقی یہ وہ مذہبی جبریت نہیں جس پر پس ماندہ مشرق کو طعنے دیے جاتے ہیں، اور جو یہ بتاتی ہے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد نہیں ہے کیونکہ خدا اس کے افعال و اعمال پر نگران ہے؛ بلکہ یہ نفسیاتی جبریت ہے جس کے ماننے والے کہتے ہیں کہ انسان بے دست و پا ہے اور اس کی جبلتیں اس پر مسلط ہیں،

Marfat.com

اور ان جبلتوں کے سامنے فرد کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

اس جبریت کے تصور نے سارے مغربی معاشرے کو روند ڈالا ہے۔ اخلاق ملیامیٹ ہو گئے، روایات پارہ پارہ ہو گئیں اور قوانین بے اثر ہو کر رہ گئے، کیونکہ جنسی مسئلے میں فرد کو آزادی دے دی گئی، جو چاہے سو کرے کیونکہ بے چارا مجبور ہے، ہم اسے روک تو نہیں سکتے ورنہ غریب اعصاب شکن دباؤ (Repression) کا شکار ہو جائے گا۔

اگر مغرب کی یہ شوریدہ سر نسل صرف یہ مطالبہ کرتی کہ جس سخت گیر معاشرے میں وہ سانس لے رہے ہیں اس کی ظالمانہ رسمیں تبدیل کی جائیں اور فرد کو سماج کے ناروا ظلم سے نجات دلا کر اس کے جائز حقوق اسے بخشے جائیں، اگر وہ یہ مطالبہ کرتے اور فرد کی تقدیس میں اس قدر مبالغہ نہ کرتے کہ اس مبالغہ کے سامنے سماج کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ زیادہ بہتر تھا، اور ان کا یہ انقلاب صحیح اور مناسب ہوتا۔

یا پھر یہ ثابت ہو جاتا کہ سماج، اخلاق، مذہب اور روایات فی الواقع انسانی طبیعت اور نفسِ انسانی کی حقیقتوں سے متصادم ہیں، تو بھی ان چیزوں کو ترک کر کے انھیں تاریخ کے نگار خانے میں سجا دیا جاتا۔

مگر حقیقت یہ ہے، جیسا کہ ہم 'اقدارِ عالیہ' کے باب میں بیان کریں گے کہ خود فرائڈ اس بات کو درست نہیں سمجھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مغرب کی نئی نسل کے شوقِ آزادی اور ذوقِ عیش کوشی نے خود ہی اسے مجبور کیا کہ وہ ان ساری خرافات کو تسلیم کر لے تاکہ ان حیوانی اعمال کے کرنے کے بعد وہ ضمیر کی سرزنش اور احساسِ جرم سے بچ سکے۔ اس کے علاوہ انھیں ایک اور فریب بھی دیا گیا، وہ یہ کہ ان سے کہا گیا کہ تم اس آزادانہ حیوانی روش کو اختیار کر کے تہذیب یافتہ کہلاؤ گے۔

ہمارے نقال بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب، روایات اور اخلاق کے سارے بندھن توڑ ڈالو تاکہ تم بھی کسی قدر تہذیب یافتہ ہو جاؤ۔

حقائقِ زندگی اور نفسِ انسانی کے بارے میں یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جس نے

Marfat.com

انسانیت کو حیوانیت کے درجے سے بھی گرا دیا، کیونکہ حیوانات کے لیے بھی کچھ فطری حدود و قیود ہیں، جن کے سامنے آکر ان کی جبلتیں بھی باز آجاتی ہیں، اور ان کے وجود کے تحفّظ اور انھیں تباہی سے بچانے کے لیے ان کے جنسی اعمال کے بھی وقت مقرر ہیں۔ مگر بے چارا اشرف المخلوقات اس قدر گندگیوں میں دھنس گیا ہے کہ خود جانور بھی اس سے پناہ مانگنے لگے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

تجربی نقطۂ نظر

گزشتہ باب میں ہم نے جس نقطۂ نظر کے تحت مطالعہ پیش کیا ہے اس کے بعد اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ نفسیات کے دیگر مغربی مکاتب فکر بھی بیان کیے جائیں، کیونکہ اس حیثیت سے سب کا درجہ مساوی ہے کہ سب ہی انسان کو ایک مادّی حیوان سمجھتے ہیں اور سب ہی جزئیات اور تفصیلات میں اختلاف کے باوجود نفس کے روحانی پہلوؤں اور اخلاقی عوامل کو نظر انداز کر دینے میں باہم متفق ہیں۔

مگر اس کے باوجود مزید دو نقطہ ہائے نظر کا اجمالی سا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ انسان کے بارے میں ان کا اساسی تصور مختلف ہے، بلکہ اس لیے کہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں انسان کی حیوانیت اور مادیت میں کچھ زیادہ ہی غلو کیا گیا ہے۔

یہ دونوں نقطۂ ہائے نظر ہیں:

تجربی نقطۂ نظر (Experimentalism)

اور اشتراکی نقطۂ نظر:

تجربی سائنس اور دائرۂ محسوسات

'تجربہ' دورِ جدید کی ایک ایسی امتیازی علامت ہے جس نے مغربی عقلیت پر اپنے گہرے اثرات مرتّب کیے ہیں اور دنیائے جدید میں غلو کی حد تک اس کا

Marfat.com

اظہار ہوا ہے جس پر "ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا" کی مثال صادق آتی ہے۔

ڈارون کے دور سے، یا زیادہ مناسب الفاظ میں فرانسس بیکن[1] کے دور سے سائنس فلسفے سے جدا ہوئی، اور سائنس نے نظریاتی بحث کی روش ترک کر کے تجربے کی راہ اپنائی۔ چنانچہ محسوسات کی دنیا میں نت نئے تجربات کر کے ٹھوس نتائج اخذ کیے گئے اور سائنس نے انیسویں[19] اور بیسویں[20] صدی میں حیرتناک ترقی کی، بالخصوص جیومیٹری، طبیعات اور کیمیا میں معجزانہ پیش قدمی حاصل ہوئی اور سائنس کی ترقی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے ایٹم کی طاقت کا راز معلوم کر کے اسے برائے تخریب یا برائے تعمیرِ انسان کی قدرت میں دے دیا۔

تجربی سائنس کے نتائج اس قدر اہمیت کے حامل ثابت ہوئے کہ لوگ متحیّر رہ گئے اور اہلِ مغرب تو بالخصوص تجربی سائنس پر پکا سچا ایمان لے آئے اور اس "نئے معبود" کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

چونکہ تجربی سائنس کا دائرہ محسوسات ہی بن سکتے تھے، اس لیے اہلِ مغرب نے صرف ان باتوں پر یقین برقرار رکھا جو محسوسات کے دائرے میں آتی تھیں، اور جو باتیں اس دائرے میں نہ آتی تھیں وہ یکلخت ان کے ایمان و یقین سے خارج ہو گئیں اور انھوں نے اس راستے کے سوا معرفت کا ہر راستہ بند کر دیا۔ بلاشبہ اس طرزِ عمل پر انھیں ان کی اس خالص مادہ پرستانہ طبیعت ہی نے ابھارا جو انھیں قدیم روما سے ورثے میں ملی تھی، اور جو انھیں ابھی تک اسی ڈگر پر کھینچ رہی تھی۔ اس لیے اہلِ مغرب تو وہی بات مانتے ہیں جس پر تجربے کی مہر لگی ہو، کیونکہ اس میں کسی قسم کے

---

[1] فرانسس بیکن (Francis Bacon, 1561—1626.) انگریز ادیب، سیاستدان، ملکہ الزبتھ کا اٹارنی جنرل اور جیمز اول کا لارڈ چانسلر جس نے جدید سائنس میں استقرائی اصول منضبط کیے، انجیل کا مروجہ ترجمہ اسی کا ہے۔ (س۔ م۔ ر لقی)

Marfat.com

شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مگر جو بات تجربے کے خراد پر نہ چڑھ سکے وہ محض بکواس ہے یا کم از کم اس قابل نہیں ہے کہ اسے خاطر میں لایا جائے۔ چونکہ ذاتِ باری بھی ـــــ نعوذ باللہ ـــــ کسی تجربہ گاہ میں نہیں لے جائی جا سکتی اور نہ تجربی سائنس کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، اس لیے اہلِ مغرب کو خدا کی بھی ضرورت نہیں رہی اور انھوں نے برملا کہہ دیا کہ "کوئی خدا نہیں ہے"

ترقی یافتہ مغرب کی متعدی بیماریاں پسماندہ اور غلام مشرق میں بھی پھیل گئی ہیں۔ یہاں بھی نقال ڈگل بجانے لگے اور مقلّد طوطے کی رٹ لگانے لگے کہ کامیابی کا راز مغرب کے اتباع میں ہے۔ یہ اخلاق، مذہب، روحانیت اور صفائی قلب کی باتیں چھوڑ کر مادی منطق اور افادی اخلاق اختیار کرو، تاکہ تمھیں بھی آزادی نصیب ہو اور تمھیں بھی روشنی کا چہرہ دیکھنا نصیب ہو۔

نفسِ انسانی تجربہ گاہ میں

بلاشبہ سائنس نے انسانیت کی بہترین خدمت کی ہے اور بہت ہی مختصر سے وقفے میں انسانیت کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جس مقام تک پہنچنے کے لیے صدیاں درکار تھیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی شخص ان ایجادات کا انکار نہیں کر سکتا جن کی بدولت وقت و محنت میں بھی کفایت ہوئی ہے اور انسان کی پیداواری قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔

مگر دنیائے مغرب نے تجربی سائنس کے مقررہ دائرے سے تجاوز کر کے ان اُمور کو بھی تجربے کی خراد پر چڑھا دیا جو سرے سے تجربے ہی کو قبول نہیں کرتے۔ سائنس کا طبعی میدان تو مادہ ہے اور صرف مادی اشیاء ہی تجربے کو قبول کرتی ہیں اور مادے کا اپنے مؤثر کے لیے ردِّعمل (Response) اس وقت تک یکساں رہتا ہے جب تک اس کے خارجی حالات تبدیل نہ ہو جائیں، کیونکہ مادہ فکر و احساس سے عاری ہے اور اس کے ردِّعمل میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مادہ ہمیشہ ان طبعی اور کیمیائی قوانین کے تابع رہتا ہے جو اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس لیے

Marfat.com

مادّے سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں ہم ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود مادّے سے متعلق متعدّد تجربات میں سائنس قطعی فیصلہ نہیں کر پائی۔ چنانچہ ــــ ایٹمی توانائی (Atomic Energy) کے انکشاف نے دنیائے سائنس میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا ہے، کیونکہ اس انکشاف سے ایسے سائنسی نظریات سامنے آئے ہیں، جنھوں نے ان نظریات کی تردید کر دی جن کو سائنس دان حرفِ آخر سمجھے ہوئے تھے۔

اس کے باوجود شوقِ تجربہ دنیائے مادّہ میں محدود نہیں رہا۔ بلکہ یہ شوق سائنسدانوں کو ہر راہ پر لیے چلا، حتیٰ کہ دَورِ جدید کی ابتدا میں انھیں یہ ترنگ اٹھی کہ وہ نفسِ انسانی کو بھی تجربہ گاہ میں لے آئے، اور نفسِ انسانی پر اپنے تجربات کی روشنی میں انھوں نے کچھ ایسے قوانین مرتب کر لیے، جو نفسیاتی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور جن کے مطابق سائنس دان انسان اور انسانیت کی تعبیر کرتے ہیں۔

لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور خوشی سے پکار اٹھے: ــــ دیکھو سائنس ایک ایک راز سے پردہ اٹھاتی جا رہی ہے۔ معنوی اُمور بھی تجربہ گاہ میں رکھے جا چکے ہیں اور وہ دن دُور نہیں ہے جب اِن معنویات کے بارے میں بھی ثابت شدہ معروضی حقیقتیں (Proved Objective Facts) سامنے آ جائیں گی اور کھو کھلی فلسفیانہ ردّ و قدح سے نجات مِل جائے گی۔

نفسِ انسانی کے بارے میں یہ طریقۂ فکر بڑا عجیب ہے۔ کیونکہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کائنات کے مادّی مظاہر کے بارے میں محققین کسی قطعی نتیجہ پر پہنچ جائیں، مگر دنیائے نفس تو بڑی وسیع اور غیر محدود ہے۔ انسانیت، ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک نفس کو موضوعِ گفتگو بنائے ہوئے ہے اور اپنے تمام لٹریچر، فن، فلسفہ، مذاہب اور اجتماعیات کے ذریعے حقیقتِ نفس کی تلاش و جستجو کرتی رہی ہے مگر موضوع ہمیشہ تشنہ رہا اور بحث آج تک نامکمل ــــ جو کچھ کہا گیا اس کے بعد بھی مزید تحقیق کے لیے دروازہ کھُلا رکھا گیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کسی علم اور فن میں جب

Marfat.com

بھی کوئی صحیح بات کہی گئی اس سے اس وسیع دنیا پر قدرے روشنی پڑ گئی، لوگوں نے اس صحیح بات کو سندِ قبول عطا کی اور اس کے ذریعے اس دنیائے نامعلوم کے کسی راز سے پردہ اُٹھ گیا۔ مگر پھر بھی ہمیشہ یہی کہا گیا کہ انسانیت ابھی تک نفس کے تمام اسرار سے پردہ نہیں اٹھا سکی ہے، بلکہ کچھ راز ایسے بھی ہیں جن تک انسانی علوم کی رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ راز اُس خالقِ کائنات کے راز ہیں جنھیں وہ اپنے بندوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ اور ان سربستہ رازوں میں سب سے عظیم اور سب سے دشوار مسئلہ روح کا ہے۔

جب لوگ اپنی سادگی کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ نفس کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو دنیائے نامعلوم سے متعلق ہیں اور غیب کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں، اس وقت لوگوں کی فکر درست تھی۔ مگر تجربی سائنس نے اس سادگی کو بھی ختم کر دیا اور لوگوں کو یہ سمجھا دیا کہ وہ ہر شے پر قادر ہیں، اور ماضی کی خرافات اور پُرانے لوگوں کی کہانیاں یا تو سائنس اور تجربے پر پوری اُترنی چاہییں یا پھر انھیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے اور اُن کی جگہ صحیح علم کو لے لینی چاہیے۔

حالانکہ نفس کے بارے میں کسی قطعی نتیجے تک پہنچنے کے لیے سب سے طویل راستہ وہ ہے جو تجربہ گاہ سے ہو کر گزرتا ہے، کیونکہ تحقیق کا یہ منہاج اور اس کے لیے میسّر آنے والے ذرائع انسانیت کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قطعاً قاصر ہیں۔

تجربی منہاج (Experimental Method) کا سب سے بڑا ذریعہ حواس ہیں، خواہ یہ حواس براہِ راست کام میں لائے جائیں یا اس کے لیے آلات کی مدد لی جائے اور آلات کے ذریعے ان گہرائیوں تک پہنچا جائے جہاں تک مجرد حواس نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ آلات بھی اپنی انتہائی جزرسی کے باوجود تجربی تحقیق کے لیے تمام میدان فتح نہیں کر سکتے، بلکہ یہ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ حواس کے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے ان حواس کی مدد کر دیں۔ اسی لیے

Marfat.com

خواہ آلات کتنے ہی باریک کیوں نہ ہوں، کسی سائنس دان کے لیے ماورائے احساسات کوئی تجربہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ نفسِ انسانی کو تجربہ گاہ میں لے جایا جا سکتا ہے یا نہیں اور وہ تجربی تحقیق کس حد تک قبول کر سکتا ہے —— نفسِ انسانی کے بارے میں تجربی تحقیق صرف اسی قدر ہو سکتی ہے جو جسم سے متعلق ہے اور جس کی پیمائش آلات کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

اس طرح حیوان کی نفسیات کی تعبیر تو ہو سکتی ہے، مگر انسان کی نفسیات کے بارے میں کوئی جامع نظریہ اخذ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ حیوان کا تمام یا بیشتر نفسیاتی وجود اس کے جسم میں پنہاں ہے اور اس کا کوئی عمل اس کی جسمانیت سے خارج نہیں ہے۔ برخلاف انسان کے کہ اس کا سب سے ادنیٰ عمل جسم سے متعلق ہے —— (واضح رہے کہ میں یہاں نوعیت (Quality) کے بارے میں بات کر رہا ہوں، کمیت (Quantity) کے بارے میں نہیں۔)

علمی امانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ گرامی قدر سائنس دان یہ اعتراف کرتے کہ ہم نفس کے صرف ان پہلوؤں کو تجربہ گاہ میں رکھ رہے ہیں جو جسم سے متعلق ہیں، دیگر پہلوؤں سے سرِدست کوئی تعرض نہیں ہے اور جب تک ہمیں دیگر ضروری وسائل فراہم نہ ہو جائیں، ہم نفسِ انسانی کے بارے میں کوئی مکمل نظریہ پیش کرنے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔

نفسِ انسانی کا سرچشمہ جسم ہے

خدا انھیں سمجھے! یہ اعتراف وہ کیسے کر لیتے۔ اس اعتراف کا مطلب تو یہ ہوتا کہ 'خداوندِ جدید' اس وسیع کائنات کے احاطے سے قاصر ہے۔ بقول ان کے اس اعتراف سے تو بہتر یہی ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ نفسِ انسانی کا سرچشمہ جسم ہے اور تمام انسانی مشاعر جسمانی حرکات کی نفسیاتی صورتیں ہیں، کیونکہ جسم ہی سے تمام مشاعر پیدا ہوتے ہیں اور وہی انسانی اعمال کا محرک ہے۔

فلسفی تو کہتے تھے کہ پہلے نفسیاتی میلان اور انفعال پیدا ہوتا ہے اور جسم پر

Marfat.com

اثر انداز ہوتا ہے، پھر جسم میں اس میلان کی تکمیل اور اس انفعال کی تسکین کے لیے جسمانی حرکت پیدا ہوتی ہے ـــــ مگر تجربی سائنس دان بالکل اس کے برعکس کہتے ہیں کہ پہلے کسی مقررہ خارجی حالت کا ادراک ہوتا ہے، جس سے لازمی طور پر جسمانی حرکت پیدا ہوتی ہے یا کچھ کیمیائی گرفت ہوتی ہے یا الکترونی (برقی) عمل ہوتا ہے جو نفس پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے کوئی محسوس شعور پیدا ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ـــــ یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے غمگین خبر سُنی، سُن کر رویا اور رونے سے جذبۂ غم پیدا ہو گیا! یعنی غم ایک جسمانی حرکت رونے سے پیدا ہوا، یہ نہیں کہ انسان غمگین ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ـــــ جیسا کہ خُدا کے سمجھ دار بندے یہی کہتے ہیں!

ان کا کہنا ہے کہ ایک شخص نے شیر دیکھا، دیکھ کر دوڑا اور دوڑنے سے اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا ـــــ ایسا نہیں کہ وہ پہلے خوف زدہ ہوا اور خوف سے بھاگنے لگا!

ہم خواہ مخواہ کوئی بات سائنس دانوں کے ذمّے نہیں لگا رہے ہیں، بلکہ ذرا ولیم جیمس کو دیکھیں کہ وہ کیا کہتا ہے:

> "میلانات کے بارے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی چیز کا عقلی ادراک، وجدانی حالت کو اُکسا دیتا ہے اور اسی کو میلان کہا جاتا ہے۔ مگر میرا نظریہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ مؤثر کے ادراک کے فوراً بعد جسمانی تغیرات پیدا ہوتے ہیں اور وہ احساس جس کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے اور جسے ہم میلان کہتے ہیں، وہ انہی جسمانی تغیرات کا نتیجہ ہے۔" [۱]

مطلب یہ ہُوا کہ نفس کا سرچشمہ جسم ہے!

---

[۱] La Théorie de L' Emotions P. 60

Marfat.com

اگر یہ لوگ یہ کہتے کہ انسانی وجود کے اندر جسم اور نفس میں ہمہ وقت اتصال قائم ہے، کبھی جسم نفس پر اثر انداز ہوتا ہے اور کبھی نفس جسم پر اثر انداز ہوتا ہے، یہ چکر چلتا رہتا ہے، مگر احساس کی نوعیت، اس کی جائے صدور اور مقصد کے اختلاف کی بناء پر ان کی تاثیر کی مقدار بدلتی رہتی ہے، چنانچہ کبھی جسم غالب آجاتا ہے اور کبھی نفس غالب آجاتا ہے اور کبھی ان میں سے کوئی ایک ہی مصدرِ شعور بن جاتا ہے —— اگر یہ لوگ یہ بات کہتے تو کسی حد تک درست ہوتی —— مثلاً بھوک ایک خالص جسمانی حرکت ہے جو نفسیاتی اور عقلی مشاعر کی جانب بھی لے جاتی ہے، اس کے برخلاف حصولِ علم کی خواہش ایک نفسیاتی یا نفسیاتی اور عقلی تحریک ہے جو جسمانی تاثیرات بھی پیدا کرتی ہے۔ اور ایسے بھی متعدد مشاعر ہیں، جن میں ایک مخصوص نسبت کے ساتھ جسم اور نفس دونوں شریک ہوتے ہیں، اور اس کے بعد بھی انسانیت کا ایک ایسا پہلو باقی رہ جاتا ہے جو بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور جو مطلق جسم کے دائرے میں نہیں آتا، اور وہ انسان کا روحانی پہلو ہے۔

انسان کا روحانی وجود محسوسات سے ماوراء ہے اور کسی تجربہ گاہ میں اس پر تجربہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے تجربی نقطۂ نظر سے وجودِ خدا کی طرح روح کا وجود بھی ایک فسانہ وفسوں قرار پاتا ہے۔

باوجودیکہ دُور خیالی (Telepa.hy) رُوح کے ایک کھلم کھلا معجزے اور ایک سائنسی حقیقت کی طرح ثابت ہو چکی ہے، مگر تجربی سائنس دان بدستور روح کے انکار پر مُصر ہیں اور بلاوجہ اِس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ روح کی کوئی ایسی مادّی تعبیر کی جائے جو ان کے واقعیت پسندانہ نظریے سے ہم آہنگ ہو۔

تجربی نفسیات اور مُبشّرات

بشارتی خوابوں کے بارے میں فرائڈ کی آرا، پہلے ہی نقل کی جا چکی ہیں اور بتایا جا چکا ہے کہ اس نے مخصوص غیر پاکیزہ نتائج کے حصول کے لیے کس قدر ہیرا پھیری سے کام لیا ہے۔ تجربی نقطۂ نظر کے حامل بشارتی خوابوں کے فرائڈ سے بھی زیادہ شدت

Marfat.com

سے منکر ہیں۔ فرائڈ توان کے دائرۂ انطباق (Application) کو محدود (Limited) بتاتا تھا، یہ سرے سے ان کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ایک استہزا کے ساتھ آگے گزر جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بشارتی خواب کسی تجربہ گاہ میں نہیں پرکھے جا سکتے، کیونکہ ان میں جو غیب نامعلوم کا عنصر ہے وہ احساسات سے ماوراء ہے۔ پھر وہ راز کیا ہے جس کے ذریعے انسان غیب میں جھانکنے پر قادر ہو جاتا ہے اور وہ امور دیکھ لیتا ہے جو ابھی تک وجود میں بھی نہیں آئے؟ کبھی بطورِ اشارہ اور کبھی قدرے تفصیل سے، اور کبھی پوری پوری تفاصیل کے ساتھ، جیسا بھی خواب دیکھنے والا روحانی قوت اور غیب میں جھانکنے کی قدرت رکھتا ہو ـــــ غرض اس راز سے خدا ہی واقف ہے اور اس نے یہ راز انسانوں پر منکشف نہیں کیا ہے۔

اب بجائے اس کے کہ تجربی نقطۂ نظر کے لوگ یہ کہیں کہ چونکہ ان کے وسائل اس حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہیں اس لیے وہ اس راز کو نہیں سمجھ سکتے ـــــ بجائے اس کے وہ عجیب جرأت کے ساتھ ان کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کا اثبات نہیں کر سکتے۔

صحیح بات یہ ہے کہ بشارتی خواب ثابت شدہ حقیقتیں ہیں مگر ان حقیقتوں کا ادراک انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ تنگ نظر مادہ پرستانہ عقلیت سے چھٹکارا پا کر اپنے قلب و بصیرت کو وسیع و عریض کائنات کے لیے کھول دے، اور کائنات میں پنہاں بے پناہ قوتوں پر یقین رکھتے ہوئے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے، تو اس وقت اس کے سامنے انسانی زندگی کے اس قدر عجیب مظاہر رونما ہوں گے کہ بغیر روح کا وجود تسلیم کیے ان کی کوئی تعبیر نہیں کی جا سکے گی۔

Marfat.com

انسانِ کامل اور اس کے متفرق اجزاء

تجربی نفسیات[1] (Experimental Psychology) کے نظریات بھی ایک اچھا خاصا مذاق ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے چوہے بلی کی گردن میں گھنٹی باندھ رہے ہوں۔ غلطی صرف یہی نہیں کہ تجربی نفسیات نفسِ انسانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، بلکہ خود یہ طریقۂ کار ہی غلط ہے اور ان پہلوؤں میں بھی غلط ہے جو تجربے کو قبول کر لیتے ہیں۔

معملی تجربوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے انتہائی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے جائیں، کیونکہ معروضی نتائج (Objective Results) حاصل کرنے کا یہی بہترین طریقہ ہے۔ مگر یہ ماہرین گرامی یہ بات کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ بکھرے ہوئے اجزاء "انسان" نہیں ہیں اور ان اجزاء کے اجتماع سے جو مجموعہ بنتا ہے وہ اُن اجزاء سے قطعاً مختلف ہے، جیسا کہ گیسٹالٹ (Gestalt) یہی کہتا ہے اور اس کی رائے کسی حد تک درست بھی ہے۔

اس بیان کی تائید میں ہم دو مثالیں دیتے ہیں:

پہلی مثال مشہور کیمیائی مرکبات کی ہے۔ مرکب اپنی خصوصیات میں ان عناصر سے قطعاً مختلف ہوتا ہے جن سے وہ مرکب ہوتا ہے، جیسے کھانے کا نمک کلورو اور سوڈیم ہیں، مگر نمک اپنی ظاہری شکل اور اپنے خواص میں ان دونوں اجزاء سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اسی طرح نفسِ انسانی بھی مرکب شکل میں اپنے متفرق اجزاء سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسری مثال گھڑی کی لیجیے۔ گھڑی چند پرزوں، کمانیوں اور پیچوں کا مجموعہ ہے،

---

[1] تجربی نفسیات (Experimental Psychology)
نفسیات کی وہ شاخ جس میں نفسیاتی مسائل کے حل کے لیے تجربی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس تمام باب میں اسی پر تنقید کی گئی ہے۔ (س۔ صدیقی)

Marfat.com

مگر اس کے تمام اجزاء پر کوئی شخص علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرے تو کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ اجزاء جب اپنی مقررہ صورت میں جمع ہوتے ہیں تو بالکل ایک نئی شے بن جاتے ہیں، اور یہ مجموعہ ایک وقت بتانے والا آلہ بن جاتا ہے، جو درحقیقت ان تمام اجزاء کا مقصود ہے۔

تجربی نفسیات کے ماہرین اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود جب تجربہ اور تحقیق میں مصروف ہوتے ہیں تو سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بکھرے ہوئے اجزاء ہی درحقیقت 'نفس انسانی' ہیں یا کم از کم وہ صحیح بنیاد ہیں جن پر نفس انسانی کی عمارت استوار ہے۔

اس مقام پر آکر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ تحلیلی نفسیات اور تجربی نفسیات سے کہیں زیادہ آداب و فنون (Arts) نفسِ انسانی کی صحیح تعبیر پیش کرتے ہیں، اور نفس کے جامد و بے روح ٹکڑوں کے بجائے اسے زندہ اور مکمل صورت میں بیان کرتے ہیں، جس میں سچائی بھی ہوتی ہے اور زندگی بھی۔

تجربی نفسیات کے فوائد

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تجربی نفسیات کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی میدان میں تجربی نفسیات سے بڑے دُور رس فوائد حاصل ہوئے ہیں اور تجربی تحقیقات کے نتیجے میں اب وقت اور محنت کی بہت زیادہ کفایت ہو گئی، جو پہلے بچوں کی تعلیم میں غلط ذرائع کے استعمال کی بناء پر ضائع ہوا کرتے تھے۔

تجربی نفسیات کے تعلیمی میدان میں حاصل ہونے والے نتائج بھی مطالعۂ نفسیات کے اس طریقے کے وجود کا مکمل جواز ہیں، مگر بات درحقیقت یہ ہے کہ مغربی مفکرین حدود آشنا نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ میدان تعلیم میں تطبیقی نفسیات (Applied) کی حدود سے تجاوز کر کے انھوں نے نفسِ انسانی کے بارے میں جامع احکام صادر کر دیے اور اس سلسلے میں اس قدر

Marfat.com

ہولناک اور بے شمار غلطیوں کے مرتکب ہوئے کہ انسان کی انسانیت ہی ختم ہوگئی اور انسان، حیوان کے مقام سے بھی گر گیا۔

تجربی نفسیات اور خالص مادیّت

تجربی نفسیات کا بھی انسان کے بارے میں نقطۂ نظر خالص مادّی نقطۂ نظر ہے۔ وہ انسان کو ایک جامد اور ٹھوس مادّے کی حیثیت میں ہمیشہ نظر رکھتی ہے۔ اس کے تمام تجربات کی بنیاد ہی یہ ہے کہ نفسِ انسانی بھی ایک مادّہ ہے جو یکساں حالتوں میں اور ایک مؤثر کی تاثیر پر مادے کی طرح یکساں ردِّعمل کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات جسمانی عمل سے متعلق درست بھی ہے، مگر خود جسم اگرچہ مادی ضرور ہے لیکن ایک جاندار مادّہ ہونے کی حیثیت میں جامد مادّے سے یقیناً مختلف ہے۔ پھر یہ کہ ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہے اور خود ایک ہی فرد کے نفس کی کیفیت حالات کی یکسانیت کے باوجود بھی مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اس اختلاف کی معمولی سی مثال یہ ہے (جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں) کہ جو بھی گھڑی گزرتی ہے انسان کے تجربے اور علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور یہ بات ممکن نہیں رہتی کہ ایک ہی انسان ایک ہی حالت سے دو مرتبہ گزرے۔

اس مادیت کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ تمام انسانی اعمال کا سرچشمہ جسم کو قرار دیتی ہے اور اس طرح غیر جسمانی مشاعر کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتی۔ گویا اس مادیت میں انسان کے اخلاقی اور رُوحانی پہلوؤں کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ یہ پہلو جسم سے پیدا نہیں ہوتے، اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ تجربی نفسیات کے ماہرین کسی وقت کچھ ایسے جسمانی تغیّرات دریافت کر لیں جن سے کوئی اخلاقی تصوّر یا ضمیر یا بلند انسانی قدریں پیدا ہوتی ہوں۔

اسی لیے تجربی نفسیات اس بات کی قائل ہے کہ سماج، اخلاق اور مذہب سب فضول بکواس ہیں، ان کا جسمِ انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہلِ مغرب اس خرافات پر سائنس کا نام سُن کر یقین کر بیٹھے، یا یہ کہیے کہ پہلے ہی یہ یقین رکھتے تھے

Marfat.com

کیوں کہ ڈارون اور فرائڈ کے اثرات اور شدید ترین مادیت کی لہریں انھیں اس یقین پر مجبور کر چکی تھیں۔ پھر تجربی نفسیات نے یہ کہہ کر کہ وہ نفس انسانی کے بارے میں اٹل حقائق پیش کر رہی ہے ان کے اس یقین میں مزید اضافہ کر دیا اور ان کی کج فطرت خواہشوں کی تکمیل کا سامان فراہم کر دیا۔

اسی طرح اہلِ مغرب نے یہ بھی سمجھ لیا کہ عائلی نظام انسان کا من گھڑت نظام ہے۔ جسمِ انسانی میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے جو انسان کو خاندانی نظام سے ربط و تعلق رکھنے پر آمادہ کرے۔ اس کے جسم میں صرف جنسی توانائی ہے، جو حیاتیاتی (Biological) مسئلہ تو ہے مگر اخلاقی اور اجتماعی مسئلہ بہر حال نہیں ہے۔ عورت ہو یا مرد وہ صرف اس حیاتیاتی اور جسمانی ضرورت کو کسی نہ کسی شکل میں پورا کرنے پر مجبور ہے، اور اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اسے اخلاق، سماج اور خاندان کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کسی تجربہ گاہ میں یہ انکشاف نہیں ہو سکا کہ یہ اخلاق وغیرہ انسان کے کس حصۂ جسم میں فروکش ہیں۔

تجربی نفسیات کے ماہرین بلند انسانی قدروں کو بھی فضول بکواس اور ایک مضحکہ خیز کہانی قرار دیتے ہیں۔ جو کچھ ہے وہ صرف مادی اور ارضی ہے۔ انسان میں بھی بعینہ وہی جبلتیں ہیں جو حیوان میں ہیں اور انسانیت کا ہر فرد اپنی لذتوں کا تابع اور اپنی خواہشوں کا مطیع ہے۔

تجربی نفسیات کے ماہرین فرائڈ کی بیان کردہ شعوری جبریت پر بھی یقین رکھتے ہیں کیوں کہ ان کی نظر میں حیاتِ نفسی کا سرچشمہ جسم ہے، جو ایک ایسا کیمیائی اور الکترونی عمل ہے جس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اور جب ارادہ نہ رہا تو انسان کی اپنے اعمال پر ذمے داری بھی ختم ہو گئی۔

جسم کا دباؤ مسلسل ہے۔ ہر جسمانی حرکت لازمی طور پر بعد والی حرکت پر منتج ہوتی ہے اور بالآخر اس سے کچھ شعور، کچھ میلانات اور مخصوص قسم کا طرزِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سارا جسمانی اور حیاتیاتی عمل انسان پر لاگو ہے اس میں انسان کے انتخاب

Marfat.com

اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ انسان کو پتہ ہی اس وقت چلتا ہے جب یہ سارا عمل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے جب انسان کا اختیار ہی کوئی باقی نہیں رہا تو اس کی کوئی اخلاقی ذمے داری بھی نہ رہی، اور جب اخلاقی جواب دہی کا تصور ہی ختم ہو گیا تو 'انسان' اور انسانیت کا مفہوم بھی ملیا میٹ ہو گیا۔

Marfat.com

"اشتراکی نقطۂ نظر"

اشتراکیت (Communism) نفسیات کو قطعاً بے فائدہ قرار دیتی ہے - اس لیے نہیں کہ نفسیات نفسِ انسانی کے وسیع پہلوؤں کے احاطے سے قاصر ہے ، بلکہ اس وجہ سے کہ نفسیات انسان میں پیدائشی اور فطری میلانات کی قائل ہے - اور اگر ایک مرتبہ فطری میلانات کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے ، تو پھر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ملکیت کی خواہش بھی ایک فطری جذبہ ہے ، اور اس بات کے آتے ہی ساری نفسیات ہی سرمایہ دارانہ خرافات اور بورژوائی بکواس ہو کر رہ جاتی ہے -

مگر نفسیات سے انکار کے باوجود اشتراکی فرائڈ کے قائل ہیں اور اسے خوب سراہتے ہیں ، کیونکہ وہ تمام مقدسات کو گندگیوں میں لتھیڑتا ہے ، اور یہ بتاتا ہے کہ یہ دراصل وہ معاشرتی قیود اور سماجی بندشیں ہیں جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں نے اپنے تحفظ کے لیے تراش کر فرد پر عاید کر دی ہیں ، لہٰذا فی الحقیقت یہ کوئی قابلِ اعتبار اشیاء نہیں ہیں - اگر ساری مقدسات ملیامیٹ ہو جاتی ہیں اور [illegible] فرد کے دل میں ان کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے اور فرد کے واسطے سے ان کی اہمیت سماج سے بھی اٹھ جائے ، تو اس کا مطلب [illegible] ہے [illegible] میدان فتح کر لیا - یہی وجہ ہے کہ اشتراکی حضرات فرائڈ [illegible] ہیں[1]

---

[1] یہ عجیب اتفاق ہے کہ فرائڈ اور کارل مارکس دونوں یہودی ہیں ، اور مالی صعوبت [illegible] باقی حاشیہ اگلے صفحہ [illegible]

Marfat.com

اشتراکیت اور ڈارون

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ فرائڈ ڈارون سے متاثر ہے اور اس نے حیاتیات کے بارے میں ڈارون کی جملہ آراء نفسیات میں منتقل کر دی ہیں۔ اشتراکیت خود بھی ڈارون سے متعدد پہلوؤں میں اثر پذیر ہوئی ہے بلکہ ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیوں نے حیوانیات کے بارے میں ڈارون کی آراء کو معاشیات اور اجتماعیات میں سمو دیا ہے۔

اشتراکیت تین بنیادوں پر ڈارون کے افکار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے:

۱۔ طبیعت (Nature) کو خدا کا مقام دے دینا اور خدا کے وجود کو نہ ماننا۔

۲۔ تمام جاندار اشیاء کو ان جبری مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو خارجی مادی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے ان دونوں کے نظریات کو اپنے مخصوص مصالح کے لیے استعمال کیا ہے۔ علمائے یہود کا لائحہ عمل (The Protocols of Learned Elders of Zion) جو عالمی یہودیت کی سیاست کا تعین کرتا ہے ——— لکھتا ہے:

"ہمیں اخلاقی دیوالیہ پن کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ دنیا پر ہماری حاکمیت مسلط ہو سکے، فرائڈ ہمارا ہے اور وہ جنسی تعلقات کو کھلم کھلا اچھالتا رہے گا تاکہ کوئی مقدس شے باقی نہ رہے اور لوگوں کا کام صرف اپنی جنسی بھوک مٹانا رہ جائے۔ بس اسی وقت اخلاق کا دیوالیہ نکل جائے گا۔"

اسی پروٹوکل میں کارل مارکس کے بارے میں ہے:

"ڈارون، مارکس اور نطشے کی کامیابی کا پروگرام ہم نے مرتب کر لیا ہے۔ ہم ان کے افکار کی خوب خوب اشاعت کریں گے اور ان کے علوم سے غیر یہودی فکر میں جو زوال پیدا ہوگا وہ بالکل واضح ہے۔"

Marfat.com

ماحول کے دباؤ اور جاندار کے اپنے آپ کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش سے ابھرتے ہیں۔ پھر ارتقائی مراحل ہیں وہ اعضاء اور اعمال جو ماحول سے ہم آہنگ نہ ہوں ختم ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ زیادہ پیچیدہ اعمال اور نئے اعضاء لیتے رہتے ہیں، مگر اس ارتقاء میں جاندار کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ یہ اس پر باہر سے مسلط ہے۔ اور یہ جاندار اس عمل کو مقدم یا مؤخر کرنے یا اس کے طریقۂ کار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے قاصر ہے، کیونکہ یہ سارا عمل طبیعت خود انجام دیتی ہے۔

اشتراکی حضرات نے حیاتیات کا یہ ارتقائی نظریہ مکمل طور پر اقتصادی اور اجتماعی ارتقاء پر چسپاں کر دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ تمام نتائج جو انھوں نے حاصل کیے ہیں بالکل درست ہیں۔ کیونکہ ان کی تعمیر ایک صحیح بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔

۳۔ انسان کو مادی اور حیوانی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور روحانی پہلوؤں اور بلند قدروں کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے صرف جسمانی اور مادی محسوسات ہی کو تسلیم کرنا۔ یہ بعینہٖ وہی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے جس کا یورپ قائل ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اشتراکیت کوئی نئی شے نہیں ہے بلکہ مغربی مادی تہذیب ہی کا ایک پرتو ہے۔ اگرچہ اس کے علمبردار شرق و غرب میں اس کی جدت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism)

کائنات پیہم اور مسلسل حرکت میں ہے۔ اس غیر منقطع حرکت کی تعبیر (Interpretation) جدلی منطق (Dialectic) تو کر سکتی ہے، مگر قدیم منطق (Formal Logic) اس سے قاصر ہے، کیونکہ وہ تناقض اور اجتماعِ اضداد کی نفی کرتی ہے، جب کہ جدلی منطق ان تمام اضداد اور تناقضات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے جو معاشرے کی شکل و صورت میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر نظام میں کچھ تضادات ایسے ہوتے ہیں جو اس کے زوال اور نئے نظام کی نشو و نما کا سبب بنتے ہیں اور نئے نظام میں بھی کچھ تضادات موجود ہوتے ہیں جو بالآخر

Marfat.com

ایک تیسرے نظام کی جانب لے جاتے ہیں۔

چنانچہ زراعت کی دریافت سے غلامی وجود میں آئی اور غلامی زرعی معاشرے کا ایک ناگزیر خاصہ بن گئی اور اس وقت تک بنی رہی جب تک معاشرتی ڈھانچہ غلامی کے نظام کو قبول کرتا رہا۔ مگر جوں جوں معاشرے کی ضروریات میں ارتقاء ہوتا گیا، غلامی ارتقاء میں رکاوٹ بنتی گئی اور زرعی معاشرہ جاگیرداری معاشرے میں تبدیل ہوگیا۔ ایک عرصے تک جاگیرداری نظام چلتا رہا مگر پھر رفتہ رفتہ سرمایہ سمٹ کر صنعتوں میں جانے لگا اور خود جاگیرداری، سرمایہ دارانہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی، کیونکہ جاگیرداری نظام کی بناء پر کسان زمین سے وابستہ تھا اور اسے یہ آزادی حاصل نہیں تھی کہ وہ شہر جا کر کسی کارخانے میں کام کر سکے، جس کے نتیجے میں معاشرہ جاگیرداری نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے لگا اور سرمایہ دارانہ نظام کی جانب بڑھنے لگا۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

معاشرے کا فلسفیانہ تغیر اور کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) یہ دو وہ اہم بنیادیں ہیں جن پر اشتراکیت کی عمارت قائم ہے۔

اشتراکیت خواہ جدلیاتی ہو یا نہ ہو، مگر مادی ضرور ہوتی ہے جو روح پر یقین نہیں رکھتی اور محسوسات کے ماوراء ہر شے کو خرافات قرار دیتی ہے۔ اور یہی وہ مقامِ اتصال ہے جس پہ آکر اشتراکی مشرق اور سرمایہ دار مغرب کا نفسیاتی نقطۂ نظر (Psychological Viewpoint) ایک ہی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ مظاہر کے معمولی سے فرق سے قطع نظر دونوں کی اصل تہذیبی بنیاد ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے مادیت۔

مگر اشتراکیت اپنے طور پہ اس مادیت میں ایک دلچسپ اضافہ کرتی ہے، اور کہتی ہے کہ اخلاقیت و روحانیت سرمایہ داروں کی تراشی ہوئی خرافات ہے جو انھوں نے عوام کو خوف زدہ اور غافل رکھنے کے لیے گھڑی ہیں، اور اس لیے گھڑی ہیں تاکہ عوام طبقاتی جنگ نہ برپا کر سکیں —— اور اشتراکیت اسی

Marfat.com

فریب کا پردہ چاک کرکے عوام کو حریت و آزادی سے ہمکنار کرنے کا پروگرام لے کر آئی ہے اور وہ اس قدر سائنٹیفک طریقہ علاج بتاتی ہے جس میں شک وشبہ کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی ـــــ اور وہ ہے اشتراکیت کی پیش کردہ "تاریخ کی مادّی تعبیر" (Materialistic Interpretation of History)

مادیت کہتی ہے کہ "کائنات میں صرف انسان ہی ایک فعال قوت ہے" ـــــ یہ بات اگرچہ بظاہر بڑی خوش نما معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید مادہ پرست اس بلند تر انسانیت پر یقین رکھتے ہیں جو عقل، روح اور جسم کا مجموعہ ہے ـــــ مگر فی الحقیقت اس سے ان کا مقصد زمین پر انسان کی خدائی کا پرچار کرنا اور یہ بتانا ہے کہ انسان روئے زمین پر خود ہی غالب ہے، اور کسی ایسے خداوند کا کوئی وجود نہیں ہے جو انسانوں کا خالق، ان کے مسائل کی تدبیر اور ان کے لیے مقصد زندگی کی تعیین کرتا ہو ـــــ یہ سب باتیں ان کے بنائے ہوئے زندگی کے نقشے میں شامل ہی نہیں ہیں اور نہ کبھی ان کے شعور و افکار میں ان حقائق کا گزر ہوتا ہے۔

وہ انسان کے غلبہ و قدرت کا پرچار اس لیے تو نہیں کرتے کہ کچھ انسان کی شان بلند ہو جائے، بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ مخلوق کے معاملات میں خدا کا کوئی عمل دخل باقی نہ رہے۔ ان کا سارا اعتقاد صرف انسان کی مادیت پر ہے۔

"کائنات کی حقیقی وحدت اور ہم آہنگی اس کی مادیت ہی کے طفیل ہے ـــــ اگر کوئی سوال کرے کہ پھر فکر اور شعور کیا چیزیں ہیں اور جسم کے کس حصے میں پیدا ہوتے ہیں ـــــ تو ہم یہی کہیں گے کہ یہ دونوں انسانی دماغ کی پیداوار ہیں اور خود انسان طبیعت کی تخلیق ہے"۔[1]

---

[1] کارل مارکس : اینٹی ڈوہرنگ (Anti Dihring) عربی ترجمہ راشد براوی۔ مطبوعہ ۱۹۳۴ء۔ صفحہ ۴۴۔

Marfat.com

"افکار انسانی دماغ کی تخلیق ہیں اور خود انسانی دماغ مادی ہے[۱] اگرچہ اس کی ترکیب اور ساخت پیچیدہ ہے۔ یہ دماغ انسانی جسم کا ایک ایسا حصہ ہے جس پر خارجی دنیا کے مؤثرات کا عکس پڑتا ہے[۲]"

گویا اشتراکی مادہ پرست انسان کے صرف مادی پہلو ہی کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں عقل انسانی بھی مادی ہے جو خارجی دنیا سے متاثر ہوتی ہے اور ان اثرات کو منعکس کرتی ہے مگر کوئی فعال اور صاحب ارادہ قوت نہیں ہے۔ چنانچہ کارل مارکس کہتا ہے:

"لوگ جس قسم کی اجتماعی پیداوار وجود میں لاتے ہوتے ہیں، اس کی بنیاد پر ان میں کچھ ایسے محدود مراسم تشکیل پاجاتے ہیں، جو ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور یہ پیداواری مراسم لوگوں کے مخصوص مادی مرحلۂ ارتقاء سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انہی مراسم کے نتیجے میں معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر قانونی اور سیاسی نظام قائم ہوتے ہیں، اور اجتماعی شعور کی چند محدود شکلیں اس سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے مادی زندگی میں طریقۂ پیداوار ہی زندگی کے اجتماعی، سیاسی، اور معنوی اعمال کا رُخ متعین کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگوں کے شعور سے ان کے

---

[۱] اگر عقل مادی ہے تو فکر بہرحال مادی نہیں ہے کیونکہ فکر زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔

[۲] استاذ عبدالفتاح ابراہیم، مطالعۂ اجتماعیات

Marfat.com

وجود کا تعین ہوتا ہو، بلکہ یہ خود اُن کا وجود ہے جس سے مشاعر کا تعین ہوا کرتا ہے۔"

فریڈرک اینگلز کہتا ہے:

"فلسفۂ مادیت کی بنیاد یہ اصول ہے ـــــ کہ پیداوار اور پیداواری تبادلے ہی وہ اساس ہیں جن پر کوئی اجتماعی نظام قائم ہوا کرتا ہے، اس نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں تمام تبدیلیوں اور تغیرات کے آخری اسباب کا کھوج ان تبدیلیوں اور تغیرات میں لگانا چاہیے جو پیداواری طریقوں اور پیداواری تبادلوں میں ہوتے ہیں اور ہمیں ان تبدیلیوں کا سراغ لوگوں کی عقل، تلاشِ حق اور جستجوئے عدل میں نہیں مل سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں ان تغیرات کے اسباب فلسفے میں نہیں مل سکتے بلکہ اس دور کی اقتصادیات ہی میں مل سکتے ہیں[1]"

مندرجہ بالا اقتباسات سے مذہبِ مادیت کے بنیادی حقائق پر روشنی پڑتی ہے کہ مادیت میں حق و انصاف کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس قابل ہیں کہ انسان ان کی تلاش و جستجو میں اپنا وقت برباد کرے۔ اسی طرح نبوتیں، عقاید اور مذہبی جذبات و میلانات بھی بے معنی ہیں۔ بس حقیقت تو صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے معیشت۔

نفسیاتی اور روحانی محرکات اشتراکیت کی نظر میں

غرض اشتراکی مادہ پرست تمام نفسیاتی اور روحانی محرکات سے منکر ہیں۔ یہ انکار صرف نظریاتی مباحث میں محدود نہیں ہے بلکہ وہ سرے سے ان محرکات کے وجود

---

[1] ڈاکٹر راشد براوی، اشتراکی نظام۔

ہی کو تسلیم نہیں کرتے، اور یہ بھی نہیں مانتے کہ ان نفسیاتی یا روحانی میلانات کا اظہار براہ راست انسانی وجود سے متعلق ہے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام محرکات اقتصادی حالتوں کے نتائج ہیں اور اقتصادی حالتیں ہی ایسی قائم بالذات اور واحد قوت ہیں جو انسان کی دسترس سے باہر رہتے ہوتے خارج سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ اخلاق کی کوئی معروضی اور ذاتی قیمت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ:

اخلاق معاشرے کے معاشی ردعمل کا نتیجہ ہے اور جوں ہی پیداواری تعلقات بدلتے ہیں ان کے ساتھ اخلاقی قدریں بھی بدل جاتی ہیں اور ایسا کوئی پیمانہ موجود نہیں ہے جس کے ذریعے اخلاقی امور کی پیمائش کی جا سکے۔

مذہب نہ تو کوئی آسمانی چیز ہے، اور نہ انسان کی ایسی نفسیاتی ضرورت جو اوّلین معاشرے کے کسی فرد کے دل میں اس وقت ابھری ہو، جب (بقول ان کے) وسائلِ رزق مشترک تھے اور اس ابتدائی معاشرے میں کوئی آقا تھا اور نہ کوئی غلام — بلکہ مذہب تو درحقیقت ایک ایسی 'افیون' ہے جو جاگیردار اور سرمایہ دار عوام کو طبقاتی کشمکش سے باز رکھنے کے لیے دیتے رہتے ہیں۔

اقدارِ عالیہ ان بھوکے اور محروم عوام کے اوہام ہیں جو اقتصادی حالات کی چکی میں پس کر اپنی ضرورتوں کی تکمیل نہ کر سکے، اور اس کے بجائے اقدارِ عالیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اس لیے یہ اقدار سماج کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ کیونکہ یہ اوہام بدترین معاشی حالات میں جنم لیتے ہیں اور انسانیت ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک جس وہم کا بھی شکار رہی ہے وہ معاشی حالات ہی کا نتیجہ رہا ہے۔

خاندان بھی ایسی کوئی نفسیاتی ضرورت نہیں جو مرد اور عورت کے نفوس میں جاگزیں ہو۔ بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ عورت کو اپنی معیشت کے لیے مرد پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، کیونکہ تمام وسائلِ

Marfat.com

پیداوار پر مرد قابض ہے اور اسی بالادستی کی بناء پر مرد عورت پر ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ صرف اسی کی ہو کر رہے۔

کائنات کی ہر شے ایک ہی معروضی حقیقت یعنی اقتصادی عامل کا پَرتو ہے، جس میں انسانی ارادے کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ بقول کارل مارکس معیشت نہ صرف یہ کہ انسانی ارادے سے خارج ہے بلکہ اس کے کچھ معروضی اور مخصوص قوانین بھی ہیں جن میں انسان کو دخل اندازی کی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے، کیونکہ معیشت یقیناً اپنے حتمی انجام تک پہنچ کر رہتی ہے اور اپنے ارتقائی دَور میں انسان کو بھی متاثر کرتی رہتی ہے جبکہ انسان اس کے قیام اس کی ابتداء اور اس کی انتہاء کے کسی بھی مرحلے میں اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا، کیونکہ یہ سب کچھ اس قانونِ ارتقاء کے تحت وجود میں آتا ہے جس کا خالق انسان نہیں، بلکہ مادرِ انسان، یعنی طبیعت اس کی خلّاق ہے۔

'فرائڈ کے افکار و نظریات' کے زیرِ عنوان باب میں ہم ان غیر سائنسی —— (Unscientific) اور جذباتی اسباب پر روشنی ڈال چکے ہیں جنھوں نے اہل مغرب کو خدا کا انکار کر کے طبیعت کو خدا مان لینے پر آمادہ کر دیا تھا، حالانکہ یہ ایک کھلا ہوا مغالطہ تھا۔ مگر ہم یہاں اس مغالطے کو نظر انداز کر کے اشتراکی مادیت میں پنہاں مغالطوں کا پتہ لگاتے ہیں۔

اقتصادی جبریت

سب سے بڑا فریب تو یہی ہے کہ اشتراکی مادیت ایک ایسی مکمل اقتصادی جبریت پر یقین رکھتی ہے جس میں انسان کے ارادے و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے، اور نہ ہی انسان اس کے ناگزیر اثرات سے بچ سکتا ہے۔ چنانچہ کارل مارکس کہتا ہے:

" ذرائع پیداوار ہی معاشرے کا رُخ متعین کرتے ہیں۔"

" ایسا نہیں ہے کہ لوگوں کے شعور سے ان کے وجود کا تعین

Marfat.com

ہوتا ہو، بلکہ یہ خود ان کا وجود ہے جس سے مشاعر کا تعین ہوا کرتا ہے۔"

گویا انسانی مشاعر (احساسات)، اقتصادی عوامل کے ردِ عمل کے طور پر ان کے بعد میں ظاہر ہوتے ہیں، اور یہ مشاعر نہ تو اقتصادی عوامل سے پہلے وجود میں آسکتے ہیں اور نہ ان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

ہمیں اس امر سے کوئی انکار نہیں ہے کہ معاشی عامل بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اسے انسانی مشاعر کی ساخت میں بالادستی حاصل ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ معاشی عامل زندگی کا ایک بنیادی محرک ہے۔ مگر ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ اس کے اثرات جبری ہیں اور یہی عامل تن تنہا ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی عامل کا وجود نہیں ہے۔

ذرا اس دعوے پر غور فرمائیے کہ — "ذرائع پیداوار ہی معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں"

حالانکہ جو ذرائع پیداوار سرمایہ دار امریکہ میں ہیں وہی ذرائع پیداوار اشتراکی روس میں ہیں، مگر روس ان ذرائع کے استعمال سے سرمایہ دار نہیں کہلاتا۔ بلکہ روس نے اشتراکی انقلاب کے بعد ان وسائل کو زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذرائع پیداوار کوئی جبری قوت نہیں ہیں جس سے انسانی حرکت و عمل بے اثر ہو جائیں اور انسان اس کی بھرپور طاقت کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ اگر یہ اقتصادی جبریت موجود ہے — تو پھر روس نے تو طریقۂ تقسیم اور مقاصدِ عمل کے سارے طریقے خود ہی متعین کیے ہیں، وہ تو کسی ذریعۂ پیداوار کی وجہ سے جبری طور پر کسی مخصوص راستے کو اپنانے پر مجبور نہیں ہوا ہے۔

ادھر برطانیہ نے انہی حالات میں اپنے لیے ایک جداگانہ روش متعین کی ہے، گویا روس اور برطانیہ کے تصرفات اس عقیدے اور شعور سے ابھرے ہیں جو ان کے اقتصادی ڈھانچے میں پہلے سے موجود اور ان پر اثر انداز ہیں۔ اگر

Marfat.com

یہ کہا جائے کہ روس اور برطانیہ کا یہ شعور خود سابقہ اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے تو اس سے بھی ان حالات کے بالمقابل انسان کے ارادے اور اختیار کی نفی نہیں ہوتی۔ جبکہ کارل مارکس کا تو خیال یہ تھا کہ معاشی جبریت کے نتیجے میں سب سے پہلے اشتراکیت برطانیہ میں برپا ہوگی اور وہاں سے باقی یوروپ میں پھیل جائے گی۔ مگر پسماندہ روس میں تو اشتراکیت برپا ہوگئی اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ برطانیہ میں آج تک اشتراکی نظام نہ آسکا، حالانکہ برطانیہ سرمایہ دارانہ ترقی کی جس معراج پر پہنچا ہوا تھا اس کے لحاظ سے معاشی جبریت یہی تھی کہ وہ سب سے پہلے اشتراکیت کو قبول کرلے۔

اسلام بہرحال ان سب نظاموں سے مختلف ہے، اگرچہ کہیں کہیں تفصیلات میں کوئی مشابہت پائی جاسکتی ہے۔ پھر بھی اگر ہم اسلام پر پکا سچا ایمان لے آئیں اور اس کے اصولوں کو اسی طرح سمجھ لیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے ان کو سمجھا تھا، پھر ہم جدید ذرائع پیداوار کو اختیار کریں تو اس سے نہ تو ہمارے اسلام پر کوئی زد پڑے گی اور نہ ہی ہم امریکہ کی طرح سرمایہ دار، برطانیہ کی طرح سوشلسٹ اور روس کی طرح اشتراکی بن جائیں گے۔

بہرکیف ہم مخصوص ذرائع پیداوار کو اختیار کر کے ایک حتمی نتیجے کے طور پر اسلام سے نہیں ہٹ سکتے، کیونکہ پیداواری تعلقات انسان کے ارادے اور اختیار سے باہر نہیں ہیں، جیسا کہ کارل مارکس کہتا ہے۔ بلکہ مشاہدہ اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس کی فکر غلط ہے۔

مادہ پرست، اقتصادی جبریت کا پرچار صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ ذہن نشین کرادیں کہ اشتراکیت ان کا مقدر بن چکی ہے اور جلد یا بدیر انھیں اشتراکیت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ اس لیے انھیں اشتراکیت کی مزاحمت کے بجائے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا چاہیے۔

یہ پرچار دنیائے مغرب اور اس کے زیرِ تسلط ممالک میں تو کارگر ہوسکتا

Marfat.com

ہے۔ (اس لیے نہیں کہ اشتراکیت ایک اقتصادی جبریت ہے بلکہ اس لیے کہ مغرب کی بنیاد بھی مادیت ہے، تو اس کا انجام بھی اشتراکیت ہی ہونا چاہیے)۔ مگر جہاں زندگی اور کائنات کے بارے میں مادیت سے بلند اور ترقی یافتہ کوئی فکر موجود ہو، تو کوئی بھی ذریعہ پیداوار اس فکرِ بلند کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، بلکہ حکومت کا سارا اقتصادی، اجتماعی اور فکری نظام اسی فکر کے تابع ہو جائے گا۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ باوجودیکہ روس، برطانیہ اور امریکہ مادی فکر کی بنیاد پر باہم متحد ہیں مگر پھر بھی اپنے اپنے نظام میں آزاد ہیں۔ تو اگر ایسی فکر سامنے آجائے جو بنیادی طور پر مختلف ہو تو ارادے اور اختیار کی دنیا اور بھی وسیع ہو جائے گی۔

مادیت کے پیش کردہ مندرجہ بالا افکار قطعاً سائنٹفک اہمیت کے حامل نہیں ہیں[1] بلکہ صرف مادیت کے پرچار کی ایک مجنونانہ کوشش ہے۔

سرمایہ داری کا مزاج

مادہ پرست اشتراکی کہتے ہیں کہ استحصال سرمایہ داری کے مزاج میں شامل ہے[1] چنانچہ زیادہ منافع کے حصول کے لیے سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اس طرزِ عمل میں سرمایہ داروں کے ارادے اور ان کی بری نیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا[1] بلکہ استحصال سرمائے کی طبیعت اور اس کے مزاج میں شامل ہے[1]

اس عجیب و غریب دعوے کی کوئی سائنٹفک دلیل موجود نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام لالچ کا شکار رہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ حرص و لالچ خواہ سرمائے کے ساتھ ہمیشہ قائم و دائم رہے مگر بہر حال یہ سرمائے کی صفت نہیں ہے بلکہ اس صفت کا سرچشمہ نفس ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اس

---

[1] ڈاکٹر راشد براوی ۔ اشتراکی نظام

Marfat.com

مقام پر نفسیاتی جبریت کے قائل ہو گئے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں! بلکہ ہم ان اُمور کو جن کا طبعی سرچشمہ نفس ہے، دوبارہ اُسی اصل سے جوڑ رہے ہیں جس سے وہ فی الحقیقت اُبھرتے ہیں۔ دیکھیے! یہ حرص و لالچ تو اہل مغرب کے اسلاف رومیوں میں بھی موجود تھا، ان کے دَورِ غلامی میں بھی تھا اور جاگیر داری دَور میں بھی، اور وہ اسی جذبے کے تحت اقوامِ عالم کو غلام بنایا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرص و لالچ، سرمایہ داری ارتقاء کی پیداوار نہیں ہے بلکہ نفسِ انسانی کا ایک میلان ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔

بہرحال اشتراکی کہتے ہیں کہ حرص سرمائے کا لازمہ ہے اور اس میں کسی اخلاقی حکم لگانے کی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ ایک حتمی اور جبری عمل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ سرمایہ داروں سے کسی خیر و بھلائی کی توقع نہ رکھیں اور اس نظام کو قوت و طاقت سے اور بجبر ختم کر دیں۔

یہ تو ہمیں بھی یقین ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام سے کسی قسم کی خیر برآمد نہیں ہو سکتی، کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد انسانی حقوق پر مشتمل پاکیزہ مشاعر نہیں، بلکہ خود غرضانہ پست جذبات ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام انہی غیر پاکیزہ اور انانیت پسندانہ مشاعر و جذبات پر قائم ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نظام کی وجہ سے یہ جذبات پیدا ہوتے ہوں، بلکہ ان جذبات کے نتیجے میں اس نظام نے جنم لیا ہے۔ مگر مادیت کے پرچار کی مجنونانہ خواہش اشتراکیوں سے ایسی باتیں کہلواتی ہے، جن کا عقل و سائنس سے دُور و قریب کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسبابِ عیش اور انسانی زندگی

اشتراکی یہ بھی کہتے ہیں کہ سرمایہ داری کے اس قدر پھیلاؤ اور اس طرح عظیم تر ہو جانے کا ایک بڑا سبب آسائشات اور تعیّشات کی فراوانی ہے، یہ بات اگرچہ صحیح ہے مگر فی الوقت یہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس کی نظر میں تو سرمایہ داری بھی حرام ہے اور تعیّشات

زندگی بھی[1] البتہ ہم یہاں اس مسئلہ پر نفسیاتی پہلو سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ نفسیاتی پہلو اس مقام پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

سامانِ آسائش انسانی نفس میں عیش کوشی کا جذبہ نہیں پیدا کر سکتا، کیوں کہ اگر زمانۂ قدیم ہی سے انسانی نفس میں پرانی اشیاء سے اکتاہٹ، اور نت نئی اشیاء کی تلاش کا طبعی جذبہ اور فطری میلان منتقل ہوتا نہ چلا آتا تو سرمایہ داری اپنے جدید ترین اسبابِ عیش کبھی بازار میں نہ لا پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی اقتصادی صورتِ حال ہو یا کوئی بھی معاشی پیداوار ہو، نفسِ انسانی میں اس کے لیے پہلے سے کوئی نہ کوئی میلان یقینی طور پر موجود ہوتا ہے۔ بس 'عمل اقتصاد' کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ انسانی نفس میں موجود اس میلان کی تسکین کا بندوبست کر دیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں لینا چاہیے کہ جدید ترین ایجادات انسانی مشاعر کو ایک مخصوص نہج پر نہیں ڈھالتیں اور اس نہج پر ڈھل جانے سے ایسے نئے افکار و خیالات جنم نہیں لیتے جو پہلے سے کبھی انسانی ذہن میں نہیں آئے تھے —— یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے، مگر یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان ایجادات کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ان مشاعر کی جڑیں نفسِ انسانی میں موجود ہوتی ہیں۔ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے کہ پہلے سے موجود مشاعر کسی مخصوص نہج پر ڈھل جائیں یا ایسے مشاعر کی تخلیق کی جائے جن کا نفس میں پہلے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر یہ کہنا غلط ہو گا کہ ہوائی جہاز کی ایجاد سے انسان میں پرواز کی خواہش نے جنم لیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہشِ پرواز تو انسان میں ابتدائے زمانہ سے موجود ہے، اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے بسا اوقات اس نے مصنوعی پروں سے اڑنے کی بھی کوشش کی ہے —— بالآخر نفسِ انسانی میں پہلے سے موجود اسی خواہش کی تکمیل، سائنس نے ہوائی جہاز کی شکل میں کر دی ہے۔

---

[1] سرمایہ داری کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر ہم نے اپنی کتاب 'شبہات حول الاسلام' میں بیان کیا ہے۔

Marfat.com

بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ ہوائی جہاز کی ایجاد سے لوگوں کے باہمی روابط اور ان کے مشاعر میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو گیا ہے مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ ان تمام مشاعر کی اصل نفسیاتی ہے۔

خود اشتراکی کہتے ہیں کہ جب تک نظام ماں کے اقتدار پر قائم رہا، مرد کی میراث اولاد کے بجائے اس کے بھائی بہنوں میں تقسیم ہوتی رہی۔ مگر جب ذرائع پیداوار پر مرد کا تسلط ہو گیا تو خاندانی نظام باپ کے اقتدار کی بنیاد پر قائم ہو گیا اور باپ نے اپنی میراث اپنی اولاد کو منتقل کرنا شروع کر دی۔

اب غور یہ کرنا ہے کہ کیا باپ پہلے اپنی اولاد سے محبت نہیں کرتا تھا، بلکہ ذرائع پیداوار کی ملکیت سے اس کے جذبات میں تبدیلی آئی اور وہ اپنی اولاد سے محبت کرنے لگا اور میراث میں اسے ترجیح دینے لگا؟ یا اس اقتصادی تبدیلی سے پہلے ہی باپ کے دل میں اپنی اولاد کی محبت موجود تھی، البتہ وہ اپنی اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے کہ میراث اس کی اولاد کو ملے، کسی مناسب موقع کا منتظر تھا؟

انسان میں پیدائشی طور پر دو خواہشیں موجود ہیں، زندگی سے محبت اور جنسی خواہش۔ ظاہر ہے یہ دونوں میلانات کسی اقتصادی صورتِ حال کی وجہ سے وجود میں نہیں آئے بلکہ ہر معاشرے اور ہر سماج کا رہنے بسنے والا انسان اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتا ہے اور زندگی کا دامن اس وقت تک ہاتھ سے نہیں جانے دیتا[1] جب تک بالکل مجبور نہ ہو جائے۔ اور اسی طرح اس میں جنسی میلان بھی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہتا ہے، البتہ مادی زندگی اور اقتصادی حالات انسانی زندگی کو ایک خاص نہج پر ڈال دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسان یا تو محلوں

---

[1] سوائے اس کے کہ اس کے نفس پر ایسا کوئی عقیدہ چھا جائے جو خود اس کے اپنے نفس اور اپنی انفرادی ذات سے عظیم ہو۔

Marfat.com

میں رہتا ہے یا جھونپڑوں میں بسیرا کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی جنسی ضرورت کی تکمیل مہذب اور شائستہ طریقے پر گھر میں کرتا ہے، یا پھر جانوروں کی طرح سرِعام۔ بہرکیف یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ میلانات انسانی نفس میں ہمیشہ سے موجود ہیں اور اقتصادی حالات نے انھیں جنم نہیں دیا ہے۔ مگر مادہ پرست اشتراکی اس حقیقت سے اس لیے منکر ہیں کہ اگر وہ ان دو میلانات کو فطری تسلیم کر لیں تو کوئی شخص انفرادی ملکیت کو بھی ایک ایسا نفسیاتی میلان اور فطری جذبہ قرار دے سکتا ہے جو مختلف اقتصادی حالتوں کے ظہور میں آنے سے پہلے ہی نفسِ انسانی میں موجود رہا ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ یہ دروازہ ہی بند کر دیا جائے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا بڑی سختی سے انکار کرتے ہیں کہ تمام میلانات نفسِ انسانی میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور مادی اور اقتصادی حالات ان کو صرف کسی مخصوص نہج پر ڈھال دیتے ہیں۔ اور "انسانی شعور" ہی وہ شے ہے جو مادی اور خارجی حالات سے ٹکرا کر اور ہم آہنگ ہو کر انسانی وجود کا تعین کرتا ہے۔

یہ اشتراکیت کی ایک مجنونانہ روش ہی کہی جا سکتی ہے جس کی بنا پر وہ بدیہی اور کھلے ہوئے حقائق تک کا انکار کر دیتی ہے

روٹی، کپڑا اور جنس

اشتراکی مادیت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ انسانی ضروریات کو صرف تین ضرورتوں — روٹی — کپڑا — اور جنس میں محدود کر دیتی ہے[2] اور انسان کی دیگر ضروریات خاص طور پر عقیدے کو قطعاً نظر انداز کر دیتی ہے، کیونکہ اشتراکیت کی نظر میں کسی اجتماعی نظام کو یہی تین امور مدِنظر رکھنا چاہییں، باقی ضروریات قابلِ اعتناد

---

[1] ملاحظہ فرمایئے: شبہات حول الاسلام کا باب "اسلام اور انفرادی ملکیت"۔

[2] ان تینوں ضرورتوں کا کارل مارکس نے اپنے (Manifesto) میں بیان کیا ہے اور انھیں (Three Satisfactions) کا نام دیا ہے۔

Marfat.com

نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تینوں ضروریات انتہائی اہم ہیں اور ان کی تکمیل کے بغیر انسانی زندگی استوار نہیں ہو سکتی اور جو نظام ان ضروریات کی تکمیل کا اہتمام نہ کرے وہ غلط اور ناکارہ ہے، خواہ اس میں معنوی اُمور کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ کیوں کہ معنویات بھی اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل مقصد تو انسانی زندگی کا افضل اور بلند طریقے پر قائم ہونا ہے۔ اسی طرح انسانی ضروریات کو صرف جسمانی حدود میں منحصر کر دینا بھی نہ صرف یہ کہ ایک عظیم خرابی ہے بلکہ انسان کو انسانیت کے مقامِ بلند سے گرا کر اسے حیوانیت کے باڑے میں دھکیل دینا ہے۔ بلاشبہ جسمانی ضرورتوں کی پکار انتہائی تند و تیز ہُوا کرتی ہے اور انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ پہلے ہی مرحلے میں ان ضروریات کی تکمیل کر دے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کو صرف انہی ضروریات کا تابع فرمان سمجھ لیا جائے اور صرف جسمانی ضروریات کی تکمیل ہی انسان کا مقصدِ اوّلین قرار دے دیا جائے۔

غرض جو کوئی بھی عالمی نظریہ یا نظام انسان کو صرف جسمانی ضرورتوں میں محصور گردانتا ہے تو وہ اپنی تمام باریکیوں اور نکتہ سنجیوں کے باوجود ایک غلط نظریہ اور ناکارہ نظام ہے، خواہ محنت کشوں میں معاشی انصاف اور مادی مساوات کا کتنا ہی پرچار کیوں نہ کیا جائے۔

انسان یقیناً ان تنگنائیوں میں گھرا ہُوا نہیں ہے جن میں اشتراکی مادہ پرست اسے محصور کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ روئے زمین پر جس قدر بھی مادّی، فکری اور شعوری ارتقاء پایا جاتا ہے وہ خالص انسانی کاوشوں کا نتیجہ اور اس کی نفسیاتی ضرورت کا اظہار ہے۔ فن، عقیدہ، اقدارِ عالیہ، جرأت کے کارنامے اور روحانی لمحات ہوں یا بہترین دلکش کار، فضا میں پرواز کرنے والا ہوائی جہاز، اسلحہ، کارخانے اور غذا اور لباس کی نو بہ نو رنگا رنگ شکلیں ـــــ یہ سب انسان کی کاوشوں کا نتیجہ اور اس کی نفسیاتی ضرورت کا اظہار ہی تو ہیں۔

مشین کی ایجاد اور اس ایجاد سے پیداواری اضافہ، اور انسان کی خدا تک رسائی

Marfat.com

دونوں ہی امور عظمتِ انسان کی دلیل ہیں۔ بلکہ خدا کی معرفت، انسان کی رفعت اور روح کی پاکیزگی کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو مادی دنیا میں محبوس اور دائرہ محسوسات میں مقیّد کرنا اس پر سراسر ظلم ہے اور اسے دنیائے حیوان میں دھکیل دینا ہے۔

انسانی زندگی کا مکمل اور جامع نظام وہی ہو سکتا ہے جو مجموعی اور کلی انسان کو مدنظر رکھے۔ جس میں نہ تو اس کے جسمانی مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور نہ روحانی پہلوؤں کا انکار کیا جائے اور نہ انھیں ضروریاتِ زندگی سے خارج سمجھ کر اپنی مرضی سے شیطانی راستوں پر بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

اشتراکی کہتے ہیں کہ معاشرہ اس وقت تک پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مضبوط اقتصادی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر اس امر کی دلیل نہیں جس کے لیے اسے دلیل بنایا جا رہا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ جیسے کوئی شخص عمارت کی مضبوط بنیادیں بھر کر اس میں بیٹھ جائے کہ اب ان مضبوط بنیادوں پر عمارت خود بخود بلند ہو جائیگی۔

مضبوط اقتصادی بنیادوں کا قیام بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ تو معاشرے کو بلند تر انسانی احساس پر قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اقتصادی مضبوطی کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے اخلاقی، فکری، روحانی اور انسانی ارتقاء کے لیے سازگار فضا تیار ہو سکے۔ مگر یہ ارتقاء بھی خود بخود نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے لیے مثبت کوششوں اور جدوجہد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اشتراکی نظام نے صرف جسمانی ضروریات کی تکمیل کو بنیاد بنا کر اپنے وجود کو ایک تنگ دائرے میں محصور کر لیا ہے اور یہی انحصار جلد یا بدیر اس کے زوال کا سبب بن جائے گا۔

Marfat.com

اسلام کی خصوصیات

اشتراکیت چونکہ مذہب کو بطور ایک قوتِ محرکہ کے تسلیم نہیں کرتی، اس لیے وہ انسانی زندگی کے بیشتر مظاہر کی تعبیر سے بھی عاجز رہتی ہے۔

اسلام ہی کو لیجیے جو وسیع رقبۂ زمین پر پھیلا اور تاریخ عالم میں انتہائی ممتاز مقام حاصل کیا۔ اگر ہم اسلام کے اجتماعی نظام پر غور کریں تو ایسے ایسے عجائبات سامنے آتے ہیں جن کی تاریخ کی مادی تعبیر کوئی توجیہہ نہیں کر سکتی۔

پہلی خصوصیت:

اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام بے مثال تیزی سے پھیلا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کے دس سال میں اسلام جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ ایران، عراق، شام، مصر اور افریقہ تک پہنچ چکا تھا۔

بتائیے کون سا مادی انقلاب تھا اور اس مختصر سے عرصے میں ذرائع پیداوار میں وہ کون سی تبدیلی آ گئی تھی جس کی بناء پر تاریخ کی یہ طاقتور ترین اور تیز رفتار تحریک ابھر آئی اور وسیع ترین رقبۂ زمین میں پھیلتی چلی گئی؟

•فارس اور روم کی عظیم الشان سلطنتوں سے عرب کی جو مختصر سی جماعت نبرد آزما ہو رہی تھی، اس کے پاس کون سی مادی قوت تھی، کون سی حربی طاقت تھی؟ وہ تو صرف اسلام کو سربلند کرنے نکلے تھے اور اس دور کی ساری مادی اور جنگی قوت کے فارس اور روم ہی مالک تھے، اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے سے لے کر اس فتح مبین تک ذرائع پیداوار میں بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

Marfat.com

صرف ایک ہی شے تبدیل ہوئی تھی، اور ایک ہی انقلاب آیا تھا۔ اور وہ یہ کہ اہلِ عرب کا کائنات، زندگی اور حق و انصاف کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا تھا (جس حق و انصاف کا مادہ پرست فریڈرک اینگلز کی زبانی مذاق اڑاتے ہیں)۔

یہ نیا عقیدہ ہی وہ اصل محرک تھا جس نے صدیوں کے جمے ہوئے معاشی حالات اور مادی حقائق کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت استوار کر دی تھی۔ اس عقیدے میں اس قدر غلبہ تھا اور قوت تھی کہ اس نے ذرا سی مدت میں تمام گزشتہ مادی حقیقتوں کو تبدیل کر دیا، جبکہ انسانوں کی صدیوں کی جمی جمائی زندگی اور ان کی تہہ بہ تہہ پیوست شدہ اقتصادی حالتوں کی تبدیلی کے لیے دس بیس سال یا پچاس سو سال کوئی حیثیت نہیں رکھا کرتے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی جنگوں میں کچھ مجاہد مالِ غنیمت کی خاطر بھی شریک ہوا کرتے ہوں، مگر ظاہر ہے کہ پوری تحریک اس قسم کے افراد کا مجموعہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ تحریک اسلامی میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جاتی تھی اور جوں ہی لوگ اسلام قبول کرتے فوراً وہ اپنے حقوق اور واجبات میں تمام مسلمانوں کے برابر ہو جاتے اور مال و دولت، حکومت و سیاست اور اللہ و رسولؐ سے تعلق میں ان میں آپس میں کوئی فرق باقی نہ رہ جاتا۔ جو شخص اسلام نہ قبول کرتا اس سے جزیہ لیا جاتا، جو ضرورت مندوں میں تقسیم ہو کر باقی ماندہ بیت المال میں جمع ہو جاتا، اور اگر لوگ اسلام قبول کرنے اور جزیہ دینے سے انکار کرتے تو پھر ان سے جہاد ہوتا۔

اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ مقصدِ جہاد مالِ غنیمت ہی کا حصول ہوتا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی جماعت اپنے سے ساز و سامان میں زیادہ اور جنگی صلاحیتوں میں برتر اقوام سے کس طرح بازی لے گئی؟

دوسری خصوصیت:

اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک ایسا اقتصادی

Marfat.com

اور اجتماعی نظام وضع کیا جس کی مثال نہ پہلے کبھی ملتی ہے اور نہ ہی آج تک تاریخ اس کی مثال پیش کر سکی ہے۔ مثلاً، اسلام نے سُود اور ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دے کر اسلامی حکومت کو یہ حق عطا کیا کہ وہ لوگوں کے زاید از ضرورت مال میں سے فقراء کا حق وصول کریں۔ بلکہ اسلامی حکومت کو یہاں تک حق دیا کہ وہ معاشرے میں توازن اور عدل برقرار رکھنے کے لیے مال و دولت کے بارے میں کوئی حکم نافذ کر سکتی ہے، کیوں کہ اصل مالک اللہ ہے اور جماعت صرف اللہ کی نائب ہے۔ اور مالک کو اس مال میں تصرف کی اس وقت تک اجازت ہے جب تک وہ اس کو صحیح استعمال کرے اور اس کی روش دوسروں کے لیے تکلیف دہ نہ ہو، ورنہ یہ مال اس سے واپس لے کر پھر کسی ایسے شخص کو دے دیا جائے گا جو اس کو بہتر طریقہ پر تصرّف میں لا سکے[1]

پھر یہ نظام مادی یا اقتصادی حالات کا نتیجہ نہیں تھا اور نہ ذرائع پیداوار نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اسلام کو اشتراکی نظریات کے مطابق ان ذرائع پیداوار کا لازمی نتیجہ قرار دیا جائے۔ اگر اسلام ذرائع پیداوار کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتا تو دنیا میں تیرہ سو برس تک غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا دور دورہ رہتا، یہاں تک کہ سوشلسٹ انگلستان یا کمیونسٹ روس میں اسلام جیسا کوئی نظام قائم ہو جاتا۔

تیسری خصوصیت:

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح لوگوں کے ذہنوں پر اپنے نقوش مرتسم کیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنواُمیّہ کے زمانے میں جاگیرداری کے اثرات رونما

---

[1] شبہات حول الاسلام میں اس موضوع پر ان ابواب میں تفصیل بیان ہوا ہے:
"اسلام اور سرمایہ داری"۔ "اسلام اور جاگیرداری" اور
"اسلام اور انفرادی ملکیت"۔

Marfat.com

ہونے پر ناراض ہوگئے، وہ اس لیے ناراض نہیں ہوئے تھے کہ جاگیرداری نظام کی ضرورت اجتماعی ارتقاء کے اس مرحلے میں آکر ختم ہوگئی تھی اور اب نئے ذرائع پیداوار وجود میں آگئے تھے جن کا تقاضا یہ تھا کہ جاگیرداری نظام کو ختم کر کے نئے نظام کے لیے زمین ہموار کی جائے۔ جی نہیں، بلکہ اس ناراضگی کا اظہار لوگوں کے اس احساس کی بناء پر ہوا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کی شریعت وقانون بھرپور طریقے پر نافذ نہیں کیا جا رہا ہے اور حق و انصاف کی پوری پوری رعایت ملحوظ نہیں رکھی جارہی ہے، جس کی بناء پر خطرہ ہے کہ کہیں روحِ اسلام ہی پژمردہ نہ ہوجائے اور اسلامی معاشرے کی صورت ہی نہ بدل جائے۔

یہ چونکہ اسلام کا دورِ اوّل تھا اس لیے لوگوں نے اس روش پر ناراضی کا اظہار کیا، مگر جب آگے چل کر مسلمان اسلام سے دُور ہوگئے تو انھوں نے مجبوراً اس جاگیرداری نظام کو قبول کر لیا۔

چوتھی خصوصیت:

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جاگیرداری نظام جو بنو اُمیّہ کے دَور میں لوگوں پر مسلّط ہوگیا تھا اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذہن کو قطعاً متاثر نہیں کیا اور انھوں نے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے اسلامی حکومت میں سیاست اور مالی شعبوں میں پیداشدہ بگاڑ کی اصلاح کی۔ انھوں نے بنی اُمیہ سے لوگوں کا سرمایہ لے کر انھیں واپس کیا اور ہندوستان سے افریقہ تک پھیلی ہوئی اسلامی حکومت میں ایسا اجتماعی اور معاشی انصاف قائم کیا کہ عمالِ زکوٰۃ فقراء اور محتاجین کی تلاش میں نکلتے، مگر انھیں کوئی زکوٰۃ کا حقدار نہ ملتا، کیونکہ سب لوگ اپنے ہاتھ کی کمائی سے مستغنی ہوگئے تھے۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے نہیں ہوگیا تھا کہ جاگیرداری نظام کے ختم ہوجانے کا وقت آگیا تھا، کیونکہ جاگیرداری تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دَور ختم ہوتے ہی دوبارہ لوٹ آئی تھی۔ بلکہ اس انقلاب کا سبب یہ تھا کہ ایک مسلمان کے دل میں اسلام بیدار ہوگیا تھا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اپنی قوتِ ارادی سے تمام اقتصادی صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

Marfat.com

انسان اور اس کے نفسیاتی محرکات

میرے اس مندرجہ بالا بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقیدہ صرف فکر و شعور کی صورت میں، بغیر حرارتِ عمل کے، تن تنہا اور تمام حالات میں وقت کے مادّی اور اقتصادی حالات سے مزاحم ہو سکتا اور ان کا مقابلہ کر سکتا ہے —— عقیدہ صرف اسی صورت میں پیش آمدہ حالات سے مزاحم ہو سکتا اور ان پر غلبہ پا سکتا ہے جب اس کے ماننے والوں کے دل سوزِ یقین سے دھڑک رہے ہوں اور قلب حرارتِ ایمان سے شرر فشاں ہوں۔ میرا اصل مدّعا یہ ہے کہ ہم انسان کے بارے میں اِس روشنی میں گفتگو کریں کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور مادّی تصرّفات میں آزاد اور گرد و پیش کے حالات سے نمٹنے میں با اختیار ہے، اور اس کے ارتقاء اور اس کے رفعت و تنزّل کے کچھ طے شدہ انسانی اصول ہیں۔ اور ہم انسان کو اس داغ دار اور بدنما شکل میں پیش نہ کریں جس شکل میں اسے مادہ پرست اشتراکیوں نے پیش کیا ہے، جس میں انھوں نے انسان سے ہر ارادہ اور اختیار[1] چھین کر مادّی قوتوں کے سامنے مجبور اور اقتصادی تبدیلیوں کے سامنے بے بس بنا دیا ہے اور تمام غیر متغیر قدروں کو پیداواری صورت کا عکس بتا کر ان کی قدر و قیمت کھو دی ہے۔

۲ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ اخلاق اقتصادی صورتِ حال کا عکس ہوتا ہے، بلکہ ہمارے نزدیک اخلاق کا ایک بے لچک اور دائمی پیمانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان پر زیادتی نہ کرے، کیونکہ تمام انسان عالمی برادری میں شریک ہیں۔

---

[1] کارل مارکس پر ہونے والی شدید تنقیدات کے نتیجہ میں مادہ پرست اس اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انسان بیک وقت متاثر کرتا بھی ہے اور ہوتا بھی ہے، مگر وہ یہ اعتراف صرف نظری بحث میں کرتے ہیں اور واقعی مسائل میں پوری طرح اقتصادی جبریت ہی کے قائل رہتے ہیں۔ بالخصوص جب مسئلہ کسی مذہبی عقیدے کے ختم کرنے اور اس کے حقیقی محرک ہونے کی قوت کا انکار کرنے سے متعلق ہو، تو اس جبریت میں شدید مبالغہ کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

اسلام نے اخلاق کا یہ پیمانہ مقرر کیا ہے اور اس کے مطابق لوگوں کا محاسبہ کیا ہے، اور اس وقت کیا ہے جبکہ اقتصادی صورتِ حال کے پیدا کردہ اخلاقی عیوب لوگوں کو قتل وغارت کرنے، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور عورتوں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے پر آمادہ کیے ہوئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے معاشرے کو متوازن اور معتدل اجتماعی اور اقتصادی اساس پر استوار کیا تاکہ وہ اپنے نظامِ اخلاق کو نافذ کر سکے اور اخلاق، مادی دنیا سے بے تعلق ہو کر نہ رہ جائے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جس معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ مضبوط نہ ہو، وہ اپنے نظامِ اخلاق کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ اخلاق ہمیشہ بنیادی طور پر بے لچک اور دائمی ہوتا ہے اور انسانیت اخلاق کے بلند تر معیار پر پہنچنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اور اگر کسی وقت کے لیے انسانیت اخلاق کے معیار سے فروتر رہ جائے تو وہ پھر از سرِ نو اپنے اقتصادی، اجتماعی، فکری اور روحانی نظام میں اعتدال پیدا کر کے اخلاق کے بلند معیار تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔

خاندان بھی صرف اقتصادی تعلق کا نام نہیں ہے، بلکہ انسانیت کی ایک اہم اساس ہے۔ اگر اقتصادی حالات خاندانی نظام کو ادھر سے ادھر جھکولے دیتے رہتے ہیں تو اس سے یہ حقیقت متاثر نہیں ہوتی کہ خاندان کا ایک بے لچک اور دائمی پیمانہ ہے، اور یہ کہ خاندان محبت و تعاون کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ اب اگر اقتصادی حالات اور غلط نفسیاتی دعوے اس حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے تو ان حالات کو درست اور ان دعووں کو صحیح کرنا چاہیے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اقتصاد بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ چنانچہ نفس میں اقتصاد کے بارے میں جو شعور ہوگا اقتصادی حالت بھی اسی کا عکس ہوگی۔ اس کی سب سے بہترین صورت یہ ہوگی کہ نفس میں یہ تصوّر ہو کہ اقتصاد مالکین اور غیر مالکین میں تعاون کا نام ہے اور تمام انسان باہمی تعاون کے ساتھ مال سے منتفع ہوتے ہیں۔ اور اس

Marfat.com

کی بدترین صورت نفس کا یہ تصور ہے کہ مالکین استحصال کرتے رہیں اور غیر مالکین ان کے خلاف اظہارِ نفرت کرتے ہیں اور اس طرح دونوں طبقوں میں اقتصادی جنگ برپا رہتی ہے۔

اگر شعورِ اقتصاد کے بجائے خود اقتصاد ہی کوئی معروضی اور حقیقی قدر اور اصل قوّتِ محرکہ ہوتی تو پھر اشتراکیت کو اس قدر پروپیگنڈے کی کیا ضرورت تھی، اور وہ لوگوں کو ان کی تباہ شدہ اقتصادی حالت سے کیوں باخبر کرتے پھرتے۔ بلکہ ــــ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے ــــ اقتصادی حالت بغیر کسی کوشش کے لوگوں کو خود بخود اشتراکیت کی جانب کھینچ لاتی۔

ہم اگر انسان کو اس صورت میں پیش کریں اور نفسِ انسانی ہی کو زندگی ساز اصل قرار دیں اور اقتصادی حالت اور مادی پیداوار کا سرچشمہ نفسِ انسانی کو بتائیں، تو درحقیقت ہم انسانیت کو اس کا صحیح مقام دیں گے۔ اور اس میں علم و سائنس سے کوئی تضاد بھی نہیں ہے، کیونکہ نفسِ انسانی کی وسعتیں اقتصاد اور مادہ، افکار و مشاعر، جسمانی ضروریات اور پاکیزہ روحانی لمحات سب کو محیط ہیں، اور یہ سب اُمور حقیقی و فطری ہیں، خواہ مادہ پرست اس حقیقت پر کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھائیں۔

Marfat.com

Marfat.com

اسلام کا نقطۂ نظر

نفسِ انسانی کے بارے میں اسلام کا ایک مستقل اور منفرد نظریہ ہے، جو دیگر تمام افکار سے بنیادی اور اصولی طور پر مختلف ہے، اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض پہلوؤں میں فروعی طور پر کچھ مشابہت بھی پائی جاتی ہو۔

اسلامی نقطۂ نظر جس طرح نفس کے تمام پہلوؤں اور زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، اس طرح دنیا کی کوئی فکر محیط نہیں ہے اور نہ ہی کسی نقطۂ نظر میں اس قدر اعتدال، توازن اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس قدر اسلامی فکر میں پائی جاتی ہے۔

توازن اور اعتدال

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان کی حیثیت میں سامنے رکھتا ہے۔ نہ تو اسلام انسان کو خلافِ طبیعت کام پر مجبور کرتا ہے اور نہ اس کے فطری میلانات کو کچلتا ہے، بلکہ وہ توازن اور اعتدال کے ساتھ فطرتِ انسانی کو مہذّب بناتا ہے تاکہ فرد کی شخصیت فطری میلانات کے دباؤ اور اقدارِ عالیہ کے مطالبات کے درمیان بٹ کر نہ رہ جائے۔

اسلام کی نظر میں انسان نہ تو فرشتہ ہے اور نہ شیطان، اگرچہ کبھی کبھی انسان برائیوں کی گرفت میں آکر شیطان بھی بن جاتا ہے اور امورِ خیر اور بھلائی کے کاموں میں ترقی کرتا ہوا فرشتہ بھی بن جاتا ہے۔ مگر طبعی حالات میں وہ ان دونوں حدوں کے درمیان ہی رہتا ہے اور خیر و شر دونوں ہی عناصر اس میں موجود رہتے ہیں اور کوئی بھی عنصر اس پر خارج سے مسلط کیا ہوا اور غیر طبعی نہیں ہوتا۔

انسان میں ایسے فطری میلانات بھی موجود ہیں جو اسے مادّی دنیا سے مربوط رکھتے

Marfat.com

اسلام نے اخلاق کا یہ پیمانہ مقرر کیا ہے اور اس کے مطابق لوگوں کا محاسبہ کیا ہے، اور اس وقت کیا ہے جبکہ اقتصادی صورتِ حال کے پیدا کردہ اخلاقی عیوب، لوگوں کو قتل و غارت کرنے، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور عورتوں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے پر آمادہ کیے ہوئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے معاشرے کو متوازن اور معتدل اجتماعی اور اقتصادی اساس پر استوار کیا تاکہ وہ اپنے نظامِ اخلاق کو نافذ کر سکے اور اخلاق، مادی دنیا سے بے تعلق ہو کر نہ رہ جائے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جس معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ مضبوط نہ ہو، وہ اپنے نظامِ اخلاق کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ اخلاق ہمیشہ بنیادی طور پر بے لچک اور دائمی ہوتا ہے اور انسانیت اخلاق کے بلند تر معیار پر پہنچنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اور اگر کسی وقت کے لیے انسانیت اخلاق کے معیار سے فروتر رہ جائے تو وہ پھر از سرِ نو اپنے اقتصادی، اجتماعی، فکری اور روحانی نظام میں اعتدال پیدا کر کے اخلاق کے بلند تر معیار تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔

خاندان بھی صرف اقتصادی تعلق کا نام نہیں ہے، بلکہ انسانیت کی ایک اہم اساس ہے۔ اگر اقتصادی حالات خاندانی نظام کو ادھر سے ادھر جھکولے دیتے رہتے ہیں تو اس سے یہ حقیقت متاثر نہیں ہوتی کہ خاندان کا ایک بے لچک اور دائمی پیمانہ ہے، اور یہ کہ خاندان محبت و تعاون کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ اب اگر اقتصادی حالات اور غلط نفسیاتی دعوے اس حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے تو ان حالات کو درست اور ان دعووں کو صحیح کرنا چاہیے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اقتصاد بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ چنانچہ نفس میں اقتصاد کے بارے میں جو شعور ہو گا اقتصادی حالت بھی اسی کا عکس ہو گی۔ اس کی سب سے بہترین صورت یہ ہو گی کہ نفس میں یہ تصوّر ہو کہ اقتصاد مالکین اور غیر مالکین میں تعاون کا نام ہے اور تمام انسان باہمی تعاون کے ساتھ مال سے منتفع ہوتے ہیں۔ اور اس

Marfat.com

کی بدترین صورت نفس کا یہ تصور ہے کہ مالکین استعمال کرتے ہیں اور غیر مالکین ان کے خلاف اظہارِ نفرت کرتے ہیں اور اس طرح دونوں طبقوں میں اقتصادی جنگ برپا رہتی ہے۔

اگر شعورِ اقتصاد کے بجائے خود اقتصاد ہی کوئی معروضی اور حقیقی قدر اور اصل قوّتِ محرکہ ہوتی تو پھر اشتراکیت کو اس قدر پروپیگنڈے کی کیا ضرورت تھی، اور وہ لوگوں کو ان کی تباہ شدہ اقتصادی حالت سے کیوں باخبر کرتے پھرتے۔ بلکہ ــــ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے ــــ اقتصادی حالت بغیر کسی کوشش کے لوگوں کو خود بخود اشتراکیت کی جانب کھینچ لاتی۔

ہم اگر انسان کو اس صورت میں پیش کریں اور نفسِ انسانی ہی کو زندگی ساز اصل قرار دیں اور اقتصادی حالت اور مادی پیداوار کا سرچشمہ نفسِ انسانی کو بتائیں، تو درحقیقت ہم انسانیت کو اس کا صحیح مقام دیں گے۔ اور اس میں علم و سائنس سے کوئی تضاد بھی نہیں ہے، کیونکہ نفسِ انسانی کی وسعتیں اقتصاد اور مادّہ، افکار و مشاعر، جسمانی ضروریات اور پاکیزہ روحانی لمحات سب کو محیط ہیں، اور یہ سب اُمور حقیقی و فطری ہیں، خواہ مادّہ پرست اس حقیقت پر کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھائیں۔

Marfat.com

ہیں اور بغیر ان میلانات کے انسان اپنی زندگی کے بلند تر مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی انسان میں ایسے میلانات بھی ودیعت کیے گئے ہیں جو اسے رفعت اور بلندی کی جانب لے جاتے ہیں اور ان لمحات میں انسان مادی دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو کر روحانی دنیا کی بلند فضاؤں میں اڑنے لگتا ہے۔

بچپن کے زمانے اور دورِ شباب میں ملنے والی تربیت کے لحاظ سے انسان رفعت اور تنزل دونوں اختیار کر سکتا ہے اور دونوں ہی اس کی طبعی قوتوں کے مطابق اور اس کے تکوینی عناصر سے ہم آہنگ ہوں گے، ان میں سے کوئی بھی امر اس پر خارج سے مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔

تنزل کی جانب میلان اور رفعت و ارتقاء کے حصول کی اُمنگ، دونوں فرد کی طبیعت ہی کا ردِ عمل (Response) ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگوں میں برائی کا میلان زیادہ ہوتا ہے اور بعض خیر کی جانب زیادہ جھکتے ہیں، مگر اکثریت ہمیشہ درمیانے درجے پر رہتی ہے۔ یا یہ کہیے کہ اکثریت تنزل کی جانب مائل اور مادی اور فطری میلانات کی تکمیل کی طرف زیادہ متوجہ ہوتی ہے، اگرچہ وہ وقتاً فوقتاً رفعت و خیر کی دعوت پر لبیک بھی کہتی رہتی ہے۔

اسلام کا بلند تر مقصد یہ ہے کہ فرد کے نفس میں توازن و اعتدال پیدا ہو، تاکہ فرد کے اعتدال سے معاشرے میں توازن پیدا ہو اور معاشرے کے توازن سے پوری انسانیت میں توازن پیدا ہو۔ چنانچہ اسلام انسان کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے تاکہ اس کے مادی اور دنیاوی میلانات میں توازن پیدا ہو سکے، مگر اس قدر تیزی اور شدت سے رفعت کی جانب نہیں لے جاتا کہ انسان کا دنیا سے رابطہ ہی منقطع ہو جائے اور مطلوبہ توازن نہ پیدا ہو سکے۔

اسلام عدمِ توازن اور بے اعتدالی کو پسند نہیں کرتا، خواہ وہ بے اعتدالی رفعت اور ارتقاء ہی کی جانب کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ اسلام تو چاہتا ہے کہ انسان زندگی کے بلند تر مقاصد حاصل کرے اور وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک انسان

Marfat.com

دنیاوی میلانات پر بھی توجہ نہ دے۔

اسلام کا مقصد تو یہ ہے کہ انسان جن طریقوں پر اپنے دنیاوی میلانات کی تکمیل کرے وہ پاکیزہ ہونے چاہییں تاکہ ساری ہی زندگی پاکیزہ اور بلند ہو اور انسان اللہ سبحانہٗ کی نعمتِ خلافت کا حقدار بن جائے۔

اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔"

کیونکہ رہبانیت جسمانی میلانات کی تکمیل سے گریز کر کے روح کی ملکوتی تطہیر کا راستہ بتلاتی ہے، مگر اسلام کی نظر میں یہ روش غیر معتدل اور غیر متوازن ہے کیونکہ اس روش پر چل کر زندگی کے مقاصد معطّل ہو جاتے ہیں اور فرد کسی ایسے مقصد کے حصول کے لیے خواہ وہ فی نفسہٖ پاکیزہ ہی کیوں نہ ہو، اپنے اوپر سختیاں جھیلتا رہتا ہے جس سے بالآخر فرد، معاشرہ اور زندگی اختلال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

گویا اسلام مقاصدِ حیات، سماجی ضروریات اور فطری میلانات میں بہترین توازن اور مثالی ہم آہنگی پیدا کر کے دنیا کو سعادت سے معمور کر دینا چاہتا ہے۔

یہ اسلام کے نقطۂ نظر کا اجمالی سا بیان تھا، اب ہم فکرِ اسلامی کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

انسانی وجود کے تین اجزاء

اسلام کی نظر میں انسانی وجود تین اجزاء پر مشتمل ہے: —— جسم، عقل اور رُوح —— اور اسلام ان تینوں کے وجود کا معترف ہے اور ان کے مطالبات کی تکمیل، اور ان کی پکار پر کھلم کھلا لبیک کہنے کی اجازت دیتا ہے۔

جسم، جو گوشت اور خون کا مجموعہ ہے، اپنے اندر کچھ فطری میلانات رکھتا ہے اور اس میں کبھی نہ سرد پڑنے والی ایک ایسی زبردست انگیخت پنہاں ہے، جو ہمہ وقت "تحفظ ذات" اور "بقائے نوع" کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ (تحفظ ذات کا وسیلہ کھانا پینا اور لباس ہے، اور بقائے نوع کا ذریعہ نسل کشی ہے)۔

Marfat.com

جسم کا یہ میلان اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بسا اوقات اس سے گریز محال ہو جاتا ہے، مثلاً بھوک و پیاس کی شدّت۔ طبعی میلانات کی اس تندی اور شدّت میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ کوئی شخص ان میلانات سے غفلت اور بے توجہی برت کر سرمایۂ حیات سے محروم نہ ہو جائے۔

جنسی شعور کے لیے فرائڈ کی طرح انتہا پسند (Extremist) ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ میلان بھی بجائے خود بہت شدید ہے، اور اگر اس میں شدّت نہ ہوتی تو بقائے نوع کا مسئلہ خطرے میں پڑ جاتا۔ پھر چونکہ نسل کشی کے سلسلے میں عورت کی ذمے داریاں زیادہ بوجھل ہیں، اس لیے عورت کا جنسی میلان بھی شدید تر ہے تاکہ وہ حمل و رضاعت کی مصیبتوں سے گھبرا کر زندگی کے ایک اہم مقصد سے گریز نہ اختیار کرلے۔

پھر جس قدر ان جسمانی ہیجانات کی عدمِ تکمیل میں الم اور تکلیف ہے، اسی قدر ان کی تکمیل میں لامتناہی لذّت بھی پنہاں ہے۔ گویا اس طرح اس امر کی پوری پوری ضمانت دے دی گئی ہے کہ فرد اپنے مقاصدِ زندگی کے حصول میں لگا رہے اور اسے یہ احساس تک نہ ہو کہ وہ ایک بھاری ذمے داری کو پورا کر رہا ہے۔

عقلِ انسانی میلانات کی تکمیل کے لیے خوب سے خوب تر طریقے دریافت کرتی رہتی ہے اور فکر و تدبّر سے پیش پا افتادہ مسائل کا حل تلاش کرتی رہتی ہے۔ عقلِ انسانی میں حصولِ معرفت اور اخذِ علم کا ایک دائمی جذبہ رکھ دیا گیا ہے تاکہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ عقلِ انسانی ہمیشہ زندگی کو بناتی اور سنوارتی رہے گی۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت زندگی اپنے مقاصد کی تکمیل کرتی ہوئی ترقی کرتی، اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ گویا ارتقاء خود زندگی کا ایک ایسا بنیادی مقصد بن گیا جس کی جانب زندگی ذاتی اور جبلّی طور پر پیش قدمی کرتی رہتی ہے اور اس ارتقاء کے لیے عقلِ انسانی کو مناسب وسائل بھی فراہم کر دیے گئے ہیں۔

Marfat.com

رُوح کے وجود کو اہلِ مغرب تسلیم نہیں کرتے کیونکہ رُوح فی ذاتہ ایک غیر محسوس شئے ہے اور اس کی کارکردگی کھلم کھلا آنکھوں کے سامنے نہیں آتی۔ ہم اس مقام پر اس غیر متناہی مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) بحث میں الجھنا نہیں چاہتے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ انکارِ روح کی کوئی مضبوط عملی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ہم نے بلا اختلاف یہ بات مان لی کہ زندگی کے اصل مقاصد میں یہ امر شامل ہے کہ وہ ہر لحظہ ترقی کرتی رہے اور مسلسل رفعت پذیر رہے تو یہ حقیقت بھی ماننی پڑے گی کہ انسان میں اس رفعت کے حصول کا ایک اہم ترین ذریعہ رُوح ہے، جو کائنات کی مخفی قوت سے رابطہ قائم کر کے اس سے وہ روشنی حاصل کرتی ہے جو احساسات کی گرفت سے آزاد، اور عقل کے ادراک سے ماوراء ہے۔ اسی آسمانی روشنی کی مدد سے روح رفعت حاصل کرتی ہے اور انسانی زندگی کے مقصدِ ارتقاء کی تکمیل کرتی ہے۔

غرض نفسِ انسانی مندرجہ بالا امور جسم، عقل اور روح پر مشتمل ہے اور اسلام انسان کی جسمانی، عقلی اور رُوحانی ضروریات کی تکمیل کرتا اور ان میں توازن اور اعتدال برقرار رکھتا ہے۔

اسلام اور انسان کی عملی زندگی

اسلام انسان کے فعّال کردارِ حیات کو تسلیم کرتا ہے اور انسان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ معقول حدود میں رہتے ہوئے اس عملِ حیات کو بھرپور طریقے پر انجام دے تاکہ نہ معاشرے کو کوئی نقصان پہنچے اور نہ ہی فرد بے اعتدالی کا شکار ہو کر کوئی نقصان اٹھائے۔ اس سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر اور عیسائیت کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔

عیسائیت نے اس وقت کے مخصوص حالات کے ماتحت جو نسخۂ علاج تجویز کیا تھا، اس میں زندگی کی جملہ سرگرمیوں پر بڑی سخت بندشیں عائد کر دی گئی تھیں۔

Marfat.com

اور نہ صرف یہ کہ فرد زندگی کے عملی میدان میں پابندِ قیود تھا، بلکہ اس کی سوچ اور فکر تک پابہ زنجیر کر دی گئی تھی اور یہ تصور ذہنوں میں اُتار دیا گیا تھا کہ زندگی سے کنارہ کشی کیے بغیر انسان بارگاہِ خداوندی میں بازیابی نہیں پا سکتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کا فرمان ہے:

"تم کھانے پینے اور لباس کا کوئی اہتمام نہ کیا کرو۔"

اور ـــــ "جو شخص حصولِ جنت کا خواہاں ہے تو اس کے لیے جَو کی روٹی کھانا اور گھورے پر کتّوں کے ساتھ سو جانا بھی بہت ہے۔"

آپؑ کا یہ فرمان اس امر کی دعوت دیتا ہے کہ نفس کے جذبات کو کچل کر اور جسم کو ذلیل کر کے روحانی ترقی اور رضائے الٰہی حاصل کی جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا مقصد شیطان سے مقابلہ کر کے نیکی کے راستے میں رکاوٹ بننے والی خواہشوں سے جنگ کر کے، انسانیت کو خیر کی جانب گامزن کرنا تھا۔ اور اس وقت بنی اسرائیل جس مادّیت، قساوت اور الحاد میں غرق تھے، اس کا تقاضا ہی یہی تھا کہ جسمانی مطالبات کے کچلنے اور دنیاوی زندگی سے کنارہ کش ہونے کی دعوت دی جاتی ـــــ مگر ـــــ

یہ نسخۂ علاج مخصوص قسم کے حالات میں تو مفید ہو سکتا ہے، ہمیشہ کے لیے قانون نہیں بن سکتا کہ انسان زندگی سے کٹ کر دیر و کلیسا میں بند ہو جائے۔ اور نہ ہی زندگی سے یہ انحراف انسانیت کے لیے مفید اور سود مند ہو سکتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ خود دیر و کلیسا میں کیا ہوتا رہا؟ بے شمار گندگیاں ان مقدس مقامات پر بکھیری گئیں، جنھیں پاکیزگی کا گہوارہ قرار دیا گیا تھا اور جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہی وہ مراکز ہیں جہاں پہنچ کر انسان جسمانی شہوتوں اور شیطانی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ مگر عیسائیت کی ان سخت گیر تعلیمات سے اخفاد (Repression) پیدا ہوا اور اسی اخفاد نے بالآخر مقدس لوگوں کو بھی بے قید شہوت رانی کی جانب دھکیل دیا۔

مسیحی معاشرے میں کیتھولک چرچ طلاق کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ازدواجی

Marfat.com

تعلقات کے برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے، خواہ زن و شوہر کے طبائع میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اور ان کی ازدواجی زندگی کے تقاضے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بظاہر تو اس قانون کی پابندی کرتے تھے، مگر عملاً زن و شوہر میں سے ہر ایک کے دوست و احباب ہوتے تھے، جن کے ساتھ وہ اپنے جذباتِ نفس کی تکمیل کرتے تھے۔

غرض چونکہ عیسائی تعلیمات سخت گیر اور انسانی طبیعت کے خلاف ہیں، اس لیے ان کا ردِّ عمل اس قدر شدید اور انتہا پسندانہ ہوتا تھا۔ مگر اسلام چونکہ انسانی طبیعت سے بخوبی واقف ہے، اس لیے اس نے انسان کو طعام، جنس اور زندگی کی تمام لذّتوں سے لطف اندوز ہونے کی کھلم کھلا اور صریح اجازت دی ہے، بلکہ بڑے واضح الفاظ میں انسان کو اپنی ضروریات کی تکمیل کی جانب متوجہ کیا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ (اعراف: ۳۲)

"آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے، اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو حرام کس نے کیا ہے؟"

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۔ (البقرہ: ۵۷)

"کھانے پینے کی جو حلال چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں انھیں کھاؤ۔"

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: ۷۷)

"اپنا دنیا کا حصہ فراموش نہ کرو۔"

اس کے برعکس عیسائیت ان لذّتوں کے احساس تک کو حرام قرار دیتی ہے، اور اس کے نتیجے میں اخفاء (Repression) اور نفسیاتی اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ مگر اسلام انسانی طبیعت کے ان میلانات کا کھلم کھلا اعتراف کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

Marfat.com

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط (آل عمران : ۱۴)

"خوشنما بنا دی گئی ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبّت عورتوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے اور جانور اور زراعت میں سے۔"

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج (الکہف : ۴۶)

"مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زیب و زینت ہیں۔"

اخفاء (Repression)

اخفاء (Repression) کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے متعلق چند کلمات پیش کرنا ضروری ہیں :

جیسا کہ فرائڈ اور تحلیلی نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں : اخفاء (Repression) اس جبلّی عمل سے فقط باز رہنے کا نام نہیں ہے جس پر انسان کی شہوانی قوت (Libido) آمادہ کرے[1]، بلکہ اخفاء (Repression) اس شعور سے پیدا ہوتا ہے جس میں جبلّی عمل کو گندا سمجھا جائے اور انسان سے اس عمل کے کرنے کی سوچ اور خواہش تک چھین لی جائے، تاکہ انسان باپ یا دیوتا کی شکل میں جلوہ گر ہونے والی ذاتِ اعلیٰ (Super Ego) کی اطاعت کر سکے، یعنی اس قوتِ جابرہ کے سامنے جھک جائے جو انسان کو اس احساس سے محروم رکھتی ہے۔

انسان جب یہ سوچتا ہے کہ فلاں خواہش کا احساس جرم ہے اور اس احساس کو اس شعور میں جگہ دینا گناہ ہے جو سماج اور خارجی دنیا سے ربط قائم کیے ہوئے ہے، تو اس سوچ سے یہ خواہش کچلی جاتی ہے۔ مگر چونکہ کچلے جانے اور اظہار

---

[1] *Three Contributions to the Sexual Theory*, P. 86

Marfat.com

کا راستہ نہ ملنے کے باوجود اس خواہش کی تکمیل کی قوت موجود ہے، اس لیے اس مقید قوت اور اس حکمراں قوت (جس نے اس کے اظہار پر پابندی عائد کی ہے) کے درمیان جنگ برپا ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کشمکش کی شدت اور گردوپیش کے ذاتی حالات کے اُلجھاؤ سے نفسیاتی الجھنیں اور اعصابی اضطرابات رونما ہوتے ہیں۔ گویا اخفاء (Repression) اس وقت رونما ہوتا ہے جب انسان کو مخصوص تعلیم کی بناء پر اس امر کی اجازت نہ ہو کہ وہ اپنی کسی فطری خواہش کو دنیائے شعور میں جگہ دے سکے۔ چنانچہ مسیحی تعلیمات کی سخت گیری نے زندگی کی لذتوں کی خواہش حرام کرکے تباہ کن اضطرابات کا دروازہ کھول دیا ہے، جبکہ اسلام اخفاء — (Repression) کے رونما ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا۔ وہ پہلے ہی مرحلے میں اس حقیقت کا اعتراف کرلیتا ہے کہ انسان لذّتوں کو پسند کرتا ہے اور یہ لذّتیں اس کے لیے پرکیف اور حسین بنادی گئی ہیں۔ جب ایک مسلمان دیکھتا ہے کہ قانونِ الٰہی میں ان لذّتوں اور خواہشوں کا اعتراف موجود ہے تو اس کے نفس میں وہ گھٹن اور نفرت پیدا نہیں ہوتی جس سے اخفاء (Repression) رونما ہوا کرتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسلام میں خواہشوں کی تکمیل کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے اور انسان کو اس قدر آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ مقام انسانیت سے فروتر ہوکر اپنی ہی خواہشوں کا غلام بن جائے۔ اگر خواہشوں کی تکمیل کی بے قید اجازت اور کھلی چھٹی دے دی جائے تو فرد اور معاشرہ دونوں ہی انتہائی نقصانات سے دوچار ہوں، اس لیے کچھ ایسی حدود وقیود متعین کرنا ضروری ہیں جن کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی نقصانات سے بچا جا سکے۔

مگر اہم بات یہ ہے کہ ان حدود وقیود سے اخفاء (Repression) نہیں پیدا ہوتا۔ یہ نفس میں موجود عملِ حیات سے متصادم نہیں ہوتیں اور نہ اس کی تکمیل کے احساس و شعور کو جرم قرار دیتی ہیں، بلکہ یہ حدود وقیود صرف زندگی کے تند و تیز دھاروں کو منظم کرکے اس کے لیے مامون و محفوظ میدانِ عمل متعین کرتی ہیں۔

Marfat.com

اس مقام پر ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں :

احساسِ جنس

سخت گیر تعلیمات، جنس کو گندگی خیال کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ جو لوگ پاکیزگی اور عالمِ ملکوت میں داخل ہونا چاہیں انھیں عورت کے احساس سے بھی مبرّا رہنا چاہیے۔ اسی طرح عورت کو مرد کے تصور و خیال سے بھی دُور بھاگنا چاہیے۔ مگر چونکہ جنسی خواہش انسان کے نفس کی گہرائیوں میں موجود ہے اور چونکہ اس خواہش کا شدید احساس بقائے نوع کے لیے ضروری ہے، اس لیے انسان چاہے یا نہ چاہے یہ احساس تو ضرور ہوگا۔ لہٰذا ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان احساسِ جنس ہی کو کچل ڈالے اور پھر اس کے نفس میں کش مکش برپا ہو جائے۔

اسلام کہتا ہے کہ خواہشاتِ نفس انسان کے لیے مزیّن کر دی گئی ہیں اور ان خواہشات کی تکمیل بلا ردّ و قدح ایک طبعی عمل ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان جنسی امنگ محسوس کرتا ہے تو وہ صرف اس احساس پر کانپ نہیں اٹھتا اور اپنے آپ کو خدا کی، لوگوں کی اور خود اپنی نظروں میں پاک باز ثابت کرنے کے لیے اس احساس کو کچل نہیں ڈالتا اور نہ ہی اسے جنسی امنگ کے شعور پر احساسِ جرم ستاتا ہے، کیونکہ یہ احساسِ جرم نفسیاتی اور عصبی اضطرابات کا باعث بنتا اور حالتِ شذوذ (Abnormality) —— میں فی الواقع جرائم کی طرف لے جاتا ہے۔

ظاہر ہے اسلام اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ انسان جنسی میلان کی تکمیل میں جس طرح اس کا جی چاہے مصروف ہو جائے، بلکہ اسلام نے کچھ حدود مقرر کی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے جنسی عمل جائز اور ان حدود کی خلاف ورزی کی صورت میں ناجائز ہے۔

یہ حدود اور قیود دراصل تعلیقِ عمل[1] (Suspension) ہیں، اخفاء

---

[1] تعلیقِ عمل (Suspension) کی اصطلاح فرائڈ نے استعمال کی ہے (م)

(Repression) ـــــ نہیں ہیں، کیونکہ کسی کام کے پابند قیود ہونے اور اسے نجس سمجھ کر ضمیر میں جگہ دینے سے گریز میں بڑا فرق ہے ۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تعلیق (Suspension) ـــــ جنسی عمل کی تنظیم کرتی ہے، اسے ختم نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے احساس کو قابل گرفت قرار دیتی ہے۔

جذبۂ انتقام

عیسائیت کی بلند تر تعلیمات میں بدلہ لینا اور جذبۂ انتقام دونوں حرام ہیں۔ان تعلیمات میں خواہشِ انتقام ایک ایسی شیطانی صفت ہے کہ وہ انسان کو عالم ملکوت میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہنے دیتی ۔ عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ :

"جو تمہارے داہنے رخسار پر مارے بایاں بھی اس کے سامنے کر دو۔"

زیادتی کو روکنا اور ظلم کا انتقام لینا ایک فطری جذبہ ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ ہمیشہ ہی جذبۂ انتقام سے کام لینے سے انسانیت کی رفعت اور اس کا ارتقاء رک جائے گا۔مگر اس فطری جذبے کا بالکلیہ کچل دینا بھی انسانیت کے مفاد میں نہیں ہے، کیونکہ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی انسان یا قوم ذلت و رسوائی سے دوچار ہو کر ظالم سے انتقام نہ لے سکے تو اس کا فائدہ صرف ظالم ہی کو پہنچتا ہے اور اس کی ستم گری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے مسیحیت کے ابتدائی دور میں حرمتِ انتقام مفید رہی ہو اور اس وقت اس کا مناسب جواز موجود ہو، مگر اس کا دائمی قانون بن جانا خطرناک بھی ہے اور ناقابل عمل بھی ،جس سے نفسیاتی کشمکش اور اضطراب کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

---

(۴) اور اس نے اخفاء (Repression) اور جبلی عمل کے از خود نہ کرنے میں فرق کیا ہے ۔ دیکھیے اس کی کتاب :

(Three Contributions to the Sexual Theory)

Marfat.com

اسلام، مسیحیت کے برعکس اس مسئلے کا کہیں زیادہ مفید اور قابلِ عمل حل پیش کرتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ واضح الفاظ میں انتقام کی اجازت دیتا ہے بلکہ کئی مقامات پر قصاص کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ

وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط (المائدہ : ۴۵)

"آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان

اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا قصاص ہے۔"

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ ٥ (البقرہ : ۱۷۹)

"تمہارے لیے قصاص لینے ہی میں زندگی ہے، اے اربابِ دانش!

شاید تم تقویٰ اختیار کرو۔"

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا

اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ : ۱۹۴)

"جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی قدر زیادتی کرو جتنی

اس نے کی ہے۔"

گویا اسلام نے شروع ہی سے احساسِ غضب اور خواہشِ انتقام کو تسلیم کر لیا، اس لیے اخفاء (Repression) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے قصاص کے مسئلے کی تحقیق اور اس کے نفاذ کا اختیار ولیٔ قصاص کو دیا ہے، مگر فرد کو بھی احساسِ انتقام سے باز نہیں رکھا، جبکہ اخفاء اور اضطراب اس احساس کے کچلے جانے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

مال کی محبّت

چونکہ عیسائیت کا مقصدِ اوّلین بنی اسرائیل کی حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور جوع الارض کی بیماری کا علاج کرنا تھا، اس لیے اس نے کہا کہ مال کی محبت شیطان کی

Marfat.com

اطاعت اور خدا کی ناراضی کا سبب ہے۔ مگر قرآن کی تعبیر کے مطابق مال کی محبت ایسی خواہش ہے جسے انسانی نفس کے لیے دل فریب بنا دیا گیا ہے اور ایک عام انسان کو اس دل فریبی کا احساس ہونا ہی چاہیے، اگر اس کے احساس ہی پر پابندی لگ گئی تو اس اخفاء (Repression) سے اس کے عمل میں انحرافات رونما ہو سکتے ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ مال کی محبت فطری ہے، اگر کوئی انسان مال کی محبت رکھتا ہے تو نہ وہ شیطانی عمل میں مبتلا ہے اور نہ خدا کی ناراضی خرید رہا ہے، بس اسی مرحلے سے اخفاء اور اضطراب کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام 'ملکیت' پر حد بندیاں قائم کرتا ہے اور حرصِ مال و دولت میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ حصولِ ملکیت کے طریقے متعین کر دیتا ہے اور ان جائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت پر بھی خرچ کے مواقع متعین کر دیتا ہے، جن میں دولت صرف کرنا جائز اور باقی مصارف میں صرف کرنا ناجائز ہے۔ یہ سب درست سہی، مگر بہرحال اس تحدید میں اور ملکیت کے شعور پر ہی پابندی لگ جانے میں بنیادی فرق موجود ہے۔

اسلام اور مسیحیت کے نقطہ ہائے نظر کو واضح کرنے کے لیے مندرجہ بالا مثالیں کافی ہیں اور ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مسیحیت ایک محدود وقت کے لیے اور ایک مخصوص قوم کے لیے ہے، جبکہ اسلام تمام انسانیت اور ہر زمانے کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ فطری جبلتوں کے بالمقابل اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ نہ صرف ان جبلتوں کا اعتراف کرتا ہے، بلکہ فرد کو اس امر کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ ان کو اپنے شعور میں جگہ دے اور پابندِ حدود رہ کر ان کی تکمیل بھی کرے۔ اس طرح اسلام اس اخفاء کا راستہ روک دیتا ہے جو فطری محرکات کو گندہ خیال کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور اس بات

Marfat.com

سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان مذہب و روایات کے دباؤ کے تحت اس فطری جذبے کے احساس و شعور ہی سے گریز کرے۔

حکمِ جہاد

اسلام انسان کی فطرت و بشریت کے اعتراف میں اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کا ارشاد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ (البقرہ: ۲۱۶)

"جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو طبعاً گراں معلوم ہوتا ہے"۔

ایک تبلیغی مذہب (Missionary Relegion) ہونے کی حیثیت میں اسلام اللہ کے راستے میں جہاد پر انحصار کرتا، اسے دین پر ایمان کا ایک حصہ قرار دیتا اور تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ دنیاوی زندگی میں قربانیوں پر ثوابِ آخرت کے وعدوں سے اسے آمادۂ جہاد کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اسلام چاہتا تو صرف جہاد کے روشن و تابناک پہلو ہی سامنے رکھتا اور یہ دعوت دیتا کہ فرد خالقِ کائنات کی رضا و خوشنودی اور اسلام کی برتری کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرے۔ اور اگر اسلام چاہتا تو جہاد کو محض دین کا ایک بنیادی رکن بتا کر اسے فرض قرار دے دیتا تو ـــ ایسا کرنا بھی بالکل درست ہوتا۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود اور اس امر کے کافی سے زیادہ جواز کے باوجود کہ اسلام بلند قدروں کی جانب پرواز کرنا انسان پر لازمی قرار دے دے، پھر بھی اسلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ انسانی طبیعت و مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ جہاد مجاہدین کے لیے ایک ناگوار اور بوجھل عمل ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اسلام اس ناگواری کو اس حد تک ابھرنے نہیں دیتا کہ لوگ جہاد ہی سے گریز کرنے لگیں بلکہ جہاد سے گریز کرنا قرآن کریم کی نظر میں انتہائی برا

Marfat.com

عمل ہے، مگر جہاد پر آمادہ کرنے میں اور اس بات میں کہ جہاد کی ناگواری اور بوجھل پن کو فرد کے احساس وشعور کے لیے بھی ممنوع قرار دیدیا جائے، بڑا فرق ہے۔

'ناگواری' کے اس اعتراف سے اسلام دو مقاصد حاصل کرتا ہے۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ اس طرح مجاہدین کے دلوں میں وہ انغمار (Repression) پیدا نہیں ہوتا جو ان لوگوں کے دلوں میں ہو سکتا ہے جنھیں کہا جائے کہ وہ برضا و رغبت جنگ میں شریک ہوں اور ناگواری کا احساس تک ان کے دلوں میں نہ ہونا چاہیے۔ تحلیلی نفسیات کے ماہرین ان نفسیاتی اور اعصابی اضطرابات سے واقف ہیں جو محاربین میں جنگ سے نفرت کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ اس نفرت کا اظہار نہ حکومت کرتی ہے اور نہ جنگی قائدین کرتے ہیں اور نہ خود سپاہیوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اس نفرت کا اظہار کریں، خواہ دل میں کتنے ہی کڑھتے رہیں۔

اگر ہم محاربین کو جنگ سے احساسِ نفرت کی اجازت دے دیں تو لاشعوری انغمار (Repression) پیدا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ اپنی نفرت کو دائرۂ شعور میں لانے پر قادر ہوں گے اور اسلام نے (وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ) "اور وہ تمھارے لیے گراں ہے" کہہ کر یہی مقصد حاصل کیا ہے۔

دوسرا بڑا مقصد اسلام کا یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ یہ فرماتا ہے کہ جہاد فی الواقع ایک نہایت گراں اور بھاری فریضہ ہے، تو اس سے مجاہدین کے دلوں میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بہادری سے اپنی جانوں کی قربانی پیش کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ میرے جنت میں جانے میں بس اتنی ہی دیر ہے کہ میں اس کافر کو قتل کر دوں یا خود شہید ہو جاؤں، اور اس کے بعد یہ مجاہد انتہائی سرور و شادمانی کے عالم میں شہید ہو جاتا ہے۔

یہ بے مثال بہادری اس اعترافِ ناگواری کے بعد ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں

Marfat.com

پر یہ لازم کر دیا جاتا کہ ان کے شعور و احساس میں بھی جنگ سے ناگواری کا جذبہ ابھرنے نہ پائے، تو وہ جنگ میں مجبور ہو کر اور پراگندہ ذہن لے کر ہی شریک ہوا کرتے۔

خمر اور میسر

اس قسم کے اعترافات دیگر قوانین میں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:

> يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيْهِمَآ إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ إِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط (البقرہ: ۲۱۹)

"لوگ آپؐ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپؐ فرما دیجیے کہ ان دونوں کے استعمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو بعض فائدے بھی ہیں اور گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں"

یہاں پر قرآن اعتراف کرتا ہے کہ خمر و میسر میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، مگر ان کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نقصان فائدے سے زیادہ ہے۔ اگر قرآن یہ کہتا کہ خمر و میسر میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ لوگ اعتراض کرتے یا عدمِ اطمینان کی سی کیفیت میں عمل پیرا ہوتے، جیسے اہلِ مغرب حرمتِ طلاق سے بچنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں۔

اسلام اور حدود و قیود

غرض اسلام انسان کی واقعی صورت حال کا اعتراف کر کے اور اس کے تمام فطری محرکات، میلانات اور جذبات کو تسلیم کر کے اسے لاشعوری اخفاء (Repression) سے محفوظ کر دیتا ہے، اور انسان کسی خواہش کو دنیائے شعور

Marfat.com

میں جگہ دے کر بارگاہِ الٰہی میں معتوب بھی قرار نہیں پاتا۔ مگر انسانی مشاعر کے اس اعتراف اور اذیت ناک لاشعوری اخفاء (Repression) سے تحفظ کے باوجود اسلام انسان کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خواہشات کا غلام بن جائے، ہمہ وقت ان کی پابجائی میں مصروف رہے اور کوئی لحظہ بھی ان کی گرفت سے آزاد نہ رہ سکے۔

جہاں اسلام انسان کے فطری محرکات کو تسلیم کرنے میں عیسائیت سے ممتاز ہے، وہاں اسلام شہوتوں پر پابندی لگا کر فاسد مغربی افکار سے بھی ممتاز ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور نفسیات کے مغربی مکاتیب فکر کی راہیں جدا جدا ہو جاتی ہیں۔

یورپ کے ذہنی غلام اور تہذیبِ مغرب کے پرستار کہتے ہیں کہ ہم انسان پر اس قدر بوجھل بندشیں کیوں عائد کریں؟ کیوں نہ اسے آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ بخوبی دنیاوی زندگی سے لطف اندوز ہو کر اور جسمانی دباؤ سے آزاد ہو کر جوش وجذبے کے ساتھ پیداواری عمل میں مصروف ہو جائے؟ جیسا کہ مغرب کے لوگ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ترقی کر رہے ہیں اور پوری دنیا پر چھاتے جا رہے ہیں

اصل میں یہ ذہنی غلام یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ یورپ بھی کسی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے اور کوئی ایسا نظام جو مغرب کا تراشیدہ نہ ہو صحیح بھی ہو سکتا ہے۔ تہذیبِ نوی کی چمک دمک نے ان لوگوں کی نگاہیں خیرہ اور فریب مادیت نے ان کی عقلیں مسحور کر دی ہیں۔ اس خیرگی نے ان کو خود اپنی نظروں میں حقیر و کمتر بنا دیا ہے۔ اب وہ یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ تہذیبِ مغرب سے بہتر بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے اور نظامِ مغرب سے بھی اچھا کوئی نظام ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کا اندازِ فکر یہ بن چکا ہے کہ جو اقوام ہوائی جہازوں، توپوں اور ایٹم بم کی مالک ہیں ان کا تہذیبی نظام غلط کیوں کر ہو سکتا ہے۔ وہ نفسیات کے بارے میں کوئی غلط بات کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ اور ہم جیسی پس ماندہ اور کمزور اقوام

Marfat.com

کیوں کر ان کی تہذیب پر تنقید کر سکتی ہیں۔ اور ہم کس طرح ان کے مقابلے میں عقل و دانش کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ انسان بس وہی اچھا ہے جو اپنی قدر پہچانتا ہو۔ لیکن اگر اس فریب کا پردہ چاک کر کے ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جو قیود متعیّن کی ہیں وہ فرد اور معاشرہ دونوں کے وجود کے تحفّظ کے لیے لازم ہیں۔ بلکہ اگر یہ قیود صرف معاشرے ہی کے مفاد میں ہوتیں، جب بھی بہر حال ناگزیر تھیں کیونکہ معاشرہ فرد پر باہر سے مسلّط نہیں کیا گیا، بلکہ معاشرہ کا وجود فرد کی اس اتھاہ خواہش کا نتیجہ ہے جس کے تحت وہ چاہتا ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے میل ملاپ رکھے اور ان میں رہ کر احساسِ مسرّت سے ہمکنار ہو۔ گویا یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جو فرد کے اپنے نفس سے ابھری ہے اور کسی نظامِ زندگی یا مذہب کی مسلّط کردہ نہیں ہے۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے فرد اور معاشرہ کے زیرِ عنوان باب میں اس پر الگ تفصیلی بحث کی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ فرد کا معاشرے کی ضروریات کو تسلیم کرنا خود فرد کا اپنے اس نفسیاتی داعیے کی تکمیل کرنا ہے جس کی تکمیل کے بغیر اسے کوئی چارۂ کار نہیں اور جس کو پورا کیے بغیر کوئی بھی فرد خوش نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے فرد پر جو قیود اور بندشیں عائد کی ہیں وہ بالآخر فرد ہی کے مفاد میں ہیں اور اگر کوئی نظامِ حیات فرد کو بالکل آزاد چھوڑ دے تو اس سے جلد یا بدیر سب سے زیادہ نقصان خود فرد کو اٹھانا پڑے گا۔

جو لوگ فریبِ مغرب میں مبتلا ہیں یہ حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اور مادی تہذیب کی چمک نے ان کے سامنے اس حقیقت کو دھندلا کر رکھ دیا ہے، مگر اس کے باوجود انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ کے عقلاء اور امریکہ کے دانشور بھی اب تہذیبِ جدید کے خطرات کو پوری طرح محسوس کر رہے ہیں اور پیش گوئی کر رہے ہیں کہ تہذیبِ جدید اپنے جلو میں کیا کیا مصائب لے کر

Marfat.com

آنے والی ہے، بلکہ تہذیبِ نوی کے بدترین نتائج سامنے آچکے ہیں۔ فرانس ذلیل وخوار ہو کر جرمنی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ ایک چوتھائی صدی میں دو عظیم جنگیں برپا ہو گئیں اور تیسری دروازے پر کھڑی ہے۔ نفسیاتی امراض، عصبی اور جنسی اضطرابات جن میں اہل یورپ و امریکہ مبتلا ہیں ـــــ یہ سب اسی تہذیب کے خبیث نتائج ہیں۔

انسان اور حیوان

جب انسان بھی پابندِ حدود و قیود ٹھہرا تو سوال یہ ہے کہ انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ تو گزارش یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی آزادی و اختیار دے کر اسے حیوانات سے ممتاز بنا دیا ہے۔

حیوانات اپنی تمام حرکات و سکنات اور اپنی جملہ جسمانی ضروریات کی تکمیل میں اپنی فطری جبلّتوں کے تابع ہیں۔ انھیں جب بھوک لگتی ہے تو انہی فطری تقاضوں کے مطابق کھاتے ہیں اور وہی اشیاء کھاتے ہیں جو طبعی طور پر ان کی غذا بنا دی گئی ہیں اور اتنا ہی کھاتے ہیں جس قدر ان کی مقدارِ طعام مقرر کر دی گئی ہے۔ (اس میں ان کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا) ۔حیوانات چونکہ ارادے اور اختیار سے محروم ہیں اس لیے انھیں اس طرح فطری طور پر پابند کر دیا گیا ہے تاکہ وہ ان طبعی اصولوں سے انحراف کر کے نقصان نہ اٹھائیں۔ البتہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی جانور کو پال لیتے ہیں تو وہ اپنی فطری رہنمائی سے بھٹک کر انسان پر بھروسہ کرنے لگتا ہے اور انسان اس کی غذا کی مقدار متعین کرنے لگتا ہے۔ بعض جانوروں کو موسم سرما میں طبعی طور پر بال وغیرہ مل جاتے ہیں اور گرمی میں یہ چادر اُتر جاتی ہے، اس میں حیوان کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ اس آمد و رفت میں کوئی تبدیلی کر سکتے ہیں۔

حیوانات میں جنسی ملاپ کا وقت اور موسم متعین ہے، جس میں نر و مادہ میں جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ اس خواہش کی تکمیل کرتے ہیں اور موسم کے گزرنے کے بعد علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

غرض اس طرح فطرت حیوان کے سرمایۂ زندگی کو محفوظ رکھتی ہے تاکہ مقرّرہ وقت سے پہلے ہی حیوان ہلاک نہ ہو جائے، مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف وکرامت عطا فرمائی ہے کہ فطری محرکات کی ادائیگی اور ان کی تکمیل میں اسے جبلّی قیود سے آزاد کر کے صاحبِ اختیار بنا دیا کہ وہ جس طرح چاہے ان محرکات کی تکمیل کرے۔ اگر انسان کو ان جذبات کے ابھرنے پر اختیار نہیں تو ان کی تکمیل پر تو اختیار ہے اور اس بات پر بھی قدرت حاصل ہے کہ انھیں کس حد تک پورا کیا جائے۔

اب اگر انسان اپنے اس اختیار کو لامتناہی حد تک استعمال کرے اور کسی معقول حد پر بندش نہ قائم کرے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ مگر کچھ سادہ لوح خیال کرتے ہیں کہ ایک بے قید زندگی انسانی مسرت اور احساسِ تسکین میں اضافہ کر سکتی ہے، لیکن یہ معاملہ نظریات پر موقوف نہیں ہے بلکہ واقعی صورت حال اور تجربہ اس کے خلاف دلائل مہیا کرتا ہے۔

لذّتِ اَکل

سب سے پہلے ہم اس کی مثال کھانے سے دیتے ہیں کیوں کہ یہ مثال مؤثر بھی ہے اور قریب الفہم بھی ہے۔ انسانی جسم کو ایک مقررہ مقدار میں پروٹین (Protein) وٹامن (Vitamin) نمکیات اور دیگر عناصر کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص لذتِ طعام سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے کثرتِ اَکل کا عادی ہو جائے اور اپنی طبعی مقدار سے زیادہ کھانے لگے، تو اس طریقے سے اس کی بھوک میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا حتیٰ کہ وہ جوع البقر کا شکار ہو جائے گا۔ اس کی آنتیں اور معدہ اپنے طبعی وجود سے بڑھ جائیں گے اور اس کی طبیعت کبھی سیر نہ ہو گی اور جس قدر اس کی جوع البقر میں اضافہ ہوتا رہے گا اسی قدر اس سے پیٹ بھر جانے کی لذت ختم ہوتی جائے گی۔ اسے وہ سیری نصیب نہ ہو گی جو ایک تندرست انسان کو محسوس

Marfat.com

ہوتی ہے ، اور پھر جس قدر بھی اس کے پیٹ میں جائے گا وہ بہر حال بھوکا ہی رہے گا اور گرسنگی اس کے لیے وبالِ جان بن کر رہ جائے گی ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ شخص لذتِ دہن کا غلام بن کر رہ جائے گا اور یہ لذت اسے کشاں کشاں لیے پھرے گی ۔ اس کے فکر و عمل کے تمام پہلو اسی مسئلے پر مرتکز اور اس کے میلانات کے تمام گوشے ایک لذیذ لقمے میں منحصر ہو جائیں گے ۔ پھر اگر مال دار ہو گا تو اپنی ساری دولت اسی میں صرف کر دے گا اور اگر غریب ہو گا تو دولت مندوں کی چوکھٹ اور ان کے دسترخوان پر ذلیل ہوتا رہے گا ۔

اس سے بڑھ کر انسانیت کی توہین اور کیا ہو گی کہ انسان اپنی انسانیت ہی سے محروم ہو جائے اور روح و فکر کو ارتقاء دینے کے بجائے پیٹ کی پوجا ہی میں اُلجھ کر رہ جائے ؟ وہ زندگی ہی کیا ہوئی جو پیٹ کی پکار پر لبیک کہنے ہی میں گزر جائے ؟ اس زندگی میں ترقی کے کس قدر امکانات ہیں اور اس قسم کے انسان میں ایسے افکار و خیالات اور نت نئے تصورات کہاں جنم لے سکتے ہیں جو تمام انسانیت کے لیے مفید و سود مند ہوں ؟

اسی وجہ سے اسلام کہتا ہے :

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ﴿الاعراف : ۳۱﴾

" کھاؤ اور پیو مگر حد سے نہ گزر جاؤ ۔"

گویا اسلام نے خورد و نوش کی اجازت تو دی مگر ایک حد بھی متعین کر دی تاکہ فرد زیادتی کے نقصان سے بچ سکے اور ارتقاء حاصل کر سکے ۔

جسمانی آرام

اس سلسلہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ انسانی جسم کو آرام کی ضرورت ہے اگر انسان کو آرام نہ ملے تو اس کی زندگی عذابِ جاں ہو کر رہ جائے ۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

" تمھارے جسم کا تمھارے اوپر حق ہے ۔"

Marfat.com

مگر آرام کی زیادتی، سستی اور کاہلی پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے جسم کی ہر حرکت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور زندگی کی اُمنگ سرد ہو جاتی ہے۔ ایک کاہل انسان کے جسم کا میکانکی عمل بھی سست ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نہ غدود (Glands) مقررہ مقدار میں رطوبتیں خارج کرتے ہیں اور نہ ہی فضلات خارج کرنے والے اعضاء طبعی رفتار پر فضلات کا اخراج کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاضل رطوبتوں کی زہریلی تہیں جم جاتی اور جسم انسانی کو خوابیدگی اور اضمحلال کا شکار بنا دیتی ہیں۔ پھر انسان اس کاہلی اور سستی کو دور کرنے کے۔ یہ مضر صحت اشیاء کا سہارا لیتا ہے، حالانکہ اگر وہ آرام و آسائش کی حدِ معقول پر اکتفا کرتا تو اسے جملہ فوائد بڑی آسانی اور طبعی طریقے پر میسر آ جاتے۔ اسلام نے سہولت پسندی اور عیش کوشی کو اسی لیے حرام قرار دیا ہے تاکہ فرد کی سلامتی برقرار رہے اور وہ نارمل حالت میں رہ کر زندگی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکے۔

مسئلہ جنس

مندرجہ بالا مثالیں واضح اور بدیہی ہیں اور ان میں اختلاف کی کم سے کم گنجائش ہے۔ البتہ مسئلہ جنس میں اختلاف پوری شدت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اہلِ مغرب کہتے ہیں کہ فرد کو مکمل جنسی آزادی ملنی چاہیے تاکہ وہ اعصابی دباؤ سے محفوظ رہے اور جو طاقت وہ اس جذبے کو دبانے اور کچلنے میں صرف کرتا ہے، اور اس دباؤ کے نتیجے میں اعصاب پر ہونے والے تباہ کن اثرات سے بچاؤ میں جو توانائی خرچ کرتا ہے اسے کسی مفید کام میں لگائے۔

مسئلہ جنس فی الحقیقت بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر ایک علیحدہ باب میں مفصل بحث کی جائے، مگر ہم یہاں اسلام کے عمومی نقطۂ نظر کے مطابق ایک برجستہ سا تبصرہ کیے دیتے ہیں۔

کچھ کوتاہ نظر حضرات مسئلہ جنس میں بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اگر اس میں کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے جنس کے شدید دباؤ سے نجات مل جائے گی،

Marfat.com

مگر واقعی صورت حال اس خیال کی تکذیب کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ جنسی خواہش بھی دیگر جسمانی خواہشوں اور نفسیاتی آرزوؤں کی طرح ہے اور جو لوگ اپنے فکر و عمل کو کچھ وقت کے لیے جنس کی گرفت سے دُور رکھنے پر قادر ہوتے ہیں وہ بہر حال وہ لوگ نہیں ہوتے جو جنس میں سر تا پا غرق ہوتے ہیں اور ہمہ وقت اسی کیف و سرور میں منہمک رہتے ہیں۔ یہ بات درُست سہی کہ جنسی لذت سے محروم لوگ بھی جنس سے دُور رہنے اور اس سے بچنے سے عاجز ہوتے ہیں، مگر اہم تر بات یہ ہے کہ جنسی لذت کوشی میں حد سے بڑھے ہوئے لوگ اس معاملے میں ان لوگوں سے زیادہ عاجز ہیں جو اس جذبے کی تکمیل سے محروم ہیں، کیونکہ جنسی بھوک بھی دیگر خواہشات کی طرح اس عمل کی زیادتی سے مٹنے کے بجائے اور بھڑک اٹھتی ہے، حتیٰ کہ یہ آگ آدمی کو بے چین و بے قرار کر کے رکھ دیتی ہے اور اس کا جسم اس آتش کو سرد کرنے سے عاجز آجاتا ہے۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو وہ حقیقی لذّت حاصل کر پاتا ہے اور نہ اس کا جسم اس قابل رہتا ہے کہ وہ تشنگی دُور کرنے کے لیے جس قدر جدوجہد کی ضرورت ہے، اسے مسلسل برداشت کرتا رہے۔

جنسی تقاضے انتہائی تند و تیز ہوا کرتے ہیں اور انسانی عمل کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتے ہیں۔ اس تقاضے کی لامتناہی تکمیل ایک دائمی بھوک بن جاتی ہے اور انسان کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے اور انسان مقام انسانیت سے گر کر ایک ایسا چوپایہ بن جاتا ہے جو جنسی ہیجان میں مبتلا ہو۔ اسی لیے اسلام نے جذبۂ جنس پر کچھ قیود عائد کی ہیں تاکہ فرد کی ذات اور اس کے مفادات کا تحفظ ہو جائے۔ اس سے مقصود محض جبر و تحکم نہیں ہے۔

جذبۂ ملکیت

یہی طریقہ اسلام نے دیگر نفسیاتی میلانات ——— (مثلاً جذبۂ ملکیت) میں بھی اختیار کیا ہے۔

Marfat.com

اسلام کہتا ہے کہ ملکیت کا شعور فطری اور نفسیاتی ہے۔ اس کا کچلنا اور اس جذبے کو مٹانا غلط ہے، مگر ملکیت کی غیر محدود اجازت بھی ایک سرکش خواہش میں بدل سکتی ہے۔

دولت جمع کرنے والا ساری زندگی پیسہ پیسہ جمع کرنے میں کھپا دیتا ہے اور کبھی اس پونجی سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا کیوں کہ اس کی نظر میں دولت جمع کرنا ہی بذاتِ خود مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ پیسہ کی محبت دل میں رچ بس جاتی ہے۔ ذہن ہر وقت اسی میں اُلجھا رہتا ہے اور حصولِ دولت کی حرص و آز کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ جس قدر دولت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر حرص بھی اپنا منہ کھول کر 'ھَلْ مِنْ مَّزِیْد' کی صدا لگاتی جاتی ہے۔

کسی شرابی نے کہا تھا کہ "جب میں ایک جام شراب پی لیتا ہوں تو میرے اندر سے ایک اور شخص اُبھرتا ہے جو پھر ایک نیا جام شراب مانگتا ہے"۔ اس شرابی کا یہ مقولہ تمام نفسانی خواہشوں پر چسپاں ہوتا ہے اور بالخصوص خواہشِ مال پر۔ ایک شخص جب لکھ پتی ہو جاتا ہے تو اس میں سے بھی ایک نیا شخص اُبھرتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اب میں کروڑ پتی بن جاؤں۔ اسی لیے اسلام نے ارتکازِ دولت (Concentration of Wealth) ——— اور سونے چاندی کو ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا ہے:

'وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ (التوبہ: ۳۴)

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے سو ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جو شخص دینار و درہم اور چاندی اور سونا جمع کرتا ہے اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، نہ ادائیگی قرض کرتا ہے، تو اسی خزانے سے اسے

Marfat.com

روزِ قیامت داغا جائے گا۔"

اسلام نے جذبۂ ملکیت پر یہ حدود و قیود اس لیے لگائی ہیں تاکہ فرد اپنی فطرتِ سلیمہ پر باقی رہ سکے اور اس کی ذات کا تحفظ ہو سکے۔

اسلام کی عائد کردہ حدود و قیود خود فرد کے مفاد میں ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام نے ایک طرف فرد کی خواہشات اور میلانات کا اعتراف کر کے اسے لاشعوری اخفا (Repression) سے محفوظ کر دیا ہے اور دوسری جانب فرد پر جو بندشیں اور قیود عائد کی ہیں اُن سے مقصود ذوقِ حکمرانی کی تسکین اور انسانوں کو غلام بنانے کی خواہش کی تکمیل نہیں ہے، بلکہ یہ قیود خود فرد کے مفاد میں ہیں۔

اسلام کی عائد کردہ بندشیں معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت میں بھی فرد کے مفاد میں ہیں، کیونکہ معاشرہ فرد کی ایسی نفسیاتی ضرورت ہے جس سے گریز ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اگر معاشرے کی بہتری کے لیے فرد پر کچھ حدود و قیود لگائی جائیں تو وہ بھی فرد کے وجود پر کوئی زیادتی نہیں ہے، اس لیے کہ معاشرہ بھی افراد ہی سے مل کر بنتا ہے۔ اس مقام پر جو بات میں زیادہ پُرزور الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلام نے جو حدود سماجی بہبود کے لیے فرد پر عائد کی ہیں بلعینہٖ وہی حدود و قیود خود اس کے وجود کے تحفظ اور اس کی ذاتی فلاح کے لیے بھی لگائی ہیں۔ اس حیثیت سے اسلام میں فرد کے اس مفاد میں جو اس کی ذاتی حیثیت میں ہے اور اس مفاد میں جو اس کے معاشرے کا ایک جز ہونے کی حیثیت میں ہے، کوئی تعارض نہیں ہے۔ اسلام نے جو بھی بندش عائد کی ہے اس کے دو پہلو ہیں جو بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک پہلو فرد کے مفاد میں ہوتا ہے اور دوسرا پہلو سماج کے مفاد میں ہوتا ہے۔

اس امر کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں:

Marfat.com

کھانے پینے میں زیادتی سے پرہیز کا ایک اجتماعی مقصد ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس زیادتی سے معاشرے میں انارکی (Anarchy) اور اضطراب نہ پھیلے، کیوں کہ معاشرے کے کچھ افراد خوردنی اشیاء کی زیادہ مقدار صرف کر لیتے ہیں اور کچھ افراد ضروری مقدار سے بھی محروم رہ جاتے ہیں جس سے محروم لوگوں کے دلوں میں اہلِ ثروت کے خلاف غم و غصہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح معاشرے میں اضطراب رونما ہو جاتا ہے اور انسانی تگ و دو کا رُخ خیر اور بھلائی سے ہٹ کر شر اور برائی کی جانب مُڑ جاتا ہے۔

کھانے پینے میں زیادتی سے ممانعت کا اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ اہلِ ثروت کے مال کی زائد مقدار محروم لوگوں تک پہنچ جائے۔ مگر اس ممانعت کا فائدہ خود فرد کو بھی حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

مال کی محبت بھی ایسی ہی خواہش ہے جیسے کھانے پینے کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ مگر اس میں اجتماعی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اس جذبے پر اگر مناسب حدود نہ لگا دی جائیں تو اس کی "بے قیدی" سے معاشرہ سخت اضطراب میں مبتلا ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر فرد کا جذبۂ ملکیت بے قید ہو تو وہ معاشرے کے لیے نہ صرف یہ کہ مہلک اور خطرناک ہوتا ہے بلکہ ایسا شخص جس کے ذہن میں مال کی محبت کا سودا سما گیا ہو تمام افراد کی تکلیف اور معاشرے کی ایذا رسانی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اس قدر بدترین جرائم کا مرتکب ہوتا ہے جو قطعاً ناقابلِ معافی ہوتے ہیں اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت سینکڑوں افراد کو پاکیزہ انسانی زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ فقر و تنگ دستی کا نقصان صرف یہی نہیں ہے کہ انسان باعزت روزگار اور سر چھپانے کی جگہ سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ اصل نقصان یہ ہے کہ افلاس انسانی افکار و خیالات میں سرایت کر کے ان میں فساد پیدا کر دیتا ہے اور ایک مفلس آدمی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا تو امیروں کا حاشیہ نشین اور خوشامدی بن جاتا ہے یا اس کے دل میں

Marfat.com

دولت مندوں کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں معاشرے میں اضطراب اور فساد رونما ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اجتماعی مصالح کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسلام میں جذبۂ ملکیت پر حدود و قیود لگانے سے صرف معاشرتی مفاد مقصود ہے، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس میں خود فرد کا مفاد ملحوظ ہے کہ وہ جوع البقر میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے اور محروم لوگوں (Haves not) کے جذبۂ انتقام سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ کبھی کبھی ان محرومین کا انتقام مالکین (Haves) کو نہ صرف دولت سے محروم کر دیتا ہے بلکہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ غرض اس طرح فرد اور معاشرے کا مفاد ایک ہی قانون میں سمو دیا گیا ہے۔

حُبِّ مال کی خواہش بھی جذبۂ ملکیت کے بے قید ہونے سے پیدا ہوتی ہے اور اگر معاشرے کا ایک طبقہ عیش کوشی میں مبتلا ہو تو دوسرا طبقہ یقیناً محروم ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ ایک سست اور عیش کوش معاشرہ نہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ وہ اسبابِ قوت اپنا سکتا ہے جو اس کے وجود کا تحفظ کریں بلکہ ایسا معاشرہ کسی بھی طاقت ور معاشرے سے مغلوب ہو کر اس کا غلام بن جاتا ہے۔

بہر کیف عیش کوشی پر پابندی جہاں معاشرتی فائدے کے لیے ہے وہاں اس میں انفرادی مفاد بھی ملحوظ ہے۔

جنسی خواہش کے بے قید رہنے سے جنسی انارکی (Sexual Anarchy) انساب میں گڑبڑ، خاندانی نظام میں ابتری، اور لوگوں کے جذبات میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ جو فرد اپنی خواہشات کی تکمیل میں منہمک ہو جاتا ہے وہ نہ تو معاشرے کی پکار پر کان دھرتا ہے اور نہ معاشرتی مفاد کے لیے اپنی روش سے ہٹنے پر تیار ہوتا ہے۔ اسی انفرادی انانیت نے فرانس کو کمزور و بے دم کر کے جرمنوں کے قدموں میں لا ڈالا تھا اور وہ دیمک خوردہ چوب کی طرح پہلی ہی ضرب میں جرمن فاتحین کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور پیرس کی بلند و بالا عمارتوں، قہوہ خانوں

Marfat.com

اور طرب گاہوں کو تباہ کن بمباری سے بچانے کے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

غرض جذبۂ جنس پر جو حدود لگائی گئی ہیں ان میں بلا شبہ معاشرے کی بہبود ہی ملحوظ ہے مگر معاشرتی بہبود ہی واحد مقصود نہیں ہے بلکہ فرد کی ذات کو بھی عدم استقرار سے تحفظ دینا اور اس کی زندگی کو مبتلائے عذاب ہونے سے بچانا ہے۔

اسلامی حدود و قیود کا مزاج دوگانہ ہے

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے نفس اور جسم کی خواہشات اور میلانات پر جو حدود لگائی ہیں ان کا مزاج دوگانہ ہے، یعنی ان میں اجتماعی اور انفرادی مفاد بیک وقت ملحوظ ہے، اور یہ کہ اسلام نے یہ حدود بلاوجہ یا صرف مذاقِ حکمرانی کے لیے عائد نہیں کی ہیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اسلام پر دورِ جدید کے کج رو نفسیاتی اور اجتماعی نظریات منطبق نہیں ہوتے، وہ نظریات جو مذہب و اخلاق اور معاشرتی قیود کو طوطمیت (Totem) اور وحشی قبائل کے نظامِ تحریم سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ اگر اسلام یا کسی بھی مذہب اور وحشی قبائل کے نظامِ تحریم کے کسی پہلو میں کوئی مشابہت پائی جائے یا قبائلی تحریمات ترقی کر کے مہذب دنیا کے دستور العمل اور قوانین بن جائیں تو اس سے ان قوانین اور نظاموں پر کوئی زد نہیں پڑتی اور نہ ہی یہ بات محلِ استہزاء ہے کہ فلاں بات وحشی قبائل میں بھی پائی جاتی تھی۔ اور نہ ہی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تہذیب و ترقی کے متوالے ان قوانین پر تیشہ چلانا شروع کر دیں۔

اہلِ مغرب اپنے مذہب، اخلاق اور معاشرے کے بارے میں جو چاہیں کہتے رہیں مگر مسلمان کیوں ان افکار کو اپنے اوپر منطبق کرتے ہیں؟ ہم کیوں ان خیالات کو اپنے اعتقاد، اپنے قانون اور اپنے نظامِ زندگی میں جگہ دیتے ہیں؟ ہمارے پاس اسلام ایک واضح نظام اور روشن مثال ہے جس میں ہر قید و پابندی کا مقصد واضح اور اس کی وجہ متعین ہے اور جس میں طوطمیت اور وحشی قبائل کی تحریمات کا کوئی جال نہیں ہے۔ جس شخص کو بھی عقلِ سلیم سے کچھ حصہ میسر آیا ہے وہ ان مقاصد کا

Marfat.com

فائدہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور اسلام کی اس خصوصیت کو محسوس کر سکتا ہے کہ اس نے ہر بندش میں معاشرے اور فرد دونوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

اگر اسلام اور قدیم وحشی قبائل میں کچھ امور مماثل بھی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان امور کی بنیادیں درست تھیں، اس لیے اسلام یا دیگر مذاہب نے انھیں برقرار رکھا۔ یہ بات خود مذہب کے حق میں دلیل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب خلافِ حق اور طبائع اشیاء سے متصادم نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وحشی قبائل بالکل ہی حق سے بے بہرہ نہ تھے، بلکہ عقل کی رسائی سے ہزاروں برس پہلے انھیں کسی مخفی طریقے سے حق کی جانب رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ گویا عقل ہی سب کچھ نہیں بلکہ انسانیت بحیثیت مجموعی شرف و کرامت کی حامل ہے۔

Marfat.com

قانونِ اسلامی کی خصوصیات

اسلامی قانون مندرجہ بالا حدود و قیود کی حفاظت کرتا ہے اور تمام زیادتیوں کی روک تھام کرکے ہر فرد کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ آزادانہ عمل کرے اور زندگی کو ہر ممکن حد تک برتے، مگر اس کا عمل نہ تو باعثِ تکلیف ہو اور نہ اس کے عمل سے کسی کو زندگی کے برتنے کے مواقع میں تنگی ہو۔

قانونِ اسلام کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک فرد یا ایک طبقے کے مفادات کو پیشِ نظر رکھنے والے دنیاوی نظاموں میں سے کسی نظام میں نہیں پائی جاتیں۔

ان خصوصیات میں سے اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کی عائد کردہ حدود (Limitations) —— فرد کے مفاد میں اس کی ذاتی اور شخصی حیثیت میں بھی ہیں، اور اس حیثیت میں بھی ہیں کہ وہ سماج کا ایک حصہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ فرد جب عائد شدہ بندشوں کے فوائد کو محسوس کرکے اپنی بعض خواہشوں کی تکمیل سے اس لیے گریز کرے گا کہ ان کی تکمیل دوسروں کی تکلیف کا باعث بن رہی ہے، تو درحقیقت وہ اپنے آپ کو دوسروں کی خواہشوں کے پھیلاؤ سے پہنچنے والی اذیت سے بھی محفوظ کرلے گا اور خود اپنی بے کراں خواہشوں کے نتیجے میں آنے والی تباہی اور بربادی سے بھی بچ جائے گا۔

اس احساس کی وجہ سے فرد ان قوانین اور ممانعتوں سے تنگ دل اور بیزار نہیں ہوگا اور نہ ان کو ختم کر دینے کے درپے ہوگا (سوائے غیر معمولی حالات کے، جس کا تفصیلی بیان ہم اس کتاب کے آئندہ باب جرم و سزا میں کریں گے۔) اور نہ اس کا اور سماج کا باہمی تعلق، فرائڈ اور تحلیلی نفسیات کے ماہرین کی بیان کردہ نفرت کی بنیاد پر ہوگا کیوں کہ اس وقت معاشرہ فرد کے حقوق غصب کرنے کے بجائے

Marfat.com

ان کا معاون و مددگار ہو گا اور ان کے درمیان صلح و آشتی کے جذبات ابھارے گا، اور کسی بھی مرحلے پر فرد اور سماج میں ٹکراؤ پیدا نہیں ہو گا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی طبقاتی یا انفرادی مفاد پر مبنی ہیں۔ چنانچہ اشتراکیت کے علم بردار سرمایہ داری نظام کے عیوب گناتے ہیں اور سرمایہ داری اشتراکیت میں کیڑے نکالتی رہتی ہے، جمہوریت ڈکٹیٹر شپ (Dictatorship) ——— کو غلط اور ناکارہ بتاتی ہے اور ڈکٹیٹر شپ جمہوریت کو جنت الحمقاء قرار دیتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نظام کسی فرد یا طبقے کے مفاد کو باقی افراد اور طبقات کے مفاد پر ترجیح دیتا ہے اور جس طرح حکمراں فرد یا طبقہ کا بس چلتا ہے وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے قوانین بنا لیتا ہے تاکہ سارے فائدے وہ اکیلا ہی سمیٹ لے اور باقی محروم رہ جائیں۔ آزادی، بھائی چارہ، مساوات، قانونی تحفظ اور روٹی، کپڑا اور مکان جیسے جس قدر راگ الاپے جاتے ہیں ان سے اصل حقیقت پر کوئی پردہ نہیں پڑتا اور وہ حقیقت یہ ہے کہ تمام قوانین غالب طبقے کے حق میں اور مظلوم طبقوں کے خلاف ہیں۔

انگلستان کا قانون ——— جو دنیا میں جمہوریت کی معراج خیال کیا جاتا ہے ——— مزدوروں کے بالمقابل سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے، اگرچہ برطانیہ میں طبقاتی کشمکش آج تک بڑی دھیمی ہے، مگر حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہی ہے۔ اور امریکہ تو سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ میں برطانیہ سے بھی کہیں آگے ہے، اور اشتراکی تو کھلم کھلا اقرار کرتے ہیں کہ اشتراکی تحریک کا مقصد بورژوا طبقے کو کچل کر پرولتاری آمریت قائم کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہمیشہ غالب اور مغلوب کی کشمکش سے دوچار رہتا ہے اور ہمیشہ طاقت ور طبقہ، کمزور طبقے پر اپنا خود ساختہ قانون مسلط کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ مغرب کے واقعیت پسند حضرات

Marfat.com

اس کلیے کو بڑی عمومیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس میں غلط طور پر اسلام کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

اسلامی نظام چونکہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ کا نازل کردہ ہے، اور اللہ کی نظر میں تمام انسان برابر اور اسی کے بندے ہیں، اس لیے اسلام تمام لوگوں کے مفادات کو بیک وقت پیش نظر رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں حاکم و محکوم، مال دار و غریب اور شریف و غلام سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اللہ سے زیادہ ڈرتا ہو۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ: ۸)

"کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم سے پہلی اقوام اس لیے تباہ ہوئی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی مالدار آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور آدمی یہ حرکت کرتا تو اسے سزا دی جاتی، خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ قطع کر دوں۔"

خود حضرت عمرؓ نے اپنے صاحب زادے پر جرم شراب نوشی کی حد جاری فرمائی۔

اگر اسلامی نظام، بعد کے ادوار میں اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا اور حالات کے دباؤ کے زیر اثر اس میں انحرافات رونما ہو گئے، تو اس بات سے خود اسلام پر کوئی زد نہیں پڑتی کیونکہ ایک مدت گزرنے کے بعد ہر نظام میں لوگ کسی قدر انحراف پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ اس وقت ہماری بحث کا موضوع مختلف ادوار میں رہنے والی

Marfat.com

اسلامی نظام کی عملی صورت نہیں، بلکہ ہم تو اس وقت اسلامی اصولوں سے بحث کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ یہ اصول ہر وقت قابلِ عمل ہیں اور فکری اور عملی لحاظ سے اسلام میں کچھ ایسی خوبیاں موجود ہیں جو دنیا کے کسی اور نظام میں نہیں پائی جاتیں۔ جو نظام خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دَور میں نافذ ہو چکا ہے وہ اگر حالات موافق ہوں تو ہر دَور میں نافذ ہو سکتا ہے۔ یہاں حالات سے ہماری مراد سیاسی حالات نہیں ہیں کیونکہ ہماری گفتگو نفسیاتی نقطۂ نظر کے ماتحت ہے اور نفسیاتی پہلو سے اسلام کا ممتاز اور وقیع نظامِ زندگی، انسانوں کی زندگیوں میں، جب بھی وہ چاہیں نافذ العمل ہو سکتا ہے۔

جس وقت اسلامی نظام برپا ہو جائے گا اس وقت ہر مسلمان شخص کو یہ شعور ہوگا کہ یہ قانون اللہ کا نازل کردہ ہے اس میں کسی ایک فرد کے مفاد کو ملحوظ رکھ کر دوسروں کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی ہے۔ نیز اس قانون کی قوتِ نافذہ صرف حاکم ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد اس کا مطالبہ کر سکتا ہے اور ایک عام آدمی بھی حاکم پر دعویٰ کر سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔"

اور آپؐ نے فرمایا:

"تم میں سے اگر کوئی شخص کوئی بُرا کام دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے بُرا کہے، اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل سے بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

اور آپؐ نے فرمایا:

"سب سے بڑا جہاد جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔"

Marfat.com

اس عمومی انصاف اور قانون کے پیش نظر جس میں حاکم و محکوم سب برابر ہیں، ہر شخص اس قانون سے محبت رکھے گا اور اس کی موافقت اور حفاظت کرے گا۔

اسلام معاشرے کی تنظیم میں تمام تر اعتماد صرف قانون سازی پر نہیں کرتا، کیونکہ قانونِ انسانی زندگی کے صرف اسی قدر پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے جن کی قانونی تنظیم اس قدر ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی انارکی (Anarchy) سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں انسانی زندگی صرف قانونی زندگی کی حد پر آ کر نہیں رُک جاتی بلکہ انسانیت میں رفعت و ارتقاء حاصل کرنے اور علم و آگہی تک پہنچنے کا ایک دائمی جذبہ موجود ہے اور یہ جذبہ قانونی حد بندیوں میں پھنس کر رہ جائے تو انسانیت کا ارتقاء ایک امر محال بن جائے۔

جس طرح اسلام نے انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو میلانات و جذبات کے اخفاء سے محفوظ رکھا ہے اور اسے اجازت دی ہے کہ وہ ان جذبات کو محسوس بھی کرے اور کسی حد تک اُن کا ساتھ بھی دے، اسی طرح اسلام نے انسانی فطرت اور اس کے جذبۂ ارتقاء کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے سامان فراہم کیے ہیں جن سے یہ اعلیٰ ترین پاکیزہ مقاصد حاصل ہو سکیں، تاکہ انسانی زندگی کے دونوں حصوں کی تکمیل ہو جائے اور ان میں اس قدر توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ دونوں ایک ہی شے بن جائیں۔

مثلاً :

لذت خورد و نوش

اگر ایک انسان لذتِ خورد و نوش میں گھر کر رہ جائے اور اس لذت کے حصول میں حدِ معقول سے گزر جائے، تو نہ وہ اپنے وجود کا تحفظ کر سکے گا (کیونکہ کھانے پینے کی اس غیر فطری زیادتی سے اس کے اعضاء متاثر ہوں گے اور ان کا فطری عمل مجروح ہو جائے گا) اور نہ وہ ارتقاء اور رفعت کا کوئی موقع پا سکے گا (حالانکہ رفعت کا حصول زندگی کے مقاصدِ اصلیہ میں سے ہے) کیونکہ اس کا فکر و شعور اسی میدان میں محصور ہو کر

Marfat.com

رہ جائے گا۔ انسان لذتِ خورد و نوش میں اس وقت گھر کر رہ جاتا ہے جب یا تو وہ اپنے اصل مقاصدِ زندگی فراموش کر بیٹھے یا خود کھانے ہی کو مقصدِ زندگی بنا لے۔ اس لیے ایک صحیح نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ منحرف افراد کو بلند تر مقاصد کی یاددہانی کراتا رہے اور انھیں بتاتا رہے کہ "زیستن برائے خوردن" نہیں، بلکہ "خوردن برائے زیستن" ہے۔

اس طرح ہر نظام کو بیک وقت دو مقاصد پورے کرنے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ جسم کے لیے اس قدر خوراک مہیا کرے کہ انسان زندگی کا تحفّظ کر سکے اور دوسرا یہ کہ انسان لذتِ طعام کا غلام نہ بننے پائے بلکہ روح و فکر کے ارتقاء کی جانب متوجہ ہو کر انسانیت کے عمومی ارتقاء میں ساتھ دے۔

لذّتِ جنس

اسی طرح اگر ایک انسان لذتِ جنس میں اُلجھ کر رہ جائے، اسی کا غلام بن جائے، دل ہر گھڑی اسی میں اٹکا رہے اور تمام قوتیں اسی میں صرف ہوتی رہیں تو وہ اپنے نقصان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ترین مقصد کے حصول سے بھی عاجز رہے گا۔

انسان جنس کا غلام اس لیے ہو جاتا ہے کہ وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ جنس کا مقصد "تحفّظِ نوع" ہے اور جنس میں تندی اور تیزی اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ انسان کے دوسرے مشاغل اسے فرض سے غافل نہ کر دیں۔ ہمیں اس منحرف شخص کو یاد دلانا پڑے گا کہ جنس کا اصل مقصد نسل کشی ہے اور جنس بذاتِ خود کوئی مقصود نہیں ہے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے: ایک تو یہ کہ انسان کا جسم کافی وقت تک محفوظ اور بقائے نسل کے قابل رہے گا۔ دوسرے یہ کہ ذخیرہ کی ہوئی بے حساب طاقت زندگی کے ارتقاء میں صرف کی جا سکے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جسم، روح اور عقل کی اس بے پناہ قوت کو ایک چھوٹے سے میدان میں صرف کر دینا انسانیت کے لیے خسارۂ عظیم ہے۔

Marfat.com

حصولِ دولت کی آتشِ شوق

اگر ایک شخص میں دولت کی لامحدود حرص پیدا ہو جائے تو اس کی یہ آتشِ شوق کبھی سرد نہیں ہو سکتی۔ اس کے پاس جس قدر دولت کی فراوانی ہوتی جائے گی اس کی جوعِ مال میں اسی قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مبتلائے عذاب بھی رکھے گا اور رفعت و ارتقاء میں حصہ بھی نہیں لے سکے گا کیونکہ جذبۂ انانیت، رفعت و ارتقاء کی ضد اور بلند تر نورانی زندگی سے متصادم ہے۔

انسان حصولِ دولت کی خواہش میں اس لیے مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دولت بذاتِ خود مقصد ہے اور خرچ کا ذریعہ نہیں ہے، حالانکہ اگر دولت خرچ ہوتی رہے تو ساری انسانیت کی بہبود ہوتی رہے اور سب لوگ اس سے مستفید ہوتے رہیں۔

اخلاق کی آبیاری

غرض زندگی کے سارے مسائل اسی طرح ہیں۔

اسلام ان حالات میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے بلند تر مقاصد رکھتا ہے اور جوں ہی وہ ان سے منحرف یا انھیں فراموش کرتے ہیں، اسلام انھیں یاد دلاتا رہتا ہے

اخلاق کا بھی اہم ترین فریضہ یہی ہے کہ وہ زندگی کے انہی اعلیٰ تر مقاصد کی یاد دہانی کراتا رہے اور انسان کو بتاتا رہے کہ وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے افراد بھی رہتے ہیں اور جیسے اس کے حقوق و فرائض ہیں ایسے دوسرے انسانوں کے بھی ہیں۔ اخلاق انسان کو بتاتا ہے کہ اس کی جسمانی خواہشوں کی اصل، تحفظِ نوع اور تحفظِ ذات ہے اور ان خواہشوں میں گھر جانے سے انسانی روح تاریکیوں میں پھنس جاتی ہے اور فطرتِ انسانی کا روشن پہلو مخفی ہو جاتا ہے، حالانکہ انسانی فطرت کا یہی تابناک پہلو اس کے ارتقاء کا ضامن ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ روح کو تاریکیوں سے نکال کر اور اس کی عظمتوں کا پورا پورا اعتراف کر کے اسے صحیح رخ

Marfat.com

پر ردِعمل ہونے کا موقع دے۔

اسلام اخلاق پر پوری پوری توجہ دیتا ہے، کیوں کہ اخلاق ہی داخلی پاکیزگی کی واحد بنیاد ہے اور اخلاق ہی ذاتی اور لاشعوری طور پر انسان کو ایسے اُمور کی جانب متوجہ کرتا ہے جو فرد اور معاشرے کے مفاد میں ہوتے ہیں، اگرچہ اس پر آمادہ انسان کی شعوری قوت ہی کرتی ہے اور اگر اس کی حکمت اور کنہہ معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو شعوری قوت ہی یہ کام سرانجام دیتی ہے۔

اسلام بچپن ہی سے اخلاق کی آبیاری کرتا اور اس کو نشوونما دیتا ہے، کیوں کہ اس طرح نفسِ انسانی میں اخلاق کی جڑیں گہری ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اسلام فرد کے سماج میں ظہور پانے والے عملی کردار کی حقیقی تنظیم اخلاق کے سپرد کر دیتا ہے اور قانون کا سہارا صرف ان حالات میں لیتا ہے جبکہ اخلاق اپنا کردار پوری طرح نہ انجام دے پائے اور ہر قسم کی تربیت و رہنمائی کے باوجود کسی شخص کی پست فطرت مستقلاً مائل بہ تنزل رہے۔

اہلِ مغرب اور اخلاق

اہلِ مغرب نے اخلاق کی مخالفت میں بے شمار فلسفے گھڑے ہیں مثلاً:

اخلاق انسانی طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ خارج سے مسلط کردہ ہے۔

اخلاق ایک ایسا بندھن ہے جو انسان کو آزادانہ عمل سے باز رکھتا ہے، فرد کو بھرپور آزادی سے مستفید ہونے میں مانع ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے فرد نفسیاتی امراض اور اعصابی اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔

اخلاق وحشی قبائلی دور کی یادگار ہے۔ ان قبائل میں اخلاق انتہائی کھردرے سخت اور کرخت ہوتے تھے، کیونکہ قبائلی زندگی میں انسان کے مزاج میں تیزی اور تندی ہوتی ہے اور وہ برائی کی جانب شدید طور پہ مائل ہوتا ہے۔ پھر انسانیت کی ترقی کے ساتھ اخلاق کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور اب بھی اس قدیم وحشی دور سے چھٹکارا پانے کے لیے اور مہذب بننے کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق کے باقی ماندہ اثرات بھی مٹا دیے جائیں۔

Marfat.com

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہم ان "مدعیانِ علم" کی طرف غلط طور پر منسوب کر رہے ہوں۔ چنانچہ فرائڈ اپنی کتاب (The Ego and the id) ______ کے صفحہ ۷۵ پر یہ بتانے کے بعد کہ اخلاق کے زہریلے مادے سے نفسیاتی امراض اور اعصابی اضطرابات پیدا ہوتے ہیں، کہتا ہے کہ:

"اخلاق اپنی طبعی اور معمولی صورت میں بھی جبریت کا حامل ہے۔"

فرائڈ اپنی کتاب "نظریہ جنس پر تین مضامین" (Three contributions to the Sexual Theory) کے صفحہ ۸۲ پر لکھتا ہے:

"اس طرح انسان نہایت اہم نفسیاتی صلاحیت سے ایک زبردست نفسیاتی قوت حاصل کر لیتا ہے۔"

فرائڈ کی کتاب (Totem and Taboo) اخلاق کے خلاف سخت تنقیدی حملوں سے بھری پڑی ہے۔ اس نے اس کتاب میں کہا ہے کہ اخلاق انسانیت کے پست ترین جذبات سے اُبھرتا اور ان میلانات سے پیدا ہوتا ہے جو سرکشی کی جانب مائل ہوتے ہیں، کیونکہ یہی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان طبعی لحاظ سے قطعاً ایک غیر اخلاقی وجود ہے اور اس کی طبیعت میں ذاتی طور پر خیر و شر کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔

فرائڈ کے علاوہ دیگر مغربی ماہرینِ نفسیات و اجتماعیات بھی اسی طرح کی لغویات کو یوں بیان کرتے ہیں گویا کہ وہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ یہ مغربی مفکرین جو اپنی مادیت پرستی اور اپنے ماحول کی پستی کی وجہ سے انسانیت سے اس قدر بدگمان ہیں کہ انھیں انسان میں کوئی ایک پاکیزہ شعور اور رفعت و پاکیزگی کی کوئی ایک جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ اور حد یہ ہے کہ یہ لوگ اس بدیہی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے کہ اگر انسان کی طبیعت تہذیب کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تو خواہ معاشرے وغیرہ کا دباؤ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہوتا، انسان مہذب نہیں بن سکتا تھا۔ انسان تو انسان ہے، بعض جانوروں تک کو تہذیب سکھا کر انھیں

Marfat.com

شائستہ بنایا جا سکتا ہے اور ان کی اصلی وحشت ختم ہو سکتی یا اس میں قابلِ ذکر تخفیف ہو سکتی ہے۔ پھر آخر انسان، جو تمام جانداروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ وجود ہے، اس کی تہذیب و شائستگی کیوں ناممکن ہے اور اسے کیوں رفعت دے کر انسانیت کے مقامِ بلند تک نہیں پہنچایا جا سکتا؟

اس سلسلے میں فرائڈ کے افکار قطعاً قابلِ اعتناء نہیں ہو سکتے اور اس کا یہ کہنا درست نہیں ہو سکتا کہ اخلاق، عمل حیات کے لاشعوری اخفاء (Repression) سے پیدا ہوتا ہے۔ دراصل فرائڈ کے افکار ان غیر معمولی (Abnormal) لوگوں پر ہی صادق آ سکتے ہیں جن کے درمیان فرائڈ خود زندگی گزار رہا تھا، یا پھر اس عیسائی سماج پر منطبق ہو سکتے ہیں جس کی عیب جوئی کے لیے فرائڈ کو بوجوہ متعین کیا گیا تھا۔ مگر بہر حال اسلام میں اس قسم کی کوئی صورت حال موجود نہیں ہے۔ اسلام تو فرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کو اپنے شعور میں جگہ دے، اس لیے اخفاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عملِ انضباط

اسلام خواہشوں پر کنٹرول کے لیے ایک نفسیاتی طریقہ اختیار کرتا ہے، جس کے بعض مظاہر اخفاء جیسے ہوتے ہیں مگر فی الحقیقت اس کا اخفاء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کا یہ نفسیاتی طریقہ، 'طریقۂ انضباط' ہے جو خواہشوں کے آگے بند باندھتا ہے اور انسان کو اس حد پر روک دیتا ہے جہاں رُک کر فرد کا مفاد اس کی ذاتی حیثیت میں بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور اس حیثیت میں بھی کہ وہ معاشرے کا ایک حصہ ہے۔

اخفاء (Repression) اور اسلام کے 'عمل انضباط' میں اساسی فرق یہ ہے کہ اخفاء ایک خطرناک اور مہلک لاشعوری عمل ہے، جبکہ انضباط ایک شعوری عمل ہے یا یہ کہیے کہ قوت شعور کے ماتحت عمل پذیر ہے۔

'عمل انضباط'، خواہشوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ

Marfat.com

اس وقت تک ان سے کوئی تعرض ہی نہیں کرتا جب تک کہ وہ لاشعور کی تاریکیوں سے نکل کر دنیائے شعور میں جلوہ گر نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ اگر لاشعور ہی میں ان خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا جائے تو عملِ حیات گھٹ کر رہ جائے اور زندگی کے اصل مقاصد کے لیے کی گئی ساری جدوجہد رائیگاں چلی جائے، حالانکہ اسلام انہی مقاصدِ اصلی کے بروئے کار لانے کا خواہش مند ہے۔

"عملِ انضباط" کی کارروائی اس وقت شروع ہوتی ہے جب خواہشیں اور میلانات لاشعور کی تاریکیوں سے نکل کر دنیائے شعور میں اُبھر آتی ہیں۔ اِس وقت "انضباط" ان کی نکاسی کی راہیں متعین کرنا، انھیں پاکیزہ بناتا اور ان کے اظہار کے مواقع اور مقامات مقرر کرتا ہے۔ اور اس سارے عمل میں فرد کے مختلف مقاصد اور سماج کے متنوّع مفادات کا تحفظ اس کے پیشِ نظر رہتا ہے اور مصالحِ عامہ کی خاطر فرد کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو دوسروں کے لیے تکلیف و ایذا کا باعث ہو۔ اور مصالحِ عامہ کی خاطر کی گئی یہ ممانعت بھی بالآخر فرد کے اپنے مفاد پر منتج ہوتی ہے۔

یہ منظّم شعوری انضباط دراصل ایک ایسا نگہبان ہے جو نفس کے تمام اعمال کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور اسے صحیح راستے پر بقولِ قرآنِ کریم کی تعبیر کے مطابق صراطِ مستقیم کی جانب متوجہ کرتا رہتا ہے۔ پھر جس قدر فرد کی تربیت ہوتی جائے گی اسی قدر یہ نگہبان اللہ کے نازل کردہ دستور کے مطابق اپنی نگرانی سخت تر کرتا جائے گا تاکہ نفس کا کوئی عمل اس کی گرفت سے باہر نہ رہ جائے۔

نفس کا ہر عمل اس قوتِ انضباط کی نگرانی میں رہتا ہے اور وہ نفس کا جانے پہچانے اسباب کے تحت مقررہ اُصولوں کے ساتھ محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ پھر یہ اُصول کوئی گورکھ دھندا نہیں ہیں اور نہ یہ کسی اقتدار کی خوشنودی کے لیے کیے جانے والے حاکمانہ فیصلے ہیں، بلکہ یہ حکمت و تدبیر پر مشتمل دستور کا ایک حصہ ہیں۔ کہنے کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دستور پر تو کوئی تنقید نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ

Marfat.com

منزل من اللہ ہے اس لیے ان احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے، مگر اس مقام پر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صرف کسی بات کو فرض ہی نہیں کیا ہے بلکہ ہر عمل کی حکمت بیان فرمائی ہے :

"تاکہ رسول بھیج دینے کے بعد لوگوں کی اللہ کے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

گویا اگر احکام الٰہی کی انبیاء اور رسول حکمت نہ بیان فرماتے تو لوگوں کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ دلیل کا مطالبہ کریں۔

اگر عقیدے اور جذبات سے کنارہ کش ہو کر معروضی نقطۂ نظر ــــــ (Objective Viewpoint) اختیار کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کے مقرر کردہ قوانین انسانیت کی ہمہ گیر فلاح کے لیے ہیں اور انضباطی نگران ان قوانین کی معقولیت پر مطمئن ہو کر نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے مندرجہ بالا بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ طریقۂ انضباط نفس انسانی سے اخفاء (Repression) کا بالکلیہ خاتمہ کر دیتا ہے، کیوں کہ ایسا ہونا ناممکن بھی ہے، نیز یہ کہ بعض حالات میں اخفاء مفید بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ خود فرائڈ کہتا ہے کہ کسی قدر اخفاء خود بخود اور ذاتی طور پر وجود میں آتا ہے اور بالکل بے ضرر ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اخفاء (Repression) کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو تو انسان ناممکن العمل اور ناقابلِ وقوع خواہشوں اور آرزوؤں کے دام میں الجھ کر رہ جائے اس وجہ سے نہیں کہ سماج، مذہب اور اخلاق ان خواہشوں کی تکمیل میں آڑے آتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کی تکمیل انسانی طاقت سے ماوراء ہے جیسے پرواز یا ہوا میں اڑنا، فطری قوتوں پر تسلط، اور بچوں کی چاند کے حصول کی آرزو ــــ شاید ان ناممکن خواہشوں کے اخفاء ہی سے انسان سائنسی تحقیقات اور آرٹ اور فن کی جانب متوجہ ہوتا ہے تاکہ وہ ان مخفی خواہشوں کو کسی دوسرے طریقے سے حاصل کر سکے۔

Marfat.com

فی الحقیقت اس "نگران" کا کام یہ ہے کہ وہ ممنوعات کو لاشعور سے شعور میں لاکر ان کے ممنوع ہونے کے اسباب بیان کرتا ہے اور اس طرح انسان ضرر رساں اخفاء سے بچ جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ بچے کی تربیت کا دارومدار کرو نہ کرو کے احکامات پر ہوتا ہے اور بچوں میں ان احکام کی حکمت سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لیے یہ ساری ہدایات اس کے لاشعور میں اتر جانی چاہئیں —— ایسا نہیں ہے بلکہ نفسیاتی تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بچوں میں خاصا شعور ہوتا ہے اور ایک ماہر تربیت کار بچے کو بعض اعمال کی حکمت بخوبی سمجھا سکتا ہے۔ امریکہ میں تو بچوں کی تربیت کا فن اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ اب بچوں کو تمام اعمال کی حکمت سمجھانا ممکن ہو گیا ہے اور بچوں کو جن امور سے باز رکھا جاتا ہے ان سب باتوں سے شعوری طور پر روکنا مشکل بھی ہو تو بھی بہرحال اس کا موقع رہتا ہے کہ جب بچے کی فکر میں ذرا پختگی آجائے اس وقت اس کے شعور میں ان ممانعتوں کی حکمت واضح کر دی جائے۔ اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ اسلامی نظام کے زیر اثر بچے اخفاء (Repression) سے دوچار ہو جائیں گے تو بھی انضباطی قوت کے لیے ہمہ وقت متنبہ رہنے، اور ایک ایسے واضح اور کھلے دستور کی روشنی میں محاسبۂ نفس کرنے، جس میں ممانعت کے اسباب اور ان کی حکمت بیان کر دی گئی ہو، اور زیر تربیت افراد کے اس ممانعت پر مطمئن ہو جانے کے بعد آخرالامر اخفاء کے آثار بالکلیہ ختم ہو جائیں گے۔

روزہ : شعوری انضباط کی مثال

"شعوری انضباط" کی قوت لاشعوری اخفاء سے قطعاً مختلف اور اخفاء کے نقصانات سے بالکل خالی ہے کیوں کہ شعوری انضباط خواہشوں کے وجود کو تو تسلیم کرتا ہے مگر ان کے بروئے کار لانے کے عمل کو کسی مناسب وقت تک کے لیے مؤخر کر دیتا ہے۔ اس انضباط کی بہترین مثال روزہ ہے۔ روزے دار اپنے اوپر کھانا اور پینا بالکلیہ حرام نہیں کر لیتا بلکہ اسے دوسرے وقت تک کے لیے مؤخر کر

Marfat.com

دیتا ہے اور اپنے دل میں سوچتا ہے :

"میں چند گھنٹوں کے لیے کھانے پینے سے پرہیز کر رہا ہوں۔ اس مقررہ وقت کے گزرنے کے بعد میں پوری طرح کھانے پینے سے لطف اندوز ہو سکوں گا۔ میں اپنے ہی فائدے کے لیے شعوری طور پر اور ایک بالاتر ہستی کے حکم کی تعمیل میں کھانے پینے سے باز رہ رہا ہوں کیونکہ اس حکم کے فوائد اور اس کی حکمت سے واقف ہوں ورنہ اگر میں چاہوں تو کوئی مجھے روکنے والا نہیں ہے۔ مگر میں خود اپنے نفس کو روکتا ہوں اور اپنے نفس پر اس بالادستی سے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے اور میں اپنے نفس کی نظر میں عظیم ہو جاتا ہوں۔"

اسی قسم کے افکار کی بناء پر بچے تک ذوق و شوق سے روزے رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کے دورِ اباحیت میں بھی روزے داروں کی تعداد نمازیوں سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ روزہ نماز سے زیادہ پُرمشقت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روزے میں نفس کُشی کا پہلو نماز سے نمایاں ہے اور انسان اگر اس طرف متوجہ ہو جائے تو روزہ ایک محبوب عمل بھی ہے۔

یہ خیال کرنا درست نہیں ہے کہ عمل انضباط بالکل آسان ہے۔ جی ہاں، آسان تو ہے مگر کسی وقت انتہائی مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اُمورِ جنس میں ـــــ مگر اس سلسلے میں دو اہم حقیقتیں ذہن نشین رہنا چاہییں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ عمل انضباط ایک نفسیاتی ورزش ہے جو متعدد پہلوؤں میں جسمانی ورزش سے مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں ہی قسم کی ورزشیں ابتداءً دشوار محسوس ہوتی ہیں مگر عادت ہو جانے پر ان کی مشقت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور اگر شروع ہی سے عادت ڈال لی جائے تو نہ صرف یہ کہ سہل ہو جاتی ہے بلکہ اس پر پوری پوری قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی لیے اسلام چاہتا ہے کہ بچے کو ابتدائی سالوں ہی سے تربیت دی جائے

Marfat.com

اور اسے خواہشوں کے ضبط کی عادت ڈالی جائے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ارادے کی تربیت کا عمل لذت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فرائڈ کہتا ہے کہ "انسانی نفس میں الم و تکلیف برداشت کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ موجود ہے"۔ اس لیے انضباط سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ انسانی طاقت سے باہر نہیں ہے بلکہ انسان اس کو پسند بھی کرتا ہے۔

قوّتِ ارادی

اسلامی تصور میں 'قوتِ ارادی' ہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی قوتِ ارادی کی بناء پر انسان ایک 'ذمے دار وجود' قرار پاتا ہے اور یہی پورے اسلامی نظام کا نقطۂ ارتکاز ہے۔

حیوان اپنی خواہشات اور میلانات کو صرف جبلی طریقے پر کنٹرول کر سکتا ہے جبکہ انسان اپنے شعور و عمل میں کارفرما قوتِ ارادی سے اپنے میلانات کو کنٹرول کرتا اور اپنی خواہشات کو منظم کرتا ہے اور اگر انسان اپنے جذبات کو کنٹرول نہ کرے اور اپنی خواہشوں کو لگام نہ لگائے تو وہ انسان نہیں کہلایا جا سکتا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ اسلام کا یہ نقطۂ نظر انسانیت کے لیے کوئی ناقابلِ برداشت بارِ گراں ہو، کیونکہ اگر انسانیت شہوتوں کی غلام بن کر نفس کی ہر پکار پر لبیک کہتی رہی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اعلیٰ ترین مقاصد حاصل کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے۔ انسانی طاقتیں بہرحال محدود ہیں، اگر انسان میں موجود طاقتوں کا یہ سارا ذخیرہ جانوروں کی طرح جسمانی خواہشات کی تکمیل میں صرف کر دیا جائے تو انسان بالکل تہی دامن رہ جائے گا اور اس میں فکری اور نفسیاتی ارتقاء کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہے گی۔

البتہ اہلِ مشرق میں وہ لوگ جن کی نگاہیں تہذیبِ نو کی چمک، دمک نے

Marfat.com

خیرہ کر دی ہیں، وہ یہ ضرور کہیں گے کہ امریکی معاشرے کے افراد ہر اخلاقی بندش سے آزاد اور جنسی اختلاط میں پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ پیداوار اور مصنوعات میں تمام دنیا سے آگے اور تمام اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ عمل پیہم پر قدرت رکھتے ہیں۔

اس بات میں اگرچہ کسی قدر شائبہ حقیقت تو ضرور ہے مگر یہ مکمل حقیقت نہیں اور اس کے جزوی حقیقت ہونے کی تین وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ امریکی قوم ایک اُبھرتی ہوئی دولت مند قوم ہے۔ اس کی اقتصادی، مادّی اور نفسیاتی طاقتیں کسی حد تک محفوظ ہیں، اس لیے وہ دیگر اقوامِ عالم کی بہ نسبت 'اباحیت' کے اس سیلِ بے کراں کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہے۔

قومی زوال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نوجوان کسی بیماری کا شکار ہو جائے تو چونکہ وہ جوان ہے اس لیے اس بیماری کے اثرات اس کے جسم پر پوری طرح عیاں نہیں ہوتے، مگر بیماری کا ہر حملہ اس کے داخلی نظام پر یقیناً اثر انداز ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کی صحت کی بنیادیں تباہ ہو جاتی ہیں اور وہ قبل از وقت بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر بیماری کا آخری جھٹکا اسے موت کی آغوش میں لے جاتا ہے۔ اگر امریکہ اپنی روش پر قائم رہا اور اس نے آنے والی نسلوں کی گراوٹ کی روک تھام نہ کی تو اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو فرانس کا ہوا، اور جو شہوتوں کے بحرِ بیکراں میں گھر جانے والی ہر قوم کا ہوا کرتا ہے۔ جس طرح ایرانی اور رومی سلطنتیں تباہ ہوئیں اور اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت نے اس وقت کی ان عالم گیر طاقتوں کو پلک جھپکتے ختم کر کے رکھ دیا؛ اور جس طرح خود اسلامی دنیا کا حشر ہوا کہ دنیائے اسلام مغربی فاتحین کے سامنے سرنگوں ہوتی چلی گئی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر امریکی قوم میں طاقت و توانائی کا اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ وہ شہوتوں میں غرق رہنے کے باوجود بھی خالص مشینی عمل انجام دے سکتی ہے، تو یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے نفسیاتی ارتفاع کا قطعاً کوئی مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

Marfat.com

امریکی تہذیب تمام تر مادی تہذیب ہے۔ اس تہذیب میں انسانی مشاعر کا عدمِ وجود اور اخلاقی اصولوں کا فقدان ہی اسے مادی کش مکش اور تباہی کی جانب لے جارہا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر کچھ امریکی مفکرین شہوتوں میں غرق ہوجانے سے بچے ہوئے ہیں اور ان کی نجی زندگی میں اعتدال و توازن موجود ہے۔ یہ لوگ اباحیت میں قوم کا ساتھ دینے کے بجائے اسے پیش پا افتادہ خطرے سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان کی 'محدود توانائیاں' شہوتوں میں بھی صرف ہوتی رہیں اور انسان رفعت و بلندی کی جانب بھی گامزن رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ طرزِ زندگی تو ایک عادت ہے، اس لیے اگر انسان صرف جسمانی ضرورتوں ہی کو پورا کرتا رہے تو توانائی باقی رہنے کے باوجود بھی وہ جسمانی ضرورتوں سے بالاتر نہیں ہوسکتا، بالخصوص جب کہ انسان ہمہ وقت دواعی شہوت کی پکار پر لبیک کہتا رہے تو اس صورت میں انسان نفسی آسائش کا شکار ہوکر کلفتوں سے گھبرانے لگتا ہے، جیسا کہ ایک کاہل اور سست آدمی کا جسم حرکت اور چستی سے گھبراتا ہے، حالانکہ حرکت جسمِ انسانی کے لیے ضروری ہے۔

یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ ارتفاع (Sublimation) اور بلندی انسانیت کے اعلیٰ ترین مقاصد ہیں، یہ بات بھی مان لینی ضروری ہے کہ ان مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ شہوتوں کو کنٹرول کرنے والی قوتِ ارادی ہے۔ اسی لیے اسلام نے قوتِ ارادی کو انسان اور حیوان کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا ہے اور کسی قوم یا فرد میں قوتِ ارادی کے فقدان کی بناء پر اس کی انسانیت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

'انھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی ہے۔'

ایک جگہ فرماتا ہے: ــــ ایسے لوگ

'اللہ کے نزدیک بدترین چوپائے ہیں۔'

Marfat.com

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"یہ لوگ اندھے گونگے اور بہرے ہیں"۔

پھر جو لوگ اپنی شہوتوں کی تکمیل کے لیے اللہ سے کیے ہوئے میثاق کو توڑ دیتے ہیں اور اپنی خواہشوں کو بے قید، آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی نظر میں یہ لوگ مقام انسانیت سے کہیں فروتر اور جانوروں کے زمرے میں شامل ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں[۱]:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ (بقرہ: ۶۵)

"پھر تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا تو قصہ معلوم ہی ہے جنھوں نے 'سبت' کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں کہا بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پڑے"۔

مطلب یہ کہ قرآن کی نظر میں یہ لوگ مرتبۂ انسانیت سے گر کر حیوان بن گئے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی اس قوت ارادی سے کام نہیں لیا جو انسان اور حیوان کے درمیان بنائے امتیاز ہے۔

اسلام، فرائڈ اور اس کے پیروکاروں، اور تحلیل نفسیات اور تجربی نفسیات کے ماہرین کی نفسیاتی جبریت (Determinism) کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اسلام نہ تو انسان کو تجربہ گاہ میں رکھ کر اس کے جزئی مطالعے کو صحیح خیال کرتا ہے، جیسا کہ تجربی نفسیات کا طریقہ ہے، اور نہ انسان کے نفسیاتی پہلو کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ اس کے تشخص کے تمام دیگر پہلو او جھل ہو کر رہ جائیں، جیسا کہ تحلیلی نفسیات کے ماہرین صرف شہوانی طاقت

---

[۱] قرآن کریم نے شہوتوں کے پیچھے لپکنے کو ظلم و زیادتی قرار دیا ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ نقض میثاق ہے اور دوسری جانب انسانی وجود کی نظافت اور پاکیزگی کے بھی خلاف ہے۔

Marfat.com

کو اصل محرک قرار دیتے ہیں اور انسانی زندگی کے تمام ضوابط اور جملہ موانع کو فراموش کر کے اسی شہوانی طاقت کو اصل قوتِ محرکہ (Dynamic) قرار دے دیتے ہیں۔

فی الواقع اسلام انسان پر بڑی گہری اور وسیع نظر ڈالتا ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر بیک وقت قوتِ محرکہ اور ضوابط پر مشتمل ہے۔

اسلام نہ تو صرف قوتِ محرکہ کو اصل اہمیت دیتا ہے کہ انسان کو سوائے خواہشِ نفس کی تکمیل کے اور کوئی کام ہی نہ رہے جیسا کہ فرائڈ کا یہی نقطۂ نظر ہے، اور نہ ضوابط ہی پر زیادہ اصرار کرتا ہے کہ انسان خطرات سے ڈر کر کوئی حرکت ہی نہ کرے، جیسا کہ جامد عقائد کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ غرض اسلام کا معتدل نقطۂ نظر انسان کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے اور وہ ہر ایک پہلو کو توازن کے ساتھ اس کا صحیح مقام دیتا ہے اور قوتِ ارادی کو شہوانی قوت کی تنظیم پر متعین کرتا ہے تاکہ نہ تو انسان بالکلیہ عملی زندگی سے کٹ کر رہ جائے اور نہ شہوانی قوتوں کو اس قدر دبایا جائے کہ بالآخر یہ خطرناک سیلاب ہر بند کو توڑ کر ابل پڑے۔

پھر اسلام قوتِ ارادی کو دنیا اور آخرت میں اخلاقی ذمے داری اور جوابدہی کا کام سپرد کرتا ہے تاکہ نفسِ انسانی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ (القیامہ : ۱۴)

"بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا۔"

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا

(الشمس : ۸ - ۹)

"اور قسم ہے جان کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست بنایا۔ پھر اس کو نافرمانی اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا القا کیا۔"

شعوری اور اخلاقی ضمیر

اسی مذکورہ بالا قوتِ ارادی سے ضمیر پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ ضمیر وہ مفاد پرست ضمیر نہیں ہے جس کو فرائڈ نے ذاتِ اعلیٰ (Super Ego) کا نام دیا ہے،

Marfat.com

جوذات کو معاشرے کی زیادتی اور دباؤ سے محفوظ رکھتا ہے کیونکہ معاشرہ فرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ باپ اور خدا کی شکل میں جلوہ گر ہونے والے معاشرتی احکام کی پابندی کرے۔

اس ضمیر کا مرکز وہ سرکش نفرت بھی نہیں ہے جو نفس انسانی پر چھائی ہوئی ہے اور خود انسان کے اپنے اعزہ اور اقرباء کے خلاف بھی نفس میں موجود ہے۔ اور یہ نفرت جب لاشعور کے تہہ خانوں سے شعور کی منزل میں آئی تو انسان کو احساس ہوا کہ اس نفرت کا اظہار ممکن نہیں ہے، اس لیے اس نے نفرت کو لاشعور میں دبا کر بظاہر محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ (فرائڈ نے یہ نہیں بتایا کہ انسان کو یہ احساس کیوں کر ہوا کہ اس نفرت کا اظہار جائز نہیں ہے۔ فرائڈ اس طرح درحقیقت اس اعتراف سے گریز کرنا چاہتا ہے کہ نفسِ انسانی میں اخلاق کا بیج موجود ہے)۔

بلکہ —— اسلام میں ضمیر شعوری اور اخلاقی ہے جو نفس سے مفاہمت کر کے اسے برابر یہ بتاتا رہتا ہے کہ ایک بلند تر انسانی زندگی کے مقاصد کیا ہیں، نیز یہ کہ انسان صرف اپنے وجود کے لیے زندہ نہ رہے اور نہ جانوروں کی طرح بندۂ شہوات بن جائے۔ اب اگر ضمیر شعوری طور پر نفس کو کوئی سرزنش یا تنبیہہ کرتا ہے تو اس میں قطعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے جب کہ اسلام میں ضمیر شہوانی مشاعر کو کچلتا (Suppress) نہیں ہے بلکہ صرف ان مشاعر کی تنظیم کرتا اور ان کو عالمِ شعور میں لانے کے لیے صحیح راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ بلکہ اگر بچہ اپنے باپ کو اپنے لیے مثالی نمونہ بناتا اور اس کی تقلید و اتباع کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں لاشعوری طور پر اس کے نفس میں ضمیر پیدا ہوتا ہے، جب بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ پھر چونکہ اسلام میں موانع (Prohibitions) اور محرمات واضح اور شعوری ہیں، ان کا مقصد سمجھ میں آنے والا اور ان کی غرض و غایت معقول ہے اور چونکہ حرمت اور ممانعت کا عمل شہوت کے نشو و نما سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے طریقۂ تنفیذ سے متعلق ہے، اس لیے بھی اس ضمیر کو باعثِ نقصان نہیں ہونا چاہیے۔

Marfat.com

اسلام ابتدائے طفولت ہی سے ضمیر کی تربیت کا حد درجہ اہتمام کرتا ہے اور تہذیبِ نفس اور رفعتِ مشاعر کو ضمیر کی تربیت کے لیے متعین کرتا ہے اور خود انسان کو اپنے آپ پر نگران بنا دیتا ہے تاکہ کسی کو تکلیف پہنچانے یا زیادتی کرنے پر ضمیر سرزنش کر سکے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ : ۸)

"کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے"۔

بلکہ اسلام نے تو کسی پر زبانی زیادتی اور غیبت و تجسس سے بھی منع کیا ہے:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (الحجرات : ۱۱)

"اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو"۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ

(الحجرات : ۱۱)

"نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیے، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہی ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہی ہوں"۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ (الحجرات : ۱۲)

"اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ حالانکہ اس کو تم ناگوار سمجھتے ہو"۔

اسلام تو کہتا ہے کہ انسانیت کے باہمی مراسم محبت و تعاون پر استوار ہونے چاہئیں:

Marfat.com

"جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرو"۔

(حدیث)

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا بنیاد کا پتھر، کہ ہر پتھر دوسرے کو مضبوطی سے جمائے رکھتا ہے"۔ (حدیث)

"نرمی، محبت اور مودّت میں مؤمنین کی مثال جسم کی سی ہے، اگر جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم ہی تکلیف، بے خوابی اور بخار محسوس کرتا ہے"۔ (حدیث)

"انسانوں کے لیے بھلائی ہے جب تک وہ آپس میں تعاون کرتے ہیں"۔

(حدیث)

پھر اسلام کہتا ہے کہ انسانیت کے یہ باہمی مراسم برابری اور وحدتِ انسانیت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئیں۔ چنانچہ فرمایا:

"تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں"۔ (حدیث)

اس لیے کسی بھی فرد کو دوسرے فرد پر زیادتی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو اعلیٰ ترین مقاصد نفسِ انسانی میں پنہاں ہیں محبت و تعاون ان کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

اسلام ضمیرِ انسانی کی تربیت کرتا اور اسے مہذب بناتا ہے اور تربیت و تہذیب کے بعد احکام کے نفاذ کی ذمے داری قانون کے بجائے ضمیر کے سپرد کر دیتا ہے اور ایسے کم ہی حالات ہوتے ہیں جہاں اسلام احکام کی تنفیذ کے لیے قانون کی جانب متوجہ ہوتا ہے، کیوں کہ اسلام نفسِ انسانی سے واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ اگر مذہبی اور اخلاقی تربیت کے نتیجے میں نفسِ انسانی میں داخلی طور پر کسی غلطی کے ارتکاب سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو وہ قانون کے مقابلے میں زیادہ زود اثر اور حصولِ مطلب کے لیے زیادہ مؤثر ہے، کیوں کہ انسانی ضمیر نفس کی گہرائیوں سے آشنا ہے جب کہ قانون کے ذرائع خارجی اور محدود ہیں اور اس کا علم بھی محدود ہے۔

Marfat.com

میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کروں گا کہ اسلامی نظام کے زیرِ سایہ تمام لوگ فرشتے اور پاکباز بن جاتے ہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ لوگ صحیح اسلامی نظام کے ماتحت دنیا کے ہر نظام سے کہیں زیادہ پاکباز رہتے ہیں اور میرا یہ دعویٰ محض تخیل کی پرواز نہیں جس کا تاریخی حقائق سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

اسلامی نظام کے ماتحت مثالی اور بہترین زندگی گزارنے والوں کی صدہا اعلیٰ ترین مثالیں ہیں جو تاریخ کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں اور جن کا غیر مسلموں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ان میں سے چند مثالیں ہم اس باب کے آخر میں بیان کریں گے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے

اسلام لوگوں کو کشمکشِ شہوات میں تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ان کی عملی، نفسیاتی اور روحانی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اصل مقصد کی جانب گامزن ہو سکیں۔

عملی لحاظ سے اسلام انسانوں کو جہاد میں شریک ہونے اور معروفِ عمل رہنے کی تاکید کرتا ہے کیوں کہ معروفیت انسان کو شہوانی ہیجان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ معروفِ عمل رہنے سے حیوانی طاقت کا بڑا ذخیرہ صرف ہو کر اعصابی دباؤ بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں فرائڈ نے اپنی کتاب (The Ego and the Id) میں ایک بڑی اچھی بات کہی ہے کہ تمام شہوانی قوتیں ایک ہی سرچشمے سے ابھرتی ہیں، اس لیے کسی ایک قوت کے اخراج سے سب ہی کو تسکین مل جاتی ہے۔ معروفیت کی بناء پر شہوانی ہیجان سے محفوظ رہنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ طریقہ زندگی ایک عادت ہے اور اگر ایک فرد طویل وقفوں تک اپنے آپ کو شہوانی انگیخت سے بچائے رکھنے کا عادی بنا لے تو رفتہ رفتہ شہوانی انگیخت کی تیزی اور تندی میں بھی کمی آ جائے گی اور یہ فرد کسی قسم کی محرومی اور اخفاء (Repression) بھی محسوس نہ کرے گا۔ مگر اسلام اس سلسلے میں اس قدر دُور بھی نہیں جاتا کہ فطری میلانات ہی کچل کر رہ جائیں یا بالآخر انسان ان میلانات سے کلیتہً گریز کا عادی ہو جائے۔ بلکہ اسلام اس میں توازن قائم رکھتا ہے اور اسی لیے اسلام میں رہبانیت حرام قرار دی گئی ہے۔

Marfat.com

عمل کا میدان بڑا وسیع ہے، عمل ہی سے زندگی بنتی ہے اور عمل ہی سے دنیا سنورتی ہے۔ اسلام نہ صرف دعوتِ عمل دیتا ہے بلکہ عمل کو قابلِ ثواب عبادت قرار دیتا ہے اور مصروفِ عمل لوگوں کو ان عابدوں اور زاہدوں پر ترجیح دیتا ہے جو کارزارِ حیات میں عملاً شریکِ جہاد نہ ہوں۔

جہاد کی متعدد اقسام ہیں:

ایک جہاد کافروں سے ہوتا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال: ٦٠)

"اور کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے، ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعے سے اللہ کے دشمنوں پر اپنا رعب جمائے رکھو۔

ایک جہاد داخلی باغیوں سے ہوتا ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ (الحجرات: ۹)

"اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔"

اور ایک جہاد ان ظالموں سے ہوتا ہے جو سماجی زندگی میں برائیوں کے مرتکب ہوتے اور برائیوں کو پھیلاتے ہیں۔

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اُسے برا کہے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل میں برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (حدیث)

Marfat.com

جہاد کی مندرجہ بالا اقسام جہادِ اصغر ہیں جیسا کہ نبی کریمؐ نے ایک جنگ سے واپسی پر ارشاد فرمایا تھا:

'ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی جانب لوٹ آئے ہیں۔ جہادِ اکبر جہادِ نفس ہے، اس میں مشقت بھی زیادہ ہے۔ یہ زیادہ طویل مدت تک جاری رہتا ہے اور اس کے اثرات زیادہ گہرے اور دور رس ہوتے ہیں'۔

اسلام میں شیطان شرِ مجسّم ہے جسے انسانیت کا دشمن بنایا گیا ہے چنانچہ شیطان اپنے مکروفریب کے جال بچھائے انسان کی گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اسی نے آدمؑ و حواؑ کو جنت سے نکلوایا اور آدمؑ و شیطان کی دشمنی مستقل اور دائمی ہوگئی اس لیے انسان کے لیے بھی اس کے خلاف تیار رہنا ضروری ہوگیا۔

اسلام نے برائی اور شیطان کی یہ تصویر کھینچ کر جو نفس انسانی کو ڈرایا ہے شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس میں پوشیدہ 'قوتِ قتال' دوسرے انسانوں پر زیادتی کے بجائے اسی ملعون دشمن سے مقابلے پر صرف ہوتی رہے' جو بقولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسان کی رگوں میں سرایت کیے ہوتے ہے۔

اسلام میں تربیتِ جہاد کا مقصد بھی یہی ہے کہ قوتِ قتال کا ظہور اعلیٰ طریقے پر ہوتا رہے، کیوں کہ مجاہد دورانِ تربیت اپنے تصوراتی دشمن کے خلاف اپنی طاقتوں کا جمع شدہ ذخیرہ صرف کرتا رہتا ہے اور بلا ارادہ اپنے مشاعر کے نشوو ارتقاء کا عادی ہوتا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی (فرائڈ کے سابق نقطۂ نظر کے مطابق) اسے اپنی محبوس شہوتوں اور جنسی قوتوں کے نکاس کا راستہ بھی مل جاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد اثباتِ ذات (Self Assertion) کا ایک پاکیزہ اوصاف ستھرا طریقہ ہے اور اس کے اختیار کرنے کے بعد کسی فرد کو اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ لوگوں کی توجہ اور ان کی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے جرم کرے اور منحرف اور شاذ (Abnormal) طریقے اپنائے۔

اس عملی جدوجہد کے یہ تمام نفسیاتی فوائد ہیں اور اس عملی جدوجہد کا خلاصہ یہ ہے

Marfat.com

کہ اسلام کے خلاف ہونے والی ہر زیادتی کے مقابلے میں برسرِ پیکار رہا جائے، تاکہ قرآن کی اس آیت کا منشا پورا ہو:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال: ٦٠)

"اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے تیار رہو"

جسمانی ورزش سے بھی فی الواقع یہی مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور اسلام سے قبل بھی متعدد اقوام نے اس میں دلچسپی لی ہے اور خود اسلام نے بھی اس سے بالکلیہ اجتناب نہیں کیا ہے اور نہ اس کی اہمیت سے انکار کیا ہے۔

اسلام کا نظامِ عبادات

اس عملی جدوجہد کے متوازی اسلام، نظامِ عبادات بھی مقرر کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے جن و انس کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر پھر بھی عبادات مقصود بالذات نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (العنکبوت: ٦)

"جو شخص جہاد کرتا ہے سو اپنے لیے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پروا ہے"

عبادت کا مقصد اصلی یہ ہے کہ لوگ بھلائی اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور انسانیت کے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول میں ایک دوسرے کی مدد کریں، کیونکہ ان مقاصد کی تکمیل کوئی فردِ تنِ تنہا نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس کے حصول کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے۔

'نماز برائیوں سے روکتی ہے' اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (العنکبوت: ۴۵)

گویا نماز ایک دوسرے مقصد کے لیے وسیلہ ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ مخلوق کا خالق سے ہمہ وقت رابطہ قائم رہے اور نفسِ انسانی برائیوں سے پاک ہو جائے

Marfat.com

روزہ انسان کی 'قوتِ ضبط' کو مضبوط بناتا ہے تاکہ وہ شہوات کو کنٹرول کرنے پر قادر ہو سکے۔

زکوٰۃ دولت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کو کنٹرول کرتی ہے، بخل کی برائی کو دُور کرتی ہے اور انسانی مشاعر کو ذات کی تنگنائیوں سے نکال کر آفاقیت عطا کرتی ہے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا

(توبہ : ۱۰۳)

"آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے اور اس کے ذریعے انھیں پاک صاف کر دیجیے"

حج بھی تطہیرِ نفس میں بڑے دُور رس اثرات کا حامل ہے کیوں کہ جس وقت انسان اللہ سبحانہٗ کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوتا ہے اور نبی کریمؐ سے مادّی اور معنوی دونوں لحاظ سے قریب ہوتا ہے تو یہ سارا پر کیف ماحول اسے وجد میں لے آتا ہے اور اس کے نفس کی کیفیات میں انقلاب بپا کر دیتا ہے۔

غرض عبادات مقصود بالذّات نہیں ہیں بلکہ انسانی رفعت و ارتقاء کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔

اسلام کی ہمہ گیری اور وسعت

مندرجہ بالا اُمور کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کی اس حیثیت کو بھی تسلیم کرتا ہے جو اس کی واقعی (Actual) اور حقیقی (Real) حیثیت ہے۔ وہ اسے ایسی باتوں پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی طبیعت کے برخلاف ہوں۔ وہ اس کے لیے ایسی حدود (Limits) مقرر کرتا ہے جو اسے ہر اُس نقصان سے بچاتی ہیں جو اسے اس کے ایک مستقل فرد ہونے کی حیثیت میں پہنچ سکتا ہو یا اس حیثیت میں پہنچ سکتا ہو کہ وہ معاشرے کا ایک فرد ہے۔ اسلام انسانی نفس کی گہرائیوں میں ایک شعوری ارادے کو ابھارتا ہے اور اس شعوری ارادے کے ذمّے یہ کام لگاتا ہے کہ وہ شہوتوں کو کنٹرول

Marfat.com

کرے اور ان کی نکاسی کے راستوں کی تنظیم کرے۔ پھر اسلام اس شعوری ارادے کے ساتھ ایک جان دار ضمیر کو منسلک کر دیتا ہے جو اخلاقی فرامین کو نافذ کرتا اور نفس کو برائیوں کی گراوٹوں اور حیوانیت کی پستیوں سے اٹھا کر وسیع، روشن اور منور آفاق کی جانب لے جاتا ہے۔

غرض اس طرح اسلام جملہ انسانی جذبات کی تکمیل اور اس کے میلانات کی تسکین کرتا ہے۔ جسم کے مطالبات بھی پورے کر دیے جاتے ہیں، عقل کو بھی نئی نئی جولانگاہیں عطا ہوتی ہیں اور روح کو عقیدے سے اور ان عبادات سے جو مخلوق و خالق کے درمیان رابطہ قائم رکھتے ہیں، توانائی بہم پہنچتی رہتی ہے۔ اور ان تمام امور میں اس قدر عجیب و دلکش ہم آہنگی قائم کر دی گئی ہے کہ یہ تمام امور ایک دوسرے کا جزء، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے اور ایک دوسرے کے معاون عناصر بن گئے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں عبادت ایک بدنی حرکت بھی ہے اور ایک روحانی پرواز بھی ہے۔ خواہشِ نفس ایک جسمانی عمل بھی ہے اور ایک مقصدِ انسانی بھی ہے۔ ان دونوں باتوں میں نہ کوئی انفصال ہے اور نہ عمل اور عبادت میں کسی قسم کا تعارض ہے۔ بلکہ ہر وہ عمل جو انسان بحالت ایمان منشاء الٰہی کی تکمیل کے لیے سرانجام دیتا ہے، وہ صرف جذبات کا دبانا اور بھوک و پیاس کا انگیز کرنا نہیں بلکہ فی الحقیقت عبادت ہے۔

"جس شخص کی نماز اسے برائیوں سے اور ناگوار امور سے باز نہ رکھے تو (ایسی نماز سے کوئی حاصل نہیں بلکہ یہ نماز تو) اللہ سے اور دور کر دینے کا سبب بنتی ہے۔" (الحدیث)

"جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ترک نہ کرے، خدا کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایسا شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" (الحدیث)

اسلام دراصل حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ وہ جہاں اس کے فطری میلانات کی تسکین کرتا ہے وہاں اس کی رفعت اور روحانی سربلندی کے بھی انتظامات کرتا ہے۔ اسلام انسان کی اقتصادی اور مادی زندگی پر بھی اسی طرح محیط ہے جس طرح

Marfat.com

وہ اس کی روحانی زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اسلام کسی نہ کسی درجے میں عمل کی جنسی تعبیر جذبات کی جمالی تعبیر اور تاریخ کی مادی تعبیر سے بھی تعرض کرتا ہے اور ان سب کے درمیان ایسا توازن پیدا کر دیتا ہے کہ ایک پہلو اپنی حد سے گزر کر دوسرے پہلو پر نہ چھا جائے۔ پھر ان تمام تعبیرات کے ساتھ عمل، جذبات اور تاریخ و زندگی کی روحانی تعبیر کا مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ اور یہ امر اسلام میں صرف دنیائے نظریات ہی میں محدود نہیں رہتا بلکہ یہ نقطۂ نظر انسان کی عملی زندگی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ایسا ہمہ گیر اور جامع نظام وجود میں آجاتا ہے جس سے زیادہ جامعیت اور ہمہ گیری اور کسی انسانی نظام میں نہیں پائی جاتی اور انسان کو اس قدر بلند اور وسیع زاویۂ نظر میسر آجاتا ہے جو اس سے قبل تاریخ میں اسے کبھی میسر نہیں آیا تھا۔

میرے خیال میں جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس فرمان کی نفسیاتی تعبیر بھی یہی ہے:

"اسلام دینِ فطرت ہے"

مطلب یہ ہے کہ اسلام فطرتِ سلیمہ کے جملہ مطالبات کی تکمیل کرتا ہے اور اس فطرتِ سلیمہ کی اس قدر بہترین طریقے پر راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر ودیعت کی ہوئی تمام فطری صلاحیتوں کو بخوبی بروئے کار لائے اور انھیں راہِ راست (صراطِ مستقیم) کی جانب متوجہ کر دے۔

Marfat.com

انسانیت کا مقامِ رفعت

اسلام کے جن نظریاتی امور کی ہم نے وضاحت کی ہے ان کی دنیائے عمل میں پیش آنے والی چند مثالیں اب پیش کی جائیں گی، مگر ان مثالوں کے بیان سے قبل، اسلام کے بارے میں چند ضروری کلمات عرض کیے جاتے ہیں۔

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے اس کے بتائے ہوئے اخلاق سے متصف ہوں اور اس کی ہدایت پر چل کر اپنے مشاعر کو پاکیزہ بنائیں، اپنے دلوں میں اللہ کا خوف محسوس کریں اور ان کے اعمال میں اس خوف کا عملی مظاہرہ ہوتا رہے۔

اگرچہ یہ انسانیت کی رفعت کا نہایت اعلیٰ مقام ہے مگر یہ آخری درجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد انسانیت کے ارتقاء کے لیے روشن مدارج بھی ہیں جہاں نور جھلملاتا ہے، جہاں خوش خبریاں سُنائی جاتی ہیں، جہاں فرشتے اپنے پروں سے سایہ فگن رہتے ہیں اور جہاں پاکیزہ و پاکباز ارواح ملاء اعلیٰ سے تقرّب حاصل کرتی ہیں۔ پھر ان کے سامنے سے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور وہ روحِ اعظم کی تجلیات کا مشاہدہ کرتی ہوئی زیادہ سے زیادہ پاکیزہ و پاکباز ہو کر عملِ خیر میں معروف ہو جاتی ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ اعلیٰ ترین مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیتا ہے اور اس کے سامنے صرف وسیع و عریض کائنات اور حیاتِ ابدی کا تصور رہ جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان سمجھتا ہے کہ وہ اس کائناتِ رنگ و بو ہی کا ایک حصہ ہے اور اسے بخوشی اپنا وجود اس کائنات میں ضم کر دینا چاہیے۔ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ انسانیت ایک عظیم وحدت اور ایک دریائے موجزن ہے اور انسانیت کے تمام افراد اس دریائے محبت میں تیرتے ہوئے اپنے خالق کی جانب جا رہے ہیں ——

Marfat.com

یہ انسانیت کا بلند ترین مقام ہے مگر اس مقام تک رسائی آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے طویل جدوجہد کی ضرورت ہے اور ایسی صلاحیتیں اور کاوشیں درکار ہیں جو کم ہی لوگوں کو میسر آتی ہیں۔ اسی لیے اسلام اس مثالیہ (Ideal) کو تمام لوگوں پر لازم نہیں کرتا جیسا کہ مسیحیت کرتی ہے، بلکہ اسلام رفعتِ انسانی کے مقامات متعین کر کے ان کے حصول کو انسانی طاقت پر چھوڑ دیتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (البقرہ : ۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا۔"

پھر انفرادی طور پر جو شخص جیسی بھی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ (الانعام : ۱۳۲)

"جو کچھ لوگ عمل کرتے ہیں ان کے درجات ہیں۔"

اس طرح اسلام نہ کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ اسے ایسے کسی کام پر مجبور کرتا ہے جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔

اسلام رفعت و ارتقاء کو انسانوں کے لیے پسندیدہ بناتا ہے مگر اس کے حصول پر انسان کو مجبور نہیں کرتا بلکہ اس کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ جس قدر وہ کوشش کرے آخرت میں اسے ثواب مل جائے۔ پھر یہ کہ اسلام کے پیرو دنیا ہی میں بدلہ مل جانے کی توقع نہیں رکھتے بلکہ دنیا میں دوسرے انسانوں سے محبت اور مغالبۂ نفس کی خوشی اور انبساط ہی کو کافی خیال کرتے ہیں۔

اسلام لوگوں کو بدلہ لینے کی اجازت دیتا ہے مگر معاف کر دینے کو خوب تر بتاتا ہے:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ (البقرہ : ۲۳۷)

"اگر تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

Marfat.com

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط (نور : ۲۲)

"کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے۔"

اسلام ملکیت کی اجازت دیتا ہے مگر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کو مستحسن قرار دیتا ہے۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں:

"میں ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ احد پہاڑ کے پاس سے گزرا تو آپؐ نے فرمایا: اے ابوذرؓ! اگر میرے پاس اس احد پہاڑ جتنی دولت ہوتی تو میں سب اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتا اور اسے پسند نہ کرتا کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہوتا تو میرے پاس صرف دو قیراط ہی ہوتے۔"

اسلام اقرار کرتا ہے کہ قتال، نفس کے لیے ایک ناگوار فریضہ ہے مگر وہ اللہ کے راستے میں شہید ہو جانے کو پسندیدہ بتاتا ہے اور اس کی انتہائی دلکش تصویر نفس انسانی کے سامنے رکھتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(توبہ : ۱۱۱)

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض کے میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں بھی اور انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے

Marfat.com

عہد کو کون پورا کرنے والا ہے؟ تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے اللہ سے معاملہ ٹھیرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔"

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (آل عمران : ۱۶۹ - ۱۷۱)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے انھیں اپنے فضل دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر فرحاں و شاداں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔"

اسلام زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دیتا ہے مگر اس امر کو پسندیدہ قرار دیتا ہے کہ لوگ دنیا کی آسائشوں میں کمی کریں اور روحانی نعمتوں کی جانب متوجہ ہوں :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ

Marfat.com

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ط (آل عمران : ۱۴ - ۱۵)

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو، میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقوٰی کی روش اختیار کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔"

گویا اسلام زبردستی کسی کام کے لیے نہیں کہتا بلکہ ہر عمل کو خوش دلی سے انجام دلاتا ہے۔ تربیتِ نفس میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ جو شخص خوش دلی سے کسی کام کو کرے گا اس میں اسے لذت محسوس ہوگی اور تکلیف و مشقت کا احساس جاتا رہے گا۔

اسی اسلامی تربیتِ نفس کا نتیجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ انسانیت کے اس بلند ترین مقام پر پہنچ گئے جہاں تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکا، پھر ان دونوں شخصیات نے نہ اخفاء (Repression) محسوس کیا اور نہ اپنے آپ کو دنیا کی ہماہمی سے منقطع کیا۔ کیوں کہ اخفاء سے رہبانیت اور نفسیاتی اور اعصابی اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ رہبان نہیں تھے بلکہ دونوں خلیفہ تھے اور سیاسی اور انتظامی اور جنگی معاملات کو سلجھا رہے تھے اور ساتھ ہی روحانی اعمال میں بھی معروف تھے۔ ظاہر ہے ان کے مضبوط، محکم اور متوازن اعمال میں اخفا اور اضطراب کا کوئی اثر نہیں بتلایا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں خلیفہ انسانیت کے اس بلند مقام پر اپنے ارادے اور شعور اور اپنی قوتِ صالحہ کی بناء پر پہنچے تھے۔

Marfat.com

توبہ کا دروازہ

ظاہر ہے تمام انسان انسانیت کے اس مقامِ بلند تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ بہت سے لوگ تو اپنے حالات اور ماحول کی بناء پر اور اپنے انسانی ضعف اور غلبۂ شہوات کی وجہ سے اس مقام تک بھی نہیں پہنچ سکتے جو اسلام نے ہر انسان کے لیے ضروری قرار دیا ہے — تو — کیا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی رحمتوں سے دُور کر دے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم ہے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اعم کو تباہ کر دینے والے احساسِ گناہ اور زندگی کو تلخ کر دینے والی خلش ضمیر میں مبتلا نہیں رہنے دیتا، بلکہ ان کے لیے درِ توبہ وا کر دیتا ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ
(المائدہ: ۳۹)

"جس نے زیادتی کے بعد توبہ کر لی اور اپنے نفس کی اصلاح کر لی، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔"

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ

(التوبہ: ۱۰۴)

"کیا انھیں علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے؟"

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۝ (مریم: ٦٠)

"مگر وہ جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور نیک کام کیے تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا۔"

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (الزمر: ۵۳)

"آپ کہہ دیجیے، اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔"

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کریم میں توبہ کا لفظ اپنے جملہ مشتقات

Marfat.com

کے ساتھ ۸۷ مرتبہ، مغفرت کا لفظ ۲۳۰ مرتبہ، اور رحمت، رحمٰن اور رحیم کے الفاظ ۲۸۰ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔

تاریخِ اسلامی کی تابناک مثالیں

نفسیات کے اس مکمل نظریئے اور نفس کی اس ہمہ گیر اصلاح اور محکم تربیت کے نتیجے میں صدرِ اسلام کی یہ عظیم شخصیات اور وہ عظیم کارنامے ظہور میں آئے جن سے تاریخ اسلامی بھری پڑی ہے اور جن کا ظہور وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ ان کارناموں پر عقلِ انسانی حیران ہے کہ کیا ایک گوشت پوست کے انسان میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ اس قسم کے کارنامے انجام دے سکے؟

ہم یہاں پر جنگی، تنظیمی اور سیاسی کارناموں کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ یہ کارنامے بڑی کثیر تعداد میں موجود ہیں اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، بلکہ ہم ان نفسیاتی کارناموں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ (کیونکہ یہی کارنامے ہمارے اس موضوع سے متعلق ہیں۔) ہم ان کارناموں کو اس لیے بیان کریں گے تاکہ فرائڈ کی تردید ہو جائے، کیوں کہ فرائڈ اور اس کے پیروکار یہ تصور کرنے سے عاجز ہیں کہ بغیر ذاتی مصلحت اور بغیر خارجی دباؤ کے بھی انسان میں کوئی شعور اُبھر سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے یہ تمام کارنامے اپنی ہی خوشی اور اپنی ہی رضا سے کیے گئے ہیں، ان میں سماج، مذہب اور قانون کے جبر و زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ان کارناموں کے انجام دینے والوں نے یہ اعمال بغیر کسی ذاتی مفاد کے ازخود اور بخوشی کیے ہیں۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ کارنامے صرف اسلامی نظام کے ساتھ خاص ہیں اور اس قسم کی مثالیں غیر اسلامی نظام میں بالکلیہ اور قطعاً نہیں پائی جاتیں۔ جی نہیں! ایسی مثالیں غیر مسلم اقوام میں بھی پائی جاتی ہیں جو خود اس امر کی دلیل ہیں کہ انسانیت بحیثیت اجتماعی اس بات پر قادر ہے کہ فرائڈ کی بنائی ہوئی مذ ورتوں میں سے

Marfat.com

کسی ضرورت کے بغیر ہی خیر کی جانب مائل ہو جائے ـــــ ہاں البتہ ہم یہ بات
پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ یہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت
ہے کہ اس نے اس قدر قلیل عرصے میں اس قدر کثیر تعداد میں اس قسم کی بیش بہا
مثالیں پیش کی ہیں

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوبکرؓ عظیم الشان نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے سربراہ متعین ہوئے
ہیں۔ آپ کے سامنے اس عظیم الشان اسلامی حکومت کے گوناگوں مسائل ہیں، مگر
ان مسائل میں اُلجھ کر آپؓ نے اپنے ان اعلیٰ ترین انسانی مشاعر سے گریز نہیں کیا، جن
مشاعر میں سے اگر کوئی ایک شعور بھی کسی شخص کے نفس میں گھر کر جائے تو اسے عام
انسانوں سے ممتاز بنا دے۔ چنانچہ آپ کی نیکی اور نرمی کی مثالیں بڑی مشہور ہیں، جن میں
سے ہم ایک مثال نقل کرتے ہیں جو بظاہر تو سادہ سی مثال ہے، مگر حضرت ابوبکرؓ
کے قلبِ مبارک کی کیفیات بڑی اچھی طرح اُجاگر کرتی ہے۔

جب آپ خلافت کے بعد گھر سے نکلے تو ایک لڑکی نے پکار کر کہا، اے
ابوبکرؓ، اب تو آپ خلیفہ بن گئے ہیں، آج سے تو آپ ہماری اونٹنیوں کا دودھ نہیں
نکالیں گے ـــ چونکہ آپؓ خلافت کی ذمہ داریاں ملنے سے پہلے اسی کی اونٹنیوں
کا دودھ نکالا کرتے تھے، تو خلافت ملنے کے بعد اس لڑکی کو خیال ہُوا کہ اب
اس کام کو کون کرے گا۔ اسی لیے اس نے آپ سے دریافت کیا۔ مگر آپ نے فرمایا
کیوں نہیں، مَیں ضرور اب بھی تمہاری اونٹنیوں کا دودھ نکالا کروں گا۔ چنانچہ آپ ہر
روز جا کر دودھ نکالا کرتے اور اس سے پوچھتے: دودھ پر جھاگ رہنے دوں یا الگ
کر دوں؟ اور جیسا وہ کہتی اسی طرح دودھ نکال دیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرؓ تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین شخصیت تھے، آپ کو ہرگز گوارا
نہ تھا کہ کھانے پینے یا رہن سہن میں عام مسلمانوں پر کسی قسم کی برتری اختیار کریں

Marfat.com

چنانچہ جس سال قحط پڑا تو حضرت فاروق رضؓ نے قسم کھالی کہ جب تک مسلمانوں پر فراخی کا دَور نہ آجائے گا وہ گھی استعمال نہیں کریں گے۔ ایک پورا سال آپ نے اسی تنگی سے گزارا۔ یہاں تک کہ صرف تیل کھانے کی بناء پر چہرۂ مبارک کی تروتازگی اور شادابی جاتی رہی۔ مسلمان آپؓ کی اس حالت پر افسردہ ہو کر آپ سے درخواست کرتے کہ آپ اپنے اخراجات کے لیے کچھ رقم بیت المال سے لے لیا کریں، مگر آپ نے اس تجویز کو منظور نہ فرمایا۔

حضرت عمرؓ آخر یہ مشقت کیوں برداشت کر رہے تھے؟ جبکہ اسلام نے اس مشقّت کا حکم نہ دیا تھا اور اسلامی معاشرہ تو آپ سے درخواست کر رہا تھا کہ آپ اس قدر تکلیف سے زندگی نہ گزاریں۔ درحقیقت اس کا محرک حضرت عمرؓ کا وہ حساس ضمیر تھا جس کی آپ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمائی:

> "رعایا کے حال کی مَیں اس وقت تک کیا پرواکر سکتا ہوں جب تک مَیں بھی اس حالت سے نہ گزروں جس حالت میں تمام لوگ گزر کر رہے ہیں"۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اقتصادی تنگی کا زمانہ تھا، حضرت عثمانؓ نے شام سے غلّہ منگوایا، مدینہ کے تاجر آپ کے پاس آئے تاکہ آپ سے غلّہ خرید کر اسے ذخیرہ کرلیں اور بعد میں نفع کما سکیں۔ چنانچہ ان تاجروں نے حضرت عثمانؓ کو غلہ کی دوگنی قیمت پیش کی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: "مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں"۔ تاجروں نے تین گنی اور چار گنی قیمت لگائی مگر آپ ہر مرتبہ یہی کہتے رہے کہ مجھے اس سے زیادہ مل رہے ہیں۔ اس پر تاجر بولے: مدینے کے تمام تاجر اس وقت آپ کے پاس موجود ہیں، ہم سے پہلے تو کوئی آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپؓ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے دس گنا زیادہ نفع دیا ہے، اور یہ کہہ کر سارا غلّہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

اگر حضرت عثمانؓ صرف اپنی خرچ کی ہوئی رقم بھی لے لیتے تب بھی کوئی

Marfat.com

مضایقہ نہ تھا بلکہ یہ بھی ایک کارِ عظیم ہوتا، مگر آپ نے اس مرتبہ سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ اختیار فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ مذہب، معاشرہ یا کسی خارجی قوت نے حضرت عثمانؓ کو اس ایثار پر مجبور نہیں کیا تھا، بلکہ آپ نے جو کچھ کیا اپنی خوشی اور اپنی رضا سے کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کسی جنگ میں حضرت علیؓ ایک کافر پر غالب آ گئے اور سینہ پر بیٹھ کر تلوار نکال لی، پھر اچانک اُتر کھڑے ہوئے اور اسے آزاد کر دیا۔ مسلمانوں نے کہا اے علی، آپ نے اس اللہ کے دشمن کو کیوں چھوڑ دیا؟ فرمایا: جب میں اسے قتل کرنے والا تھا تو اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں میں اسے اللہ کے لیے قتل کرنے کے بجائے اپنے نفس کے لیے قتل نہ کر دوں۔ آخر کس شے نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا تھا۔ یہ ضمیر کی پاکیزگی اور طہارتِ نفس تھی جس کی بناء پر یہ کارنامہ ظہور میں آیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ مقرر ہوئے تو آپ نے منادی کرائی کہ لوگ مسجد میں جمع ہو جائیں۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات خاندانِ بنو اُمیہ کو عطیات دیتے رہے ہیں جو نہ ہمیں لینا جائز تھے اور نہ آپ کو دینا روا تھے، اب وقت یہ تمام عطیات میری ملکیت میں ہیں اور ان کا حساب مجھے خدا کے سوا کسی کو نہیں دینا ہے۔ اس لیے اب میں یہ ساری رقمیں واپس کرتا ہوں اور یہ واپسی میں اپنے گھر سے شروع کرتا ہوں۔ مزاحم پڑھنا شروع کرو۔ مزاحم پہلے ہی ان عطیات سے متعلق تحریرات لے کر آ چکے تھے۔ چنانچہ وہ ایک ایک تحریر پڑھتے جاتے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اسے قینچی سے کاٹتے جاتے، یہاں تک کہ سب تحریرات پھاڑ دیں اور صرف آپ کا اپنا ذاتی حصہ رہ گیا۔ سب کچھ واپس کر دینے کے بعد اپنی بیوی (فاطمہ) کی طرف متوجہ ہوئے (جن کے پاس ان کے باپ کے دیے ہوئے کچھ بیش قیمت زیورات تھے) اور ان سے کہا: یا تو یہ سارا زیور

Marfat.com

تم بیت المال میں دے دو یا مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو، کیوں کہ مَیں اور سونا ایک گھر میں نہیں رہ سکتے"۔ آپ کی بیوی نے بخوشی زیور بیت المال کو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میرے پاس اس سے کئی گنا زیادہ زر و دولت بھی ہوتا تو بھی مَیں اس پر آپ ہی کو ترجیح دیتی۔ غرض آپ کے حکم سے سارا زیور بیت المال میں جمع کرا دیا گیا۔ جب حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز انتقال کر گئے اور یزید بن عبدالملک خلیفہ بنا تو اس نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا: "اگر تم چاہو تو اپنا زیور واپس لے لو"۔ مگر حضرت عمرؒ کی بیوی نے فرمایا: "مجھے نہیں چاہیے، جس شے کو میں نے آپ کی زندگی میں اپنی خوشی سے دیا ہے اسے آپ کے مرنے کے بعد کیوں کر واپس لے لوں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔[1]

جس دولت سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ دست بردار ہوئے، قانونی طور پر آپ کے لیے جائز تھی، معاشرہ بھی آپ سے اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا بلکہ کسی کے ذہن میں بھی اس قسم کی کوئی بات نہ تھی۔ مگر آپ نے اس مثالی کردار کو انجام دیا۔

اس مقام پر جہاں حضرت عمرؒ نے بہترین کردار اور ایسا اعلیٰ نفسیاتی کارنامہ پیش کیا جو تاریخ میں یکتا اور بے مثال ہے اور جس کا محرک کوئی ذاتی جذبہ اور مفاد نہ تھا بلکہ صرف آپ کی بیداریٔ ضمیر اور فزوں تر حساسیت ہی اس کا واحد سبب تھا وہاں آپ کی اہلیہ نے بھی جس فراخ دلی اور عظمتِ نفس کے ساتھ اپنے زیورات بیت المال کو واپس کیے وہ بھی ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس کا تعلق دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے شعور سے ہے کسی خارجی اور جبری دباؤ سے نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتیں تو حضرت عمرؒ کی وفات کے بعد اپنے زیورات واپس لے سکتی تھیں وہ آپ کو مل سکتے تھے بلکہ خود آپ کے بھائی نے آپ کو پیش کر دیے تھے، مگر ان سب باتوں کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ عورتوں کے دلوں میں زیورات کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے، آپ نے ان زیورات کے واپس لینے سے انکار کر دیا۔

---

[1] عمر بن عبدالعزیزؒ۔ پروفیسر احمد زکی صفوت۔

Marfat.com

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت خالدؓ بن ولید جو اسلامی لشکر کے قائد تھے، اور جنھوں نے کبھی شکست و ہزیمت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا، ایک جنگ کے دوران میں حضرت عمرؓ کی جانب سے ان کی معزولی کا حکم آجاتا ہے مگر آپؓ اس حکم پر کوئی ناگواری نہیں محسوس کرتے۔ نہ آپ اپنے فوجی مقام اور مرتبے کے تحفظ کے لیے جنگ سے کنارہ کشی اختیار فرماتے ہیں اور نہ ہی خلیفہ پر کوئی تنقید کرتے ہیں، حالانکہ آپ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے جس پر آپ کو معزول کیا جائے۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت خالدؓ فوراً کسی کو میرلشکر مقرر کرتے اور خود علیحدہ ہو کر گھر جا بیٹھتے، مگر اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگر خالد اپنی جگہ سے ہٹتے تو شکست ہو جاتی۔ چنانچہ آپ نے کسی کو مطلع نہیں کیا اور بدستور لشکر کی قیادت کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو سربلند کیا اور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے قائدِ لشکر کا اعلان کیا اور خود بطور ایک سپاہی کے لشکر میں شامل رہے۔

قیادت سے معزولی کے بعد بھی حضرت خالدؓ لشکر میں شامل رہے ظاہر ہے اس کی وجہ وہ شوقِ جہاد اور جذبۂ شہادت تھا جو ان کے نہاں خانۂ قلب میں جاگزیں تھا، اور یہ ایسا واقعہ تھا جو یقیناً آپ کے تمام جنگی کارناموں سے بھی زیادہ اہم ہے، اور اس قدر عظیم اور اس قدر تابناک ہے کہ اس کے سامنے تاریخِ عالم کے تمام جنگی کارنامے حقیر اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔

ابو محجن ثقفیؓ

ابو محجن ثقفیؓ جو فتح فارس میں مسلمانوں کے ہیرو اور قائد عظیم تھے، زمانۂ جاہلیت میں شراب نوشی کیا کرتے تھے اور اسلام کے بعد شراب کے بارے میں اشعار گنگنایا کرتے تھے۔ ان کی اس حرکت پر سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اپنے گھر میں قید کر لیا تھا تاکہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔ ان کی اسی قید و بند کے دوران میں حضرت سعدؓ جہادِ فارس کے لیے

Marfat.com

روانہ ہوگئے، مگر بیمار ہو کر گھر واپس آگئے اور جہاد میں عدمِ شرکت پر اظہارِ افسوس کرتے رہے۔ ابو محجنؓ نے ان سے درخواست کی کہ وہ انھیں رہا کر دیں تاکہ وہ جہاد میں شریک ہو سکیں مگر حضرت سعدؓ نے انکار کر دیا۔ انھوں نے بار بار اصرار کیا مگر حضرت سعدؓ نے ایک نہ سُنی۔ اس کے بعد ابو محجنؓ نے مجبور ہو کر حضرت سعدؓ کی بیوی سے درخواست کی کہ انھیں جانے دیں، اور اگر وہ جنگ میں شہید نہ ہوئے تو شام کو خود آکر اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال لیں گے۔ حضرت سعدؓ کی اہلیہ کو ان پر رحم آگیا اور انھوں نے ان کو جانے کی اجازت دے دی۔ ابو محجنؓ حضرت سعدؓ کا گھوڑا لے کر روانہ ہو گئے اور میدانِ جنگ میں پہنچ کر دشمن پر ایسا بھرپور وار کیا کہ مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ شام کو آکر پھر اپنے پیروں میں زنجیریں ڈال لیں۔ اسی طرح تین دن کرتے رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی۔

ادھر حضرت سعدؓ میدانِ جنگ کا نقشہ اپنی آرام گاہ کے دریچے سے دیکھا کرتے تھے۔ فتح کے بعد اپنی اہلیہ سے فرمانے لگے: "ایک شاہسوار بڑے شاندار طریقے پر جنگ کرتا رہا۔ اگر ابو محجنؓ میری قید میں نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ ابو محجنؓ ہے۔" اس پر آپ کی اہلیہ نے آپ کو سارا واقعہ سنا دیا۔ یہ واقعہ سن کر حضرت سعدؓ نے ابو محجنؓ کو بلایا اور فرمایا: "جا میں نے تجھے آزاد کیا اور اب اس وقت تک تیری کہی ہوئی باتوں پر گرفت نہیں کروں گا جب تک تو انھیں کر نہ گزرے۔" ابو محجنؓ بولے، "اب میں بھی کبھی کوئی غلط بات زبان سے نہیں نکالوں گا۔"

عقیدۂ اسلامی نے ابو محجنؓ کے دل میں یہ نفسیاتی جرأت پیدا کر دی تھی ورنہ وہ جب قید تھے تو ان پر جہاد میں شرکت لازم نہ تھی، اور جب چلے گئے تھے تو از خود واپس آکر پابہ زنجیر ہو جانا یقیناً ایک بہت بڑی نفسیاتی جرأت تھی۔

Marfat.com

یونس بن عبید

یہی نہیں تھا کہ اس قسم کے عظیم کارنامے اور پاکیزگی اور بلند کرداری کے نمونے صرف خلفاء نے اور جنگی قائدین ہی نے پیش کیے ہوں، بلکہ اس قسم کی مثالیں مسلمان معاشرے میں عام طور پر سامنے آتی تھیں۔

یونس بن عبید عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان تھے، حُلّے (عباء) فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس کچھ حُلّے چار سو روپے کے تھے اور کچھ دو سو روپے کے۔ ایک روز آپ اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر نماز کو چلے گئے۔ ایک دیہاتی آیا، اس نے کہا کہ ایک چار سو والا حُلّہ بتا دو۔ انھوں نے دو سو والا بتا دیا۔ دیہاتی نے بخوشی خریدا اور چل دیا۔ راستہ میں یونس بن عبید ملے، انھوں نے دیہاتی سے پوچھا: "کتنے میں لیا؟" اس نے کہا "چار سو میں"۔ یونس نے کہا "یہ دو سو سے زیادہ کا نہیں، آؤ میں تمہیں تمہاری رقم واپس دلا دوں"۔ دیہاتی نے کہا "نہیں، میں نے اپنی خوشی سے لیا ہے اور ہمارے ہاں تو یہ پانچ سو کا آتا ہے"۔ مگر یونس بولے "ایک مسلمان کی خیر خواہی ساری دنیا کی دولت سے بڑھ کر ہے"۔ پھر اسے دکان پر لائے اور دو سو روپے واپس کرائے۔ اور اپنے بھتیجے سے کہنے لگے، "تمہیں نہ تو شرم ہی آئی اور نہ کچھ خوف خدا محسوس ہوا، اتنا نفع لیا جاتا ہے؟ کیا مسلمان کی خیر خواہی نہیں کرنی چاہیے؟" بھتیجے نے کہا کہ یہ اس نے اپنی مرضی سے لیا ہے۔ اس پر یونس بن عبید نے فرمایا: "تو کیا تم اس کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرو گے جو اپنے لیے پسند کرتے ہو"[1]

ماعزؓ بن مالک

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریمؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے: "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے پاک کر دیجیے"۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ اور اللہ سے استغفار کرو"۔ جب اسی طرح چار مرتبہ ہوا تو نبی کریمؐ

---

[1] الرسالۃ الخالدہ، پروفیسر عبدالرحمٰن عزام۔

Marfat.com

نے پوچھا: "کس بات سے پاک کر دوں؟" کہنے لگے "زنا سے"۔ نبی کریمؐ نے لوگوں سے پوچھا: "کیا یہ مجنون ہے؟" لوگوں نے بتایا: نہیں مجنون نہیں ہیں، آپؐ نے استفسار فرمایا: "کیا اس نے شراب پی ہے؟" کسی نے آگے بڑھ کر منہ سونگھا اور بتایا کہ شراب بھی نہیں پی ہے۔ پھر نبی کریمؐ نے پوچھا: "کیا تو نے زنا کیا ہے؟" کہنے لگا "جی ہاں"۔ اس پر آپؐ نے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ تیسرے روز نبی کریمؐ نے فرمایا: "ماعزؓ کے لیے استغفار کرو اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر میری ساری امت میں تقسیم کر دی جائے تو سب کو کافی ہو جائے"۔

پھر آپؐ کے پاس ایک ازدی عورت آئی اور کہنے لگی: "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے پاک کر دیجیے"۔ آپؐ نے فرمایا: "جا اور اللہ سے توبہ کر"۔ اس نے کہا: "آپؐ مجھے بھی ماعزؓ کی طرح واپس کرنا چاہتے ہیں۔ میں زنا سے حاملہ ہوں"۔ فرمایا: "جاؤ بچے کی پیدائش کے بعد آنا"۔ ایک انصاری نے بچے کی پیدائش تک اس کی کفالت کی اور بچے کی پیدائش کے بعد نبی کریمؐ کو آکر بتایا۔ آپؐ نے فرمایا: "ابھی بچہ چھوٹا ہے، اسے دودھ کون پلائے گا؟" ایک انصاری نے اس کی ذمے داری لے لی، اور آپؐ نے عورت کے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: بچے کی پیدائش کے بعد آنا، جب پیدائش کے بعد وہ آئی تو آپؐ نے فرمایا: "جاؤ اسے دودھ پلاؤ۔ جب دودھ چھڑا چکو جب آنا"۔ چنانچہ دودھ چھڑانے کے بعد وہ بچے کو ساتھ لے کر آئی۔ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، اس عورت نے عرض کیا: اے رسول خدا! میں نے بچے کا دودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ روٹی کھانے لگا ہے: آپؐ نے بچہ لے کر ایک انصاری کے حوالے کر دیا، پھر ایک گڑھا کھود کر اس میں اسے کھڑا کیا گیا اور سنگسار کر دیا گیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک پتھر اس کے سر پر مارا، جس سے خون کا چھینٹا ان کے چہرے پر آگرا، جس پر انھوں نے اس عورت

Marfat.com

بُرا بھلا کہا تو رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: "خالد ٹھہر جاؤ، اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کوئی ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اس کی بھی مغفرت ہو جاتی۔" پھر آپؐ نے اس کی نماز پڑھائی اور اسے دفن کر دیا گیا۔

حضرت ماعزؓ کے واقعے میں یہ گنجائش ہے کہ کوئی شخص فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں یہ اعتراض کر سکے کہ یہ ایک قسم کا مذہبی جنون تھا، شاید نبی کریمؐ نے اسی لیے سوال فرمایا کہ کیا یہ مجنون ہے؟ مگر اس واقعے کے جملہ حالات بتا رہے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں مستقیم (Normal) حالت میں تھے۔

اپنے جرم کا یہ بھرپور شعور فرائڈ کے اس احساسِ گناہ سے مختلف ہے جو لاشعور میں پنہاں ہوتا ہے اور سزا کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے، یا خود اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ مگر حضرت ماعزؓ اور غامدیہؓ نے خلشِ ضمیر سے بچنے کے لیے خود اپنے آپ کو سزا نہیں دی، بلکہ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تاکہ آپؐ کے حکم کے مطابق توبہ کریں اور اللہ سے استغفار کریں — یہ بہرحال بلند ایثار اور پاکیزگیٔ ضمیر کا ایک انتہائی اعلیٰ نمونہ تھا۔

صلاح الدین ایوبیؒ

بلاشبہ یہ سب مثالیں مسلمانوں کے دورِ اوّل سے متعلق ہیں، مگر فی الواقع اس قسم کی مثالیں بعد کے ادوار میں بھی سامنے آتی رہی ہیں۔

صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبی قیدیوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا، اس کے خود عیسائی بھی معترف ہیں، اور آج تک یوروپ میں صلاح الدین کی انسانیت دوستی کے واقعات سنائے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صلیبی، مسلمانوں پر عذابِ الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ وہ خدا کے گھر میں مسلمانوں کو اس طرح قتل کرتے تھے کہ خون کے حوض بھر جاتے تھے۔ اگر

Marfat.com

مسلمان چاہتے تو وہ بھی اپنا بدلہ اسی طرح لے سکتے تھے جب کہ اس کی اجازت اسلام نے بھی دی ہوئی ہے: "قصاص میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پنہاں ہے"۔ اور "جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی قدر زیادتی کرو" مگر صلاح الدین کے پاس ایک بیمار قیدی آیا، تو انھوں نے اس کی تیمار داری کی اور رات بھر اس کے لیے جاگتے رہے۔

شیخ بدوانیؒ

غرض جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان رہے اور ان کے دلوں کی دنیا میں اسلام پوری طرح آباد رہا، اس قسم کی مثالیں صفحۂ تاریخ پر ابھرتی رہیں۔

شیخ بدوانیؒ پر ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ ایک انگریز حاکم ان کا شاگرد تھا، اس نے کہلا کر بھیجا کہ شیخ، الزامِ بغاوت سے انکار کر دیں تو میں رہا کرا دوں گا۔ آپ نے فرمایا: میں تو جنگِ آزادی میں شریک رہا ہوں، میں کیسے انکار کر دوں؟ پھر عین پھانسی کے وقت اس حاکم نے روتے ہوئے درخواست کی کہ اگر آپ اب بھی اس الزام سے انکار کر دیں تو رہا کرا دوں گا۔ آپ نے فرمایا: "تم چاہتے ہو کہ میرے اعمال ضائع ہو جائیں، میں جنگ میں شریک ہوا ہوں، جو تمہارا جی چاہے کرو۔" غرض آپ کو پھانسی دے دی گئی۔[1]

اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بہت کثیر تعداد میں ملتی ہیں، جو اس بات کی گواہ ہیں کہ اسلامی نظام نفسِ انسانی کی صحیح خطوط پر تربیت کرتا ہے اور اس تربیت کے زیرِ اثر نفس ارتقاء کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ جاتا ہے۔

---

[1] "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" سید ابوالحسن علی ندوی

Marfat.com

Marfat.com

فرد اور معاشرہ

فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق جس طرح علمِ اجتماعیات (Socialogoy) کا اہم موضوعِ گفتگو ہے، اسی طرح یہ تعلق علمِ نفسیات کے بھی اساسی مباحث میں سے شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ جب تک انسانی وجود کے اس اہم اور اصل جزء کو زیرِ بحث نہ لایا جائے اس وقت تک نفسِ انسانی کا حقیقی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ریاستیں اور اقوام اس موضوع کے بارے میں جدا جدا نظریات اور ان کی تطبیق (Application) کی علیحدہ علیحدہ صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اقوامِ عالم کا اختلافِ رائے بالکل فطری ہے، کیونکہ قومیں جس زاویۂ نگاہ سے اس مسئلے کا جائزہ لیتی ہیں وہ بھی مختلف ہوتا ہے، اور جو مقصد ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے اس میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔

چنانچہ انفرادیت پسند ماہرینِ نفسیات ہمیشہ معاشرے کو فرد (Individual) کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اور فرد کو اس حیثیت سے مبالغہ آمیز اہمیت دیتے ہیں کہ اس کی دوسرے افراد سے جدا اپنی مستقل شخصیت ہے اور اس امر پر شدید اصرار کرتے ہیں کہ سماج کے خلاف بغاوت کرنے والے فرد کو سرزنش کرنے کا سماج کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اس کے برعکس کلیت پسند ریاستیں (Totalitarian States) فرد کی قیمت گھٹانے میں مبالغے سے کام لیتی ہیں اور فرد کو ایک ایسا حقیر و بے کار ذرہ خیال کرتی ہیں جس کا سوسائٹی کے بغیر کوئی وجود متصور نہیں ہو سکتا۔

دونوں ہی نظریات معیوب حد تک انتہا پسندانہ ہیں، کیوں کہ جس فرد

Marfat.com

کا اپنے نفس اور اپنی ذات کے بارے میں احساس اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ دوسرے افراد کے وجود کو بالکلیہ فراموش کردے اور جو معاشرہ فرد کے کسی مستقل وجود ہی کو تسلیم نہ کرے، یہ دونوں ہی پہلو اشیاء کی طبیعت سے ناواقفیت اور اہم نفسیاتی حقیقت سے غفلت پر مبنی ہیں۔

فرد اور معاشرے کے درمیان خطِ فاصل

قابلِ غور بات یہ ہے کہ فی الحقیقت معاشرہ کیا شے ہے؟ اور وہ باریک سی لکیر کون سی ہے جو فرد کو معاشرے سے جدا کرتی ہے؟ حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کی علیحدگی کا تصور ایک عجیب سا تصور ہے جو صحیح علمی بحث کے ذریعے ثابت نہیں ہوتا۔ فرد اور معاشرے کے بارے میں اس طور پر بحث کرنا کہ گویا یہ دونوں علیحدہ علیحدہ قوتیں ہیں، یا دو متحارب لشکر ہیں، یہی طریقۂ بحث دراصل نفسیات کا ایک ایسا عیب ہے جس کی بنا پر کچھ ایسے حالات اور صورتوں کو فرض کرنا پڑتا ہے، جن کا سرے سے کوئی واقعی وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے 'تنقیدی ادب' میں لفظ اور معنی پر اس طرح بحث کرتے ہیں، جیسے یہ دونوں جدا جدا اشیاء ہوں اور ہر ایک کا اپنا ایک مستقل وجود ہو۔

کوئی بھی شخص معاشرے کے مقابلے میں اپنا علیحدہ اور مستقل وجود رکھنے والا فردِ خالص نہیں بن سکتا سوائے اس کے کہ ہم اپنے ہی ذہن میں کسی ایسے فرد کا وجود تسلیم کرلیں جو اپنے جسم، اپنے تمام افکار اور اپنے جملہ معاملات میں معاشرے سے بالکلیہ جدا ہو، جو ظاہر ہے کہ ایک امرِ محال ہے اور عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے حتیٰ کہ دماغی امراض کے شفاخانوں میں بھی یہ جنس ناپید ہوگی۔

معاشرہ بدیہی طور پر متعدد افراد کے مجموعے ہی کا نام ہے۔ اس لیے الٰہی کسی معاشرے کا وجود کیونکر ممکن ہو سکتا ہے جو فرد کے وجود سے علیحدہ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہو، حالانکہ فرد ہی وہ اکائی ہے جس سے معاشرے کا مجموعہ

Marfat.com

تشکیل پاتا ہے۔

دنیائے نظریات میں تو کسی مستقل فرد کے وجود کا تصور کیا جا سکتا ہے یا ایسے معاشرے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے جو فرد کے ذاتی وجود سے علیحدہ ہو، مگر فی الواقع اور عملی طور پر اس عجیب تفریق کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ یہ تفریق عقلاً محال ہے۔

صورتِ واقعہ اور امرِ محسوس یہ ہے کہ ہر فرد اپنا مستقل جداگانہ وجود رکھنے کے ساتھ ساتھ جماعت کا بھی ایک جزو ہے اور دنیائے عمل میں کوئی ایسا لمحہ، کوئی ایسا تصور اور کوئی ایسا عمل وقوع پذیر نہیں ہوتا جس میں فرد صرف اپنی ایک صفت کو بروئے کار لائے اور دوسری سے بالکلیہ کٹ جائے، اگرچہ ذہنی طور پر اس قسم کی صورت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

معاشرہ : فرد کی ایک نفسیاتی ضرورت

انسان جس وقت غاروں کی تنہا زندگی سے باہر آیا، اسی وقت معاشرہ تشکیل پا گیا۔ بلکہ یہ کہیئے کہ معاشرہ تو اس سے پہلے غاروں ہی میں تشکیل پا چکا تھا، اور اس وقت تشکیل پا چکا تھا جب روئے زمین پر دو انسان وجود میں آئے تھے اور ان کے درمیان مخصوص تعلقات استوار ہوئے تھے۔ اس وقت بھی کوئی فرد اپنے جسم، اپنے شعور، اپنے افکار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے مکمل طور پر دوسرے فرد سے جدا اور منفصل نہ تھا۔

غرض یہ کہ اس قسم کے جداگانہ اور منفصل فرد کا کوئی وجود نہیں ہے، حتیٰ کہ کہانیوں میں بھی نہیں جن میں کسی دور دراز جزیرے میں گھرے ہوئے کسی فرد کا ذکر ہوتا ہے کیوں کہ ان میں بھی اس کے ساتھ جنوں اور دیگر مخلوقات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ گویا کہانیوں میں بھی اس ثابت شدہ حقیقت (Established Fact) کو تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان کا ایک مستقل اور جداگانہ فرد کی حیثیت میں وجود نہیں ہے —— بس یہ سمجھیے کہ جس وقت انسان وجود میں آیا اسی وقت معاشرہ

Marfat.com

وجود میں آگیا کیونکہ نوع انسانی کے افراد مکمل طور پر علیحدہ نہیں رہ سکے بلکہ ان پر یہ شدید ترین جذبہ غالب آگیا کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ اس لحاظ سے معاشرہ فرد کے نفس سے ابھرنے والی نفسیاتی ضرورت ہے جو اس شدید خواہش سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ اب خواہ اس شدید خواہش کی وجہ تنہا رہ جانے کا خوف ہو، یا پھاڑ کھانے والے جانوروں کا ڈر ہو، یا نامعلوم طبعی قوتوں سے خطرہ ہو، یا اس شدید خواہش کی وجہ انسان کا یہ احساس ہو کہ اس کے دوسرے انسانوں کے ساتھ اشتراک میں جو مفادات ہیں وہ تنہا رہنے میں نہیں ہیں، یا اس کی وجہ جنسی جبلت (Sexual Instinct) ہو، یا گروہی جبلت (Herd Instinct) غرض کوئی سی بھی جبلت ہو یا کوئی بھی وجہ ہو، حاصل یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسا فطری دباؤ موجود ہے جس نے فرد کے ضمیر سے معاشرے کو ظہور بخشا ہے۔

یہ سماجی جذبہ ہر اس جذبے سے زیادہ طاقت ور ہے جو سماجیت کے برعکس ہو۔ یہ انسان کے اپنی مستقل ذات کے شعور سے بھی زیادہ طاقتور ہے، یہ ان تنازعات سے بھی زیادہ طاقت ور ہے جو مختلف مفادات رکھنے والے افراد کے اجتماع سے پیدا ہوتے ہیں، یہ ہر فرد کی اس خواہش سے بھی زیادہ طاقت ور ہے کہ صرف اسے ہی تمام انسانوں پر مطلق بالادستی حاصل ہو، بلکہ اسے عناصرِ طبیعت پر بھی کنٹرول حاصل ہو جائے ــــ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سماجی جذبہ ان متضاد خواہشوں کے بالمقابل نہ ٹھیر پاتا، اور یہ نہ ہوتا کہ اس جذبے کے خلاف تمام متضاد خواہشات بتدریج اس جذبے کے سامنے سرنگوں ہوتی جائیں اور سماجیت انھیں مہذّب بنا کر اور ان کی تیزی اور تندی دُور کر کے اپنے ساتھ چلنے کے قابل بنا لے۔

معاشرے کی ابتداء

بلاشبہ یہ بات تو یقینی طور پر ہوتی ہے کہ انسانی معاشرہ ابتدائً بہت

Marfat.com

ہی تنگ سے دائرے میں اور بہت ہی سادہ سی شکل میں وجود میں آیا ہے۔ اس کی سادہ شکل یہ تھی کہ ایک شوہر، ایک بیوی اور اولاد پر مشتمل خاندان، وہ اوّلین انسانی مجموعہ تھا جس میں گروہی جبلت (Herd Instinct) مستقل انفرادی جبلتوں پر غالب آئی اور ان کو اپنا تابع فرمان بنالیا۔ اسی وقت سے جب سے خاندان وجود میں آیا، فرد کے بجائے خاندان ہی اکائی (Unit) بن گیا۔ اور باوجودیکہ فرد کا ایک مستقل شخصیت کی حیثیت میں تشخص محفوظ تھا مگر اس میں اسی وقت جماعت کا ایک ممبر ہونے کی صفت بھی نمایاں ہو گئی اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ صرف اپنی ایک ہی صفت کے ساتھ کچھ محسوس کرے، یا سوچے یا عمل کرے، بلکہ اس کا ہر فکر و عمل اور ہر احساس بیک وقت ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو گیا۔ چنانچہ جب کوئی فرد شکار کو نکلتا تو وہ شکار اپنی بیوی اور بچوں کے لیے کرتا۔ گویا جس وقت وہ جنگلوں میں گھس کر اور وحشی جانوروں سے مقابلہ کر کے شکار کرتا اس وقت اس کے قلب و دماغ میں دوسرے اشخاص بھی موجود ہوتے۔ اور جس وقت وہ ایک فرد کی حیثیت میں اپنی جسمانی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کرتا ہے، اس وقت بھی اس عمل کے نتیجے میں اولاد پیدا ہوتی ہے، یعنی اس کے نفس اور جسم کے خارجی لوازم وجود میں آتے ہیں اور اس طرح اس کا وجود دوسروں میں شامل اور دوسروں کا وجود اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس چھوٹے سے سماج کے مجموعی نفوس کو ایک دوسرے سے ممیز و منفصل کرنا ممکن نہیں رہتا۔

طبعی طور پر ایک بڑے سماج کی تشکیل کے لیے ایک خاندان کے دوسرے خاندان میں ملنے کا مرحلہ بعد ہی میں آیا اور مکمل استقلال اور اقتدار کے لیے ہر خاندان کی جبلت پر مشترک مصلحت اور مفادِ عام غالب آ گئے اور ہم آہنگ ہونے والی یا متصادم ہونے والی اکائی (Unit) فرد کے بجائے خاندان بن گیا۔ مگر خاندان ایک اکائی اپنے تمام افراد کے وجود کے ساتھ بنا، یعنی خاندان کا وجود ان افراد

Marfat.com

کا مرہون منت ہوا جو اس خاندان میں موجود ہیں جبکہ ان افراد کا اپنا مستقل وجود بھی برقرار رہا۔

معاشرے کا پھیلاؤ اور اس کی ہمہ گیری

پھر جس قدر لوگوں کے مفادات ہم آہنگ ہوتے گئے معاشرے کا پھیلاؤ بڑھتا گیا اور سماج ترقی کرتا گیا، کیوں کہ لوگ یہ سمجھ کر کہ سماج میں مل کر ان کا مشترک فائدہ ایک فرد، یا ایک خاندان کی حیثیت میں حاصل ہونے والے فائدے سے زیادہ ہے، وہ اپنی انفرادی خواہشوں پر سماجی مفادات کو ترجیح دیتے رہے ہے، جس کے نتیجے میں قبائل، قومیں اور نسلیں وجود میں آئیں۔ سماجی ترقی اسی مقام پر آکر رک نہیں گئی ہے بلکہ اب انسانیت ایک ایسے ہمہ گیر انسانی معاشرے کی جویا ہے جس میں روئے زمین کے تمام باشندے برادرانہ رشتے میں پروئے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ انسانیت کا یہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا مگر انسانیت اس قسم کا معاشرہ وجود میں لانے کی کوشش میں تو ہے، یا کم از کم یہ انسانیت کی ایک ایسی آرزو تو ہے جس سے اس کے اصل رُخ کا پتہ چلتا ہے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ سماجی ارتقاء کے ان تمام حالات میں فرد کے ساتھ اس کی یہ دونوں صفات پیوست رہیں —— اس کی فردِ مستقل ہونے کی صفت اور اس کی مجموعۂ افراد میں سے ایک فردِ ہونے کی صفت —— مگر فرد کی دوسری صفت زیادہ وسیع ہوتی گئی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ اس کا پھیلاؤ فرد کے نفس کے وسیع پہلوؤں پر چھاتا چلا گیا اور فرد کے جذبات اور میلانات خالص انفرادیت سے کنارہ کش ہو کر اسی دوسری صفت سے قریب ہوتے گئے، یہاں تک کہ شدید ترین انفرادی لمحات میں بھی انسان کے بس میں یہ بات نہیں رہی کہ وہ دوسرے افراد سے جدا علیحدہ وجود بن جائے اور اس کے قلب و شعور کی دنیا میں سماج

Marfat.com

کی کوئی جھلک باقی نہ رہے۔

تاریخ انسانیت کی طویل مدتوں میں وقوع پذیر ہونے والا یہ سماجی ارتقاء انسانیت کے اُن بے شمار تجربات کا نتیجہ ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر پیش آتے رہے اور اس کے نفس اور اس کے ذہن پر اثرانداز ہو کر اپنی تہیں جماتے رہے۔ یہ سماجی ارتقاء انسان پر باہر سے مسلّط نہیں کیا گیا بلکہ یہ اس طاقت ور اور گہرائی میں اتری ہوئی جبلّت کا جواب (Response) ہے جو انسان کو دوسرے انسان سے ملنے پر مجبور کرتی ہے اور اس ملاپ میں اسے راحت ملتی ہے۔

انسان : ایک مجموعۂ اضداد

اس مقام پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہی صورت حال ہوتی اور فرد کا اپنے دیگر بنی نوع انسان سے ملنے کا شدید ترین میلان ہی معاشرے کو وجود بخشتا تو فرد میں معاشرے کو توڑنے پھوڑنے اور سماج کے احکامات اور ممنوعات کی خلاف ورزی کرنے کا جذبہ نہ ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان مجموعۂ اضداد ہے اور اس میں ایسی مختلف اور متضاد خواہشات پائی جاتی ہیں جو بیک وقت تکمیل پذیر نہیں ہو سکتیں۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اجتماعیت کی خواہش کے بالمقابل انفرادی خواہشیں مغلوب ہو کر رہ گئیں اور سماج نے رفتہ رفتہ انفرادی خواہشوں کی کانٹ چھانٹ کر کے انھیں اپنے سے ہم آہنگ کر لیا۔ مگر بہرحال یہ انفرادی خواہشیں فرد کے نفس سے بالکلیہ ملیامیٹ نہیں ہو گئیں اور نہ ان خواہشوں کا جڑ سے اکھاڑ دینا ممکن تھا اور نہ ایسا کرنا سماج کے مفاد میں تھا۔ کیونکہ اگر معاشرے کی خاطر فرد کو کچل دیا جائے تو بالآخر فرد کی موت اس سماج کے لیے بھی پیغامِ اجل بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ مردہ افراد سے جنم لینے والے معاشرے کی رگوں میں زندگی کا گرم لہو نہیں دوڑ سکتا۔

Marfat.com

بہرحال شدید اجتماعی خواہش کے ساتھ ساتھ انسان میں انفرادی خواہشیں بھی موجود ہیں۔ اور اگر یہ تضاد ہے تو پھر یہ تضاد نفسِ انسانی میں اسی طرح موجود ہے جس طرح اس میں محبت و نفرت، خیر و شر اور ترقی کی خواہش اور تنزّل کا میلان موجود ہے۔

انسانی وجود ایک نو بہ نو بدلنے والی مخلوق ہے۔ جس طرح انسان اپنے جسم کو حرکت دیتا ہے تاکہ آرام پا سکے اور تاکہ اس کے نشاطِ عمل میں نیا پن آ سکے، اسی طرح اس کے نفس میں بھی مسلسل تنزّل و ترفّع اور الٹ پھیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ انسان کبھی اپنی انفرادی خواہشوں پر لبّیک (Response) کہتا ہوُا اس قدر دور نکل جاتا ہے کہ اسے دوسروں کے وجود سے تنگی محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ ابتدائے انسانیت کے دَور کی طرح یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ اسے تمام دوسرے لوگوں پر مکمل بالادستی حاصل ہو جائے اور یہی نہیں بلکہ طبعی قوتیں بھی زیر اثر آجائیں۔ اور کبھی انسان اجتماعیت کی پکار کو قبول کرتا ہے تو اسے اپنا نفس ایسا قیدخانہ محسوس ہونے لگتا ہے جس کی دیواریں قریب آتی اور سکڑتی جا رہی ہوں اور جیسے ان دیواروں میں اس کا دم گھٹ رہا ہو، تو وہ سانس لینے باہر کی جانب لپکتا ہے اور دوسروں کے ساتھ مِل کر اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ اپنے وجود کو دوسروں کے وجود میں ضم کر دیتا ہے۔

غرض انسان عام حالت میں بلا خوف و خطر اپنی حالتیں بدلتا رہتا ہے اور ہر حالت میں اپنے لیے اور سماج کے لیے باعثِ خیر بنتا ہے، سوائے اس صورت کے جب انسان ان صورتوں میں سے کسی صورت میں مبالغہ کرے یا انتہا پسندی اختیار کرے۔ کیونکہ انفرادیت ہو یا اجتماعیت اصل نقصان اسی وقت ہے جب انسان مبالغے اور انتہا پسندی کا شکار ہو جائے۔

انتہا پسند جذبۂ انفرادیت

پہلے ہم انتہاپسندانہ انفرادی جذبے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

Marfat.com

جس وقت کسی فرد کی فطرت میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مبالغے کی حد تک اپنی ذات کے احساس میں منہمک ہو جاتا ہے، اس وقت وہ لازمی طور پر اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ انفرادی اور ذاتی لذت پہنچانے کے لیے دوسروں پر زیادتی کرتا ہے۔ مگر اس وقت وہ نہ تو معاشرے سے جدا ہوتا ہے اور نہ اس عظیم تعاون سے دست بردار ہوتا ہے جو اسے سوسائٹی میں رہنے کی بنا پر حاصل ہوتا ہے، اور نہ ان ہمہ گیر سہولتوں کو ترک کرتا ہے جو اس کے لیے تمام افراد کی مجموعی کوششیں فراہم کرتی ہیں۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ سماج کے تمام مفادات سے تو خوب فائدہ اٹھائے مگر اپنے حصہ کی ذمے داریاں پوری نہ کرے — یہی وہ مقام ہے جہاں انفرادیت پسندی کے علمبرداروں اور ایک معتدل اور متوازن نقطۂ نظر رکھنے والوں کے درمیان اختلاف شدید ہو جاتا ہے۔

انفرادیت پسند کہتے ہیں کہ اگر فرد کو اپنے ذاتی مسائل و معاملات میں پوری آزادی مل جائے تو بھلا اس میں سماج کا کیا نقصان ہے؟ چنانچہ وہ سماج کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان مسائل و معاملات میں فرد پر کوئی پابندی لگائے اور اس کی اثباتِ ذات (Self Assertion) میں کوئی رکاوٹ بنے (جیساکہ وجودیت پسند وغیرہ کہتے ہیں) خواہ اس میں معاشرے کو نقصان اٹھانا پڑے یا کوئی نقصان نہ بھی ہو۔ مگر ان کی نظر میں فرد کا وجود اصل ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مکمل وجود کا اثبات کرے خواہ سماج میں رہنے بسنے والے خوش ہوں یا ناراض۔

مندرجہ بالا دونوں ہی باتوں میں سخت مغالطہ پنہاں ہے جو صحیح منطق کے سامنے نہیں ٹھیر سکتا۔

اب ہم دوبارہ اسی سوال کو سامنے رکھتے ہیں جس کا ہم نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا تھا کہ فرد اور معاشرہ کیا ہے؟ اور وہ ان دیکھی لکیر کون سی ہے جو ان دونوں کو جدا جدا کر کے دو متضاد قوتوں کی طرح ایک دوسرے

Marfat.com

کے مدمقابل کھڑا کر دیتی ہے؟

فرض کیجیے، ہم سبر راہ ایک شخص کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کون ہے؟ یہ شخص اپنی ذات کے اعتبار سے فرد ہے مگر وہ دوسروں کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ معاشرہ ہیں، اور خود اس شخص کو دوسرے لوگ معاشرہ یا معاشرے کے افراد میں سے ایک فرد قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس فرد سے اور دیگر افراد سے مل کر معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فرد اور معاشرے میں کوئی واقع الامری انفصال قائم کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ ایک دائرے کی طرح ہے۔ دائرے کے کسی نقطے پر آپ نشان لگا کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ یہاں سے دائرہ شروع ہوتا ہے یا یہاں دائرہ ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ دائرے کا ہر نقطہ دائرے کی ابتدا بھی ہے، انتہا بھی اور اس کا وسط بھی، اور جب تک دائرہ باقی ہے یہ صورتِ حال برقرار رہے گی۔ البتہ اگر دائرہ ٹوٹ جائے تو پھر ابتدا اور انتہا کا تعین کیا جا سکتا ہے، مگر اس وقت دائرہ دائرہ نہیں رہے گا۔ سماج بھی جب تک مربوط اور پیوستہ ہے اس میں سے کسی فرد کو علیحدہ کر کے آپ اس کو دوسرے افراد کے بالمقابل نہیں رکھ سکتے، کیونکہ ان تمام افراد میں سے ہر ایک فرد، تمام دیگر افراد کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے خود یہ مخصوص فرد دیگر افراد کو دیکھتا ہے۔ ہاں اگر سماج ہی ٹوٹ پھوٹ کر انتشار و بدنظمی سے دوچار ہو جائے تو پھر تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

سرِدست ہم سماج کے ان افراد کو زیرِ بحث نہیں لاتے جو اپنی رفعت کی بنا پر یا تنزّل کی جانب بہت زیادہ میلان کی وجہ سے معاشرے سے ممتاز ہیں، کیوں کہ یہ لوگ مستثنیات (Exceptions) میں سے ہیں جن سے عمومی قاعدے کی نفی نہیں ہوا کرتی اس لیے نارمل (Normal) لوگوں کی عام اکثریت پر گفتگو کرنے کے بعد ہم ان شاذ (Abnormal) لوگوں کی جانب

Marfat.com

متوجہ ہوں گے۔

اگر ہم ان نمایاں اور ممتاز افراد کو علیحدہ رکھ کر صرف اس اکثریت کو پیشِ نظر رکھیں جن کی نفسیاتی اور عقلی صفات باہم ملتی جلتی ہوا کرتی ہیں، تو اس قول کا کیا مفہوم باقی رہ جائے گا کہ 'سماج مجھ پر ظلم کرتا ہے'۔ یا 'میری شخصی آزادی پر قدغن لگاتا ہے'۔

فرض کیجیے، میں ایک مخصوص خواہش رکھتا ہوں اور اس کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں' اور اس سلسلے میں اس حد تک جانا چاہتا ہوں جس حد تک جانے کی معاشرہ اجازت نہیں دیتا۔ اس پر میں یہ کہوں کہ معاشرہ میری اس خواہش کی تکمیل میں حائل ہے، سماج میری آزادی پر قدغن لگا رہا ہے، اور میری ذات کے اثبات (Self Assertion) میں رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ میں فرائڈ کے افکار و نظریات کو دلیل بنا کر معاشرے سے سخت احتجاج کرتا ہوں کہ اس نے میرے فطری میلانات کو کچل کر رکھ دیا ہے اور مجھے اعصابی خلل (Neurosis) اور نفسیاتی الجھنوں سے دوچار کر دیا ہے۔ مگر میں اس وقت اس اہم حقیقت کو فراموش کر دیتا ہوں کہ جس وقت میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس خواہش کی تکمیل کے درپے ہوتا ہے اور اس میں آخری حد تک جانا چاہتا ہے تو میں خود سماج بن کر یا سماج کا نمائندہ بن کر اسے وہیں روک دیتا ہوں اور اسے حکم دیتا ہوں کہ اس مقررہ حد سے آگے نہ بڑھو۔

اگر ایک شخص کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی دوسرے افراد کے حق میں جرم کا درجہ رکھتی ہے، تو معاشرے کا ہر فرد اس جرم کا مرتکب ہے اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں پایا جا سکتا جس پر سو فی صد زیادتی ہوئی ہو۔ بلکہ ہر شخص ایک ہی وقت میں زیادتی کا شکار بھی ہے اور خود بھی دوسروں پر زیادتی کر رہا ہے (اس عمومی قاعدے میں بھی شاذ (Abnormal) لوگ زیرِ بحث نہیں ہیں)۔

اب اگر کوئی فرد یہ کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو سماج کیوں رکاوٹ بنتا ہے، تو اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر سماج کے دیگر افراد یہی کام کرتے ہیں تو وہ خود کیوں متردد ہوتا ہے؟

Marfat.com

بہرحال یہ نظریۂ انفرادیت ایک غیر مستقیم انانیت پسندانہ جذبے پر مشتمل ہے کیوں کہ جب ایک شخص اپنے آپ کو سماج کی روایات توڑنے کا حق دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کی خواہشات دیگر افراد کی خواہشات سے ٹکراتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے ہیں، انتشار پیدا ہوتا ہے اور بالآخر تمام افراد کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

تہذیبِ نَوی کی خیرگی اور مشرق کی پسماندگی

اس مرحلے پر چند مغرب پرست جن کی نگاہیں تہذیبِ نوی کی روشنی سے خیرہ ہو چکی ہیں، یہ کہیں گے کہ کسی فرد کے سماج کی روایات توڑ دینے میں کوئی تصادم اور انتشار نہیں ہے بلکہ ہم اہلِ مشرق اس کو انتشار اس لیے سمجھتے ہیں کہ ہم ابھی اُن فرسودہ روایات کے غلام بنے ہوئے ہیں جو دَورِ جدید سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اگر ہم دَورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدل کر ترقی یافتہ ہو جائیں اور صورتِ حال کو جس طرح کہ وہ ہے اسی طرح تسلیم کر لیں، تو ہمارا نقطۂ نظر تبدیل ہو جائے گا اور نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کے بعد ہم اس بات میں نہ تو کوئی برائی محسوس کریں گے اور نہ اسے خلافِ اخلاق اور خلافِ فرض سمجھیں گے، کیونکہ اخلاق کی کوئی ذاتی قیمت نہیں ہے بلکہ یہ صرف سماج کا ایک عکس ہے۔ اگر معاشرے کی اکثریت کسی شے کو خیر کہے تو وہ خیر قرار پا جاتی ہے اور اگر شر کہے تو وہ شر قرار پاتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ شے بذاتِ خود خیر یا شر ہے، بلکہ اس لیے کہ لوگوں نے اس کو خیر یا شر کی صفت عطا کر دی ہے۔

ان حضرات کے اس قول کا منشاء یہ ہے کہ مثلاً ہم مشرق کے پس ماندہ لوگ جنسی آزادی کو ایک بدترین برائی تصور کرتے ہیں اور سماج کو اس تباہی اور بربادی سے ڈراتے ہیں جس کی جانب یہ بُرائی لے جاتی ہے، تو یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ ہماری پسماندگی ہے۔ جب ہمارا اشیاء کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہو جائیگا تو ہم اس آزادی کو کسی پر زیادتی نہیں سمجھیں گے، کیوں کہ جنسی بے راہ روی میں جب طرفین راضی ہوں گے تو نہ کسی کی جانب سے زیادتی ہوگی اور نہ کوئی زیادتی کا شکار ہوگا۔ والدین بھی اپنی اولاد کے جذبات کے اظہار پر ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ ان کی ناراضگی کی وجہ بھی یہی ہے کہ سماج اس کی اجازت نہیں دیتا، اگر معاشرہ

Marfat.com

اس کی اجازت دے دے تو کسی باپ کو اپنی اولاد کی عزت کا خدشہ نہ رہے، کیوں کہ یہ بات سماج میں معیوب ہی نہ رہے گی۔ غرض سماج کی اس طرح تبدیلی سے لوگوں کا ضمیر مطمئن ہو جائے گا، اعصاب پُر سکون ہو جائیں گے اور ہر معاملہ اپنی مناسب طبعی رفتار پر رواں دواں ہو جائے گا۔ ذرا مغرب کو دیکھیے! مغرب نواب ماضی کی ان خرافات سے آزاد ہو کر اور اخلاق کی ان زنجیروں کو توڑ کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو چکا ہے۔

سرِدست ہم مغرب کی اس خیالی ترقی پر تنقید کے درپے نہیں ہوتے اور نہ یہ نشان دہی کرتے ہیں کہ اس ترقی میں انسانیت کا کس قدر عظیم نقصان ہے، کیونکہ اس مسئلے میں بحث کی کافی گنجائش موجود ہے۔ البتہ ہم وہ واقعات پیش کرتے ہیں جو رسائل اور اخباروں میں رات دن شائع ہوتے رہتے ہیں، جن میں بحث اور مناظرے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امریکہ اور جنسی آزادی

امریکہ —— جہاں دنیا میں سب سے زیادہ جنسی آزادی ہے، وہاں کے اخبارات بتاتے ہیں کہ امریکہ ایک سخت خطرناک اجتماعی مسئلے سے دوچار ہے جس کی خطرناکی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ اب ذمے دار اصحاب پریشان ہیں اور اس تباہ کن مسئلے کے حل کے لیے ماہرینِ اجتماعیات سے مشورے کر رہے ہیں۔ یہ اہم مسئلہ اغوا کا مسئلہ ہے۔ ہر روز اخباروں میں خبریں آتی ہیں کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو گاڑیوں میں ڈال کر لے گئے اور خواہشِ نفس پوری کرنے کے بعد انھیں دُور دراز کے علاقوں میں چھوڑ گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر آزادی حاصل ہے اور کسی قسم کی کوئی سماجی پابندی نہیں ہے تو پھر اغوا کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوال اگرچہ بظاہر پیچیدہ سا معلوم ہوتا ہے مگر اس کا جواب بڑا سادہ ہے۔ اور وہ یہ کہ جب سب لوگوں کو یہ آزادی مل جائے کہ وہ جو چاہیں سو کریں تو خواہشات اور میلانات ضرور متصادم ہوں گے۔ یہ بھی ہوگا کہ کوئی

Marfat.com

نوجوان کسی لڑکی کو پسند کرتا ہوگا مگر وہ خود کسی اور کو پسند کر رہی ہو۔ اب چونکہ خواہشوں کی تکمیل کی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے اور کوئی بندش اور کوئی پابندی موجود نہیں ہے تو پھر یہ نوجوان اپنے جذبات کو کیوں محبوس رکھے گا؟ وہ تو یہی کرے گا کہ اس لڑکی کو اغوا کر لے اور اس کے ساتھ اپنے جذبات کی تکمیل کرے — یہ سب کچھ اس ملک میں ہوتا ہے جہاں ہر شے کی آزادی ہے، بلکہ یہ کہیے کہ یہ سب کچھ اس بے قید آزادی ہی کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔

اس خطرناک مسئلے کا امریکہ میں اعتراف کیا جا چکا ہے، اخبارات اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لے چکے ہیں اور ذمّے دار لوگوں کو اس طرف متوجہ کر چکے ہیں، اور اس مسئلے کی روز بروز شدّت یہ بتلاتی ہے کہ ابھی یہ اس خطرناک اجتماعی زندگی کی ابتدا اور آغاز ہے جس کی جانب امریکہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یعنی یہ وہ ابتدائی عوارض ہیں جن کی جانب ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور جن کا ہمارے یہاں کے ذہنی غلام انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ واقعات انفرادی اور اتفاقی نوعیت کے ہیں مگر جو لوگ صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں وہ یقیناً اس بات کو محسوس کر سکتے ہیں کہ جس انحلال کا آغاز آج جنسی میدان میں ہو چکا ہے، یہ بالآخر زندگی کے تمام پہلوؤں پہ محیط ہو جائے گا، جیسا کہ تاریخِ عالم اس کا ثبوت پیش کرتی ہے

فرانس اور جنسی انارکی

ہم اس مقام پہ فرانس کی مثال پیش کرتے ہیں کیوں کہ فرانس کی تاریخ سے نئی نسل زیادہ واقف ہے۔ فرانس میں پہلے پہل جنسی آزادی یا جنسی انارکی (Sexual Anarchy) نے فروغ پایا اور پھر اس انارکی نے روایات کا درجہ اختیار کر لیا — تعجب نہ کیجیے! ہمارے یہاں تو چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی اُصول اور روایات ہوتے ہیں۔

فرانس کی نادر روایات میں سے ایک روایت یہ تھی کہ مرد و زن سرِ راہ بوس و کنار کرتے، بسوں اور پارکوں میں محوِ اختلاط ہوتے مگر کسی کو اعتراض نہ ہوتا،

Marfat.com

بلکہ اعتراض کا نشانہ وہ شخص بنتا جو ان باتوں پر ناک بھوں چڑھاتا اور بزعم خود پارسائی کا دعویدار بنتا۔ غرض فرانس اپنی اس روش پر گامزن رہا اور نوجوان عیش کوشی میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا اور میاں بیوی تک نے ایک دوسرے سے یہ توقع رکھنا ہی چھوڑ دی کہ وہ خالصتہً ایک دوسرے کے لیے ہو سکتے ہیں۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ عورت کو پستیوں میں گرنے سے کوئی بچانے والا نہ رہا اور مرد کو شب و روز دادِ عیش دینے سے کوئی منع کرنے والا نہ رہا۔ بیمار ذہن لوگ پکار اٹھے:۔ یہ ہے تہذیب و تمدن، اور یہ ہے وہ مقامِ رفیع جہاں تک ہمیں بھی پہنچنا چاہیے۔ عوام رقص گاہوں اور بار روموں پر ٹوٹ پڑے اور ہر شخص ان لذتوں کو اپنا حق سمجھنے لگا اور اپنی شخصی آزادی قرار دینے لگا جس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔

آزادی کی یہ متعدی بیماری مخصوص نفسیاتی عمل کے تحت آہستہ آہستہ تمام لوگوں میں سرایت کرتی اور پھیلتی رہی، کیوں کہ جو جذبات بظاہر علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں، وہ دنیائے نفس میں اس طرح مستقل نہیں ہوتے اور نہ اس طرح جدا جدا ہوتے ہیں، بلکہ یہ تمام باہم پیوست اور منسلک ہوتے ہیں اور اس قدر متصل ہوتے ہیں کہ ایک عمیق نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے ہیں، خواہ یہ منبع فرائڈ کی تعبیر کے مطابق خالص جنسی ہو یا ہمارے خیال کے مطابق عمومی حیوانی قوت ہو۔ نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں اور بندشیں نہ قائم کی جائیں تو دنیائے نفس میں مشاعر ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر پھیلتے اور بڑھتے رہتے ہیں، اور رکاوٹیں بھی اگر ظاہری طور پر قائم کی گئی ہوں اور گہری بنیادوں پر استوار نہ کی گئی ہوں تو قوتِ حیوانی کے سیلِ بے کراں کو برداشت نہیں کرتیں اور اس موجِ حیوانی کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ایک شعبۂ زندگی میں بے قیدی اختیار کرتا ہے وہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں بے قیدی و بے راہ روی کو اپناتا چلا جاتا ہے۔ اور جن نادر

Marfat.com

حالات میں انحطاط نفس کے ایک مخصوص اور معین گوشے میں محدود رہتا ہے وہ اس قدر کم ہوتے ہیں کہ ان کی بناء پر عمومی قانون میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی ۔

فرانس میں بعینہٖ یہی کچھ ہوا ۔ وہاں بھی آزادی مطلق کا شوق دائرہ جنس سے نکل کر زندگی کے تمام دائروں میں پھیل گیا اور انفرادی اور جماعتی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہوگیا حتیٰ کہ سیاست، اقتصاد اور ہر اس شے میں بھی سرایت کر گیا جس کا تعلق معاشرے، حکومت اور ریاست سے ہو ۔ پبلک کو یہ بات بھی گراں گزرنے لگی کہ وہ ریاست کے تحفّظ کے لیے مسلّح افواج میں شریک ہوں، کیونکہ اُن کی نظر میں ریاست ان سے جداگانہ ایک علیحدہ شے تھی، جس کو ان کے معاملات و مسائل میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان پر پابندیاں عاید کرے ۔ پبلک کے اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار میں شدید کمی واقع ہوئی، افواج میں کمزوری آگئی اور سازشوں کے جال پھیل گئے ۔ اسی لیے جب فرانس جنگ میں شریک ہوا تو وہ جنگ کے قابل نہ تھا ۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کے پاس جنگی ساز و سامان کی کمی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ فرانسیسی قوم میں 'معنوی روح' ختم ہوچکی تھی ۔ وہ ایک ایسی قوم بن چکی تھی جو جنگ نہیں چاہتی تھی، جو لڑکر اپنے قومی وجود کا تحفّظ نہیں کرسکتی تھی کیوں کہ اس میں جنگ کی نفسیاتی کلفتیں سہنے کا یارا نہ تھا، اور اس میں اپنی لذتیں اور آسائشیں چھوڑنا کی ہمت نہیں تھی ۔ یہ ایسی قوم تھی جس کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا، جس کے دل پراگندہ اور منتشر تھے، جو اپنی عزتِ نفس اور اپنے قومی وجود کے تحفّظ سے زیادہ پیرس کی بلند و بالا عمارتوں اور رقص گاہوں کو ترجیح دیتی تھی ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس شکست و ہزیمت سے دوچار ہوا، اگرچہ حلیف ممالک نے کافی مدد کی اور اس کوشش میں لگے رہے کہ فرانس آخری سانس لینے سے پہلے کچھ دیر اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں پر کھڑا ہوجائے، تاکہ دشمن کا آخری وار بھی سہہ لے ۔

فرانس کی تباہی کی یہ اخلاقی تعبیر، اشتراکیوں اور تاریخ کی مادی اور اقتصادی

Marfat.com

تعبیر کرنے والوں کو پسند نہیں آسکتی۔ اسی طرح خود فرانس کے مداح بھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے لیے میں خود فرانسیسی مؤرخ رجس کی خیر خواہی پر وہ اپنے آپ بھی اعتماد کرتے ہیں) (پبتان) (Pibtan) کی اس مشہور زمانہ تقریر کا حوالہ دوں گا جس نے فرانسیسیوں کی آتشِ ضمیر کو سُلگانے کی کوشش کی۔ اگر اس میں کوئی چنگاری باقی تھی۔ اور جس نے اس تباہی و بربادی کا یہی تجزیہ پیش کیا کہ یہ تباہی عوام کے اخلاقی زوال اور بے راہ روی کا نتیجہ ہے۔

سماجی روایات اور ان کا کردار

حاصلِ کلام یہ کہ سماجی روایات کی شکست و ریخت، ان سے بے اعتنائی اور بے پرواہی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ اندرونی اور بیرونی تباہ کاری سے دوچار ہوجاتا ہے اور بالآخر عیش کوشی میں مبتلا افراد خود بھی ہر عیش و لذت سے محروم ہوجاتے ہیں۔

اپنی کوتاہ بینی کی بنا پر سماج کے عیش کوش افراد اس وہم میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ وہ جس قدر چاہیں لذتوں میں منہمک رہیں۔ انھیں کسی مصیبت کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا اور نہ وہ کسی دشواری میں مبتلا ہوں گے۔

انسانیت نے جو سماجی روایات بڑی کاوشوں سے تشکیل دی ہیں وہ بیکار و فرسودہ نہیں ہیں، بلکہ یہ روایات سماجی تحفظ میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں سماج کے تمام افراد نقصان اور تباہی سے بچے رہتے ہیں۔

اس مسئلے پر ایک اور زاویۂ نظر سے بھی غور کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ یہ روایات کیوں کر پیدا ہوئی ہیں؟ اور کس لیے ابھری ہیں۔

تمام بڑے بڑے موجودہ آسمانی مذاہب، انسانیت کے ارتقاء کے کافی مراحل گزرنے کے بعد آئے ہیں۔ ان مذاہب کی آمد سے ہزاروں سال پہلے سے انسانیت کے پاس اخلاق و روایات کا سرمایہ موجود تھا، جو اپنی نوعیت اور اپنے طریقۂ تنفیذ (Application) میں مختلف ہوسکتی ہیں، مگر سب کا

Marfat.com

منشاء بہر حال یہی ہے کہ انفرادی میلان پر قدغن لگا کر اسے بتدریج جماعتی میلان کے تابع کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ہوا اور کیوں کر ہوا؟

سوال کے پہلے حصے کا جواب زیادہ دشوار ہے، کیوں کہ اس کا جواب تاریخ کے تاریک پردوں میں پوشیدہ ہے اور ابھی تک کسی قطعی جواب تک پہنچنے کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اہلِ مذاہب تو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ابتدائے آفرینش سے ہی انسانیت کے پاس رسولؑ اور پیغمبرؑ بھیجتا رہا، اور یہ راہنما اور ہادیؑ انسانوں کو بتلاتے رہے کہ کون سے اُمور سود مند ہیں اور کون سے اعمال مضرت رساں ہیں کہ ان سے بچنا چاہیے۔ مگر جو لوگ رسولوں اور انبیاء کی بعثت پر یقین نہیں رکھتے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسانیت کے اپنے تجربات اور فطری میلانات ان روایات کے ظہور کا سبب بنے ہیں، اگرچہ ان کے وجود میں آنے کا طریقہ بہرحال نامعلوم ہے۔ ان دونوں میں سے خواہ کوئی سی بھی بات ہو، یہ ظاہر ہے کہ پیغمبروں اور رسولوں کے پاس ایسی کوئی جابرانہ طاقت نہیں تھی جس سے وہ لوگوں کو آسمانی احکام ماننے پر مجبور کر دیتے، بلکہ اگر انسانیت خود یہ محسوس نہ کرتی کہ فرمودات نبوت کے ذریعے ان کے معاملات زیادہ بہتر طریقے پر استوار ہو سکتے ہیں تو وہ کبھی پیغمبروں اور رسولوں کی بات پر کان نہ دھرتی۔

اور اگر سماج کے سرکش، انانیت پسند بڑے لوگ، چھوٹے لوگوں کے مفادات کے برخلاف ان بندشوں اور رکاوٹوں کو نافذ کرتے، جیسا کہ فرائڈ اور ڈارون کہتے ہیں، تو انتہائی تاریک اور قدیم دَور میں بھی انسان یہ محسوس نہ کرتے کہ وہ ان بوجھل پابندیوں کی موجودگی میں اُمورِ خیر اس صورت سے زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں جبکہ ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ جدا جدا افراد کی صورت میں آزادانہ اپنے مستقل وجود اور اپنی کامل حریت سے مستفید ہوتے رہیں۔

Marfat.com

غرض روایات خواہ کسی طور بھی پیدا ہوئی ہوں، اس قدر بات لازمی ہے کہ یہ روایات باقی رہیں اور ترقی کرتی رہیں، کیوں کہ ان سے ایسی انسانی ضرورت کی تکمیل ہوتی تھی جس کے بغیر نہ انسانیت کا گزارہ ہو سکتا تھا اور نہ انسانیت کا وجود قائم رہ سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح سماج فرد کے ضمیر سے ابھرا ہے، اسی طرح روایات بھی نفسِ انسانی کی ضرورت بن کر وجود میں آئی ہیں۔ مذاہب نے ان روایات کو جنم نہیں دیا ہے بلکہ مذاہب نے صرف ان کی تنظیم کر کے ان میں سے بہتر کو برقرار رکھا اور ان روایات کو مٹا دیا جن کی افادیت ختم ہو چکی تھی اور اب وہ انسانیت کے اس ارتقائی مرحلے میں کار آمد نہ رہی تھیں، اگرچہ وہ ارتقائے انسانیت کے کسی گزشتہ مرحلے میں کار آمد رہی ہوں۔

روایات کو ہلکا سمجھنا، ان کی تحقیر کرنا اور یہ سمجھ کر ان کا مذاق اڑانا کہ یہ پرانے تاریک ماضی کی یادگاریں ہیں، صحیح طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو وہ غلط روش ہے جو بتلاتی ہے کہ انسانیت راہِ صواب سے بھٹک کر اجتماعی امراض سے دوچار ہو چکی ہے۔ اور جب انسانیت اس مجنونانہ بے راہ روی میں آخری حدوں تک پہنچ جائے گی اور مکمل خرابی اور گراوٹ کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا تو جلد یا بدیر انسانیت کو بہر حال راہ صواب کی جانب لوٹنا ہی پڑے گا اور اس وقت انسانیت کو احساس ہو گا کہ وہ فی الواقع راستے سے بھٹک گئی تھی۔

سماجی بیماریاں

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ایک روایت پسند سماج ہمیشہ درست ہی ہوتا ہے اور جو افراد روایات کے خلاف بغاوت کرتے ہیں وہ کبھی بھی صحیح طریقے پر نہیں ہوتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سماج بھی افراد کی طرح مختلف بیماریوں اور گوناگوں انحرافات (Perversions) کا شکار ہوا کرتے ہیں اور سماجی امراض ہمیشہ افراد کی بیماریوں سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتے ہیں

Marfat.com

کیوں کہ ایک بگڑے ہوئے سماج کے اثرات آنے والی نسلوں پر خود بخود مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں اور انھیں یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ معاملات و مسائل کو ان کے حقیقی رنگ میں دیکھ سکیں اور پھر سے سیدھے راستے پر گامزن ہو سکیں۔

سماج پر دو امور زیادہ اثر انداز ہوا کرتے ہیں جو طبعی طریقے پر معروف نفسیاتی عمل سے تنہا فرد کے نفس میں پیدا ہوتے اور پھر تمام افراد پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

پہلا امر تو یہ ہے کہ اصل مقصد کو فراموش کر دیا جائے اور حصولِ مقصد کے ذریعے کو اصل مقصد بنا لیا جائے۔ فرد کے نفس میں تو یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ یہ بھول جاتا ہے کہ خوردن برائے زیستن ہے، زیستن برائے خوردن نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ کھانے ہی کے لیے زندہ رہتا ہے۔ فرد یہ حقیقت فراموش کر کے کہ جنسی توانائی سے بقائے نسل مقصود ہے خود جنسی لذتوں کو ہی مقصود بنا لیتا ہے۔ اور فرد اس بات کو فراموش کر دیتا ہے کہ مال سے غرض انفاق ہے وہ اس غرض کو فراموش کر دیتا ہے اور اس کے نفس میں مال جمع کرنے کی ہوک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پیسے ہی کو مقصدِ حیات بنا بیٹھتا ہے۔ ظاہری طور پر جب کوئی شخص تاش یا شطرنج کھیلتا ہے تو اس کا مقصد وقت گزاری ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ کھیل اس کی توجہ پر چھا جاتا اور بجائے خود مقصود بن جاتا ہے خواہ اس کے پاس فاضل وقت نہ ہو اور خواہ اس کھیل کی وجہ سے وہ اپنے امورِ معاش پر بھی توجہ نہ دے سکے۔

یہ ایک طبعی عمل ہے۔ فرد کی اس عمل سے حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مسلسل اس کی تربیت و تہذیب کا انتظام کیا جاتا رہے۔ عملِ طبعی ہونے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ یہ ضرر رساں نہیں ہے، اس لیے کہ جسم میں زہریلی تہوں کا جم جانا بھی ایک طبعی عمل ہے حالانکہ یہ عمل انسان کے لیے مہلک ہے۔ اب اگر اس طبعی عمل کو بالکلیہ ختم نہ کیا جا سکے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ ممکنہ حد تک اس کے اثرات

Marfat.com

میں تخفیف ہو جائے تاکہ فرد کی زندگی کا تادیر بقا ممکن ہو جائے۔

جو عمل فرد کے نفس میں ہوتا ہے بعینہ وہی عمل معاشروں کے نفوس میں بھی ہوتا ہے۔ معاشرے بھی روایات کے مقاصد کو فراموش کر کے خود روایات ہی کو مقصد بنا لیتے اور انھیں مقدس اشیاء کا درجہ دے کر بلا سوچے سمجھے ان کی حفاظت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، جس سے بالآخر ایک اجتماعی نفاق پیدا ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اصل مقصد سے منحرف ہو جاتے، اپنی نجی زندگیوں میں اس کی خلاف ورزی کرتے اور کھوکھلے مظاہر اور اوپری صورتوں پر مرمٹتے ہیں۔

معاشرہ جمود سے بھی دوچار ہوا کرتا ہے۔ یہ جمود فرد کے نفس میں رونما ہونے والے ایک طبعی عمل یعنی عادت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عادت فرد کے وجود کا ایک بنیادی جزء بن جاتی اور اس کے نفس میں ایک اہم کردار انجام دیتی ہے۔ اگر عادت کا وجود نہ ہو یا عادت کا ظہور مختلف امور میں لاشعوری طور پر یا تحت الشعوری طور پر نہ ہو تو فرد کے لیے یہ ممکن نہ رہے کہ وہ اپنے شعوری عمل کو فکر، استنباط اور اختراع کے نئے نئے میدانوں میں متوجہ کر سکے، بلکہ اس کے بجائے اس کی ساری زندگی چلنے، بولنے، کھانے اور پینے کی تربیت اور ان امور کو عادت بنانے ہی میں گزر جائے۔

دنیا میں خیر خالص موجود نہیں ہے، ہر شے میں خیر اور شر ملا جلا ہے۔ اس لیے فرد کو جہاں کچھ عادتوں کے اختیار کرنے سے فائدہ ہوتا ہے وہاں کچھ ایسی نقصان دہ عادتیں بھی ہوتی ہیں جن کے اختیار کرنے سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور ان عادتوں کا تبدیل کرنا بغیر کسی سخت کوشش کے ناممکن ہو جاتا ہے۔

سماج بھی فرد کی طرح اپنی سرگرمیوں کا ایک بڑا حصہ بطور عادت سرانجام دیتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ روایات لازمی عادتوں کا درجہ اختیار کر لیتی اور شعوری

Marfat.com

یا تحت الشعوری طور پر انجام پاتی رہتی ہیں جبکہ شعوری سرگرمیاں عمل وارتقاء کے نئے نئے میدانوں میں منہمک رہتی ہیں۔ مگر اس فائدے کے ساتھ ہی معاشرے کو یہ نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے کہ کچھ مضر رساں عادتیں پختہ ہو جاتی اور ان میں جمود پیدا ہو جاتا ہے اور ان عادتوں میں وہ توانائی ضائع ہو جاتی ہے جو عمومی خیر اور بھلائی میں صرف ہو سکتی تھی۔ اور سماج کو اس روش سے ہٹانے کے لیے ایک زبردست اور متزلزل کر دینے والی تحریک کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ممتاز شخصیت

اس مرحلے پر کوئی ممتاز شخصیت اُبھرتی ہے اور سماج کے جمود کو توڑ کر اسے اصل اور صحیح مقاصد کی جانب لے آتی ہے۔ ہم اس قسم کی شخصیت پر گفتگو اس کے مناسب مقام پر کریں گے۔ بلاشبہ یہ ممتاز شخصیت بھی سماج کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے سماجی لہروں سے متاثر ہوتی اور ان سے نبرد آزما ہوتی ہے، مگر وہ اپنے مزاج کی ساخت کے لحاظ سے معاشرے سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت میں قوتِ حیات معمول سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سماج میں کروٹیں لیتی ہوئی لہروں کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتا ہے اور اس امر پر قدرت رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو ان لہروں کی زد سے بچا کر اور باہر رہ کر ان کا ناقدانہ جائزہ لیتا رہے۔ یہی اس شخصیت کا امتیاز ہوتا ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد یہ شخص سماج کی غلط روش پر ناراض ہوتا اور علی الاعلان بتاتا ہے کہ معاشرے کی فلاں روش غلط ہے۔ پھر وہ اس برائی کی اصلاح کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس فساد کو دور کرنے کے لیے بھرپور عملی جدوجہد کی جائے۔ وہ ایمانِ کامل کے ساتھ اور زعیمانہ شان سے اصلاحِ حال کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس اصلاح کی خاطر شب و روز سوچتا ہے اور حصولِ مقصد کے لیے نئے نئے

Marfat.com

طریقے اور بہتر سے بہتر اسلوب اختیار کرنے کی جدو جہد میں لگا رہتا ہے، اور اسے ایسی سحر انگیز تاثیر حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کا پیغام اپنے متعدی اثرات کے بل پر آہستہ آہستہ لوگوں کے نفوس میں سرایت کرتا جاتا ہے اور لوگ اس کی دعوتِ اصلاح کی جانب اس طرح کھنچے چلے آتے ہیں جیسے ان کے نفس میں چھپی ہوئی کوئی غیبی طاقت انھیں اس کی اطاعت پر مجبور کر رہی ہو اور یہ انفرادی عظمت کا اعلےٰ ترین مقام ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ معاشرہ ان اہم شخصیات کی پکار پر فوراً لبیک کہہ دیتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے راستے میں بہت زبردست رکاوٹیں اور بڑی گہری گھاٹیاں آتی ہیں، اور اس راستے میں اس قدر مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ان کی شدت کی شکایت انبیاء اور مصلحین لبا اوقات کرتے رہے ہیں۔

ابتدائً انبیاء اور مصلحین کی جانب سے پیش کی جانے والی دعوتِ اصلاح کے قبول کرنے سے سماج گریز کرتا اور اس کی زبردست مزاحمت کرتا ہے مگر رفتہ رفتہ اس کی مزاحمت کم ہوتی جاتی ہے اور پھر معاشرہ ایک نئے جوش، عزم اور ولولے کے ساتھ تحریکِ اصلاح کو اس طرح قبول کرتا ہے جیسے سابقہ ساری کوتاہیوں کو دھو دینے کا تہیّہ کر لیا ہو۔

انبیاء اور مصلحین کی سماج سے شکایت بھی اپنی جگہ پر درست ہوتی ہے کیوں کہ انھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہیں اور لوگ باطل پرستی اپنائے ہوئے ہیں۔

مگر خالص شر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ شر اور خیر ملا جلا ہے۔ اگر ہر نئی دعوت اور تحریک کی اس قدر شدید مزاحمت نہ ہو تو معاشرہ ابتری سے دوچار ہو جائے۔ ہر من چلا جس کے ذہن میں کوئی نئی فکر جنم لے لے، اس کو چند گھڑیوں میں آخری حدود تک پہنچا کر چھوڑے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں

Marfat.com

سماج کو اور انسانیت کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑے۔ اس لیے سماج کی جانب سے کسی اصلاحی تحریک کی مزاحمت، جو بعض اوقات برائی محسوس ہوتی ہے فی الواقع مفادِ عام کے مطابق ہوتی ہے۔

بلکہ کسی نظریے کی مزاحمت —— خواہ وہ نظریہ درست ہی ہو —— خود اس نظریے کے لیے بھی مفید ہوتی ہے۔ اس کش مکش سے اس میں پختگی آتی ہے اور داعیانِ نظریہ کو وہ امور بھی محسوس ہو جاتے ہیں جو ابتدائی مرحلہ میں مخفی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں صاحب نظریہ کا جوش اور ولولہ اس نظریے میں ایسے تخیّلاتی امور بھی شامل کر دیتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتے۔ تو یہ کش مکش اور مزاحمت غیر واقعی امور میں ترمیم کر کے اس نظریے کو زیادہ عملی اور حقیقت پسندانہ بنا دیتی ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ یہ نظریہ قبل از وقت ہوتا ہے تو مزاحمت اسے وقتی طور پر کچل دیتی ہے حتیٰ کہ اس کے ظہور کے لیے حالات اور ماحول تیار ہو جائیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظریہ تو بجائے خود درست ہوتا ہے مگر اس نظریے کو لے کر اٹھنے والا باصلاحیت اور اس نظریے کے قیام کا اہل نہیں ہوتا۔ کش مکش اور مزاحمت سے اس کی اصل حقیقت اجاگر ہو جاتی ہے اور اسے اس حد پر روک دیتی ہے جس حد کے لیے اسے اس کی طبیعت نے تیار کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک کمزور شخصیت کے سہارے ایک ایسی تحریک کا قیام جس کا وہ پوری طرح اہل نہیں ہے یقیناً باعث نقصان ہوگا اور اس تحریک میں جو خیر کا پہلو ہوگا وہ بلا ارادہ ضائع ہو جائیگا۔

سماج کا جمود اور کسی نئی تحریک کے خلاف مزاحمت سراسر برائی نہیں ہے کیونکہ اسی جمود اور مزاحمت میں اس امر کی بھی ضمانت موجود ہے کہ سماج ایک طویل وقت کے لیے برقرار رہے اور اس کے افراد اپنے اپنے مسلک پر اطمینان اور خیر کے ساتھ چلتے رہیں۔

Marfat.com

انتہا پسند جذبۂ اجتماعیت

یہاں تک گفتگو اس شذوذ (Abnormality) سے متعلق تھی جس سے معاشرے کے وہ افراد دوچار ہوتے ہیں جنھیں اپنی انفرادیت کا شدید احساس ہو جاتا ہے اور ان انحرافات کا بیان تھا جو اس قسم کے افراد کو چھوٹ دے دینے کے نتیجے میں معاشرے میں رونما ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ان عوامل (Factors) کا بھی ذکر کر دیا جو معاشرے اور افراد کی ساخت میں کارفرما ہوتے ہیں۔

اب ہم تصویر کے دوسرے رُخ کو بیان کرتے ہیں، جبکہ انسان کے انفرادی تشخص کو ختم کر کے اسے آخری حد تک جماعتی میلان کے سامنے جھکا دیا جاتا ہے۔

پہلے مرحلے میں زیادتی کا ظہور فرد کی جانب سے تھا جس میں ہم نے دیکھ لیا تھا کہ ابتداءً فرد کی جانب سے ظاہر ہونے والا نقصان معاشرے کو پہنچا اور پھر آخرالامر وہی نقصان معاشرے کے واسطے سے فرد کو بھی برداشت کرنا پڑا، خواہ فرد بعینہٖ وہی ہو جس سے اس زیادتی کی ابتداء ہوئی تھی یا آئندہ نسلوں میں سے اس کی نسل ہو۔ ظاہر ہے انسانیت ایک مقررہ نسل پر ختم نہیں ہو جاتی اور یہ تو بدترین انانیت ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ پہلے مجھے اپنی ذات کا مفاد دیکھنا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ ہوتا رہے۔

اس دوسرے مرحلے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ زیادتی کا ظہور معاشرے کی جانب سے ہے اور افراد کے خلاف ہے۔ اس مقام پر یہ خیال گزر سکتا ہے کہ فرد اور معاشرے کے درمیان کوئی خطِ فاصل موجود ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک جابر شخص یا جابر اشخاص کا ایک گروہ اپنے ظالمانہ اقتدار اور جابرانہ تسلط کے سامنے باقی معاشرے کو سرنگوں کر دیتے ہیں، اور معاشرے پر کوئی ایسا نظامِ ظلم

Marfat.com

ٹھوپ دیتے ہیں جس میں فرد کی اپنی مستقل شخصیت ضائع ہو جاتی ہے، اس کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی سوائے اس کے کہ وہ بھی گلّے کا ایک فرد ہے اور بغیر سوچے سمجھے جدھر اس کا رُخ موڑا جائے اسی سمت اسے مڑ جانا ہے۔ اس لیے ہمارا یہ کہنا کہ اس صورت میں معاشرہ فرد کے وجود کو کچل ڈالتا ہے، یہ قول اگرچہ مجازاً ہے مگر مشابہ بہ حقیقت ضرور ہے، کیوں کہ جو سماج اپنے ڈکٹیٹر حکمرانوں کے اس جبر اور ظلم کو انگیز کر لیتا ہے وہ افراد کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے مخصوص انداز سے سوچیں یا ملکی اور عالمی اُمور میں حکومت کی سرکاری پالیسی سے ہٹ کر اپنی کوئی مستقل رائے رکھیں۔ پہلے پہل معاشرے کی یہ جابرانہ روش شعوری ہوتی ہے اور پھر یہی روش پختہ ہو کر [illegible] وجود میں آنے لگتی ہے۔ اگرچہ ریاست یا حکمراں ٹولے کو کبھی بھی یہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا کہ سماج اس روش کو انگیز کرتا رہے گا اور افراد بخوشی اپنے ذاتی تشخّص کو اسی طرح سماج کے وجود میں ضم کیے رکھیں گے، اور ان مفادات سے بدستور چمٹے رہیں گے جو قانون اور طاقت کی مسلط کردہ ہیئتِ اجتماعی سے انھیں اس وقت حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست مستقل ایسے نرم یا گرم اقدامات کرتی رہتی ہے جن کے ذریعے عوام کی روح کو مغلوب کیا جا سکے اور انھیں خوف سے یا لالچ سے، غرض جس طرح بھی ہو ریاست کا مطیعِ فرمان رکھا جا سکے۔

کلیت پسند ریاستوں میں بچوں کی تربیت

چنانچہ اس قسم کی کلیت پسندانہ ریاستیں (Totalitarian States) ابتداءً بچوں کی تربیت پر بہت زیادہ توجہ کرتی ہیں اور نرسریوں، پرائمری اسکولوں ثانوی مدارس اور حتیٰ کہ یونیورسٹیوں میں بھی انھیں ایک مخصوص نہج پر تربیت و تعلیم دی جاتی ہے اور پھر جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر بطور کاشت کار، یا صنعت کار، استاد اور انجینیر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں، اس وقت بھی ریاست ان کی نگرانی اور راہنمائی کے فرائض انجام دیتی رہتی ہے۔

Marfat.com

جوں ہی کوئی بچہ آغوشِ مادر میں آنکھ کھولتا ہے یہ ریاستیں اس فکر میں لگ جاتی ہیں کہ اس کی نرم و نازک طبیعت میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی جائے کہ جس نظام میں اس نے آنکھ کھولی ہے وہ دنیا کا بہترین نظام ہے اور اس کے سوا ہر نظام پست اور پس ماندہ ہے۔ اس بات کو بچے ذہنوں پر مرتسم کرنے کے لیے نوع بہ نوع وسائل اختیار کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ بچے کے مزاج اور طبیعت میں یہ "حقائق" لاشعوری طور پر رچ بس جاتے ہیں اور اس قدر گہری جڑ پکڑ لیتے ہیں کہ بچہ آگے چل کر پختہ فکر کا حامل ہونے کے باوجود بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس نظام پر کوئی تنقید کر سکے یا تنقید کے بارے میں سوچ ہی سکے۔

فرد کی ذات میں اور اس نظام میں جس میں وہ سانس لے رہا ہے، دونوں میں ارتباطِ کامل پیدا کرنے کے لیے ریاست کو سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور وہ فرد کی ذات کو اجتماعی ہیئت میں اس طرح ضم کر دیتی ہے جیسے فرد کا اپنا کوئی وجود نہ ہو، اور اگر کچھ وجود ہے بھی تو وہ اسی نظام کے طفیل ہے۔ ذرا اس نظام سے باہر نکلا، مصیبتیں ٹوٹ پڑیں اور طوفانوں نے گھیر لیا۔ جیسے مچھلی کو پانی سے نکال پھینکا جائے اور جیسے کسی نوخیز کومل سے پرندے کو اس کے گھونسلے سے بے دخل کر دیا جائے۔

پھر فرد اور اس نظام دونوں کے تشخص کو لاشعوری طور پر مربوط کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور تمام ذرائع ابلاغ —— اخبارات، سینما اور ریڈیو وغیرہ —— کو اسی یک طرفہ تشہیر پر لگا دیا جاتا ہے۔

اسی پر بس نہیں، بلکہ ان تمام کوششوں کے باوجود بھی اگر کوئی فرد یا چند افراد اس تربیت کے حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور اس تربیت کے متوقع نتائج برآمد نہیں ہوتے، تو پھر ریاست نگرانی اور جاسوسی کے وسائل کو کام میں لاتی ہے اور جاسوسی کے ایسے ایسے ذرائع اختیار کرتی ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو، اور بیٹا باپ کو، شوہر بیوی کو اور بھائی بھائی کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور دفتروں اور

Marfat.com

کارخانوں میں ساتھی کارکن تو بہر حال یہ 'فرض' سرانجام دیتے ہی ہیں۔ بھلا پھر کس کی مجال ہے کہ وہ حکومت کے نقطۂ نظر کی مخالفت کی جسارت کرے۔ بلکہ جہاں کہیں کوئی فکرِ نَو کی کلی چٹکتی اور سوچ کی کوئی نئی لہر اُبھرتی ہے اس کا وہیں گلا گھونٹ دیا جاتا ہے ــــ ورنہ تو جس کے سر میں مخالفت کا سودا سما ئے اس کے سامنے موت اور ہلاکت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ مسئلہ نفسیاتی لحاظ سے اس طرح طے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اپنی ذات کا احساس فرد کی فطرت میں شامل ہے اور اس کے نفس میں ایسے انفرادی میلانات پائے جاتے ہیں جو جبر و ظلم کی مجموعی طاقتوں سے بھی ختم نہیں کیے جا سکتے۔ اسی لیے آمریتیں اس بات پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ فرد کو حیوانی میدان میں پوری پوری آزادی دے دیں تاکہ فکر و شعور اور عمل کے میدان میں جو اس کی آزادی سلب ہوئی ہے اس کا کوئی معاوضہ ہو جائے اور افراد کے نفوس میں گھٹی ہوئی طاقت کا اس طرح اخراج ہو جائے اور یہ طاقت جمع ہو کر خود ریاست کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔

نظام ہائے آمریت میں اخلاقی اقدار سے گریز کی وجہ خواہ ان نظاموں کا اخلاق کُش مزاج ہو، اور خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ نظام کھلے ہوئے لوگوں کو نظریے اور اُصولوں کی پیروی سے ہٹا کر انھیں جسمانی لذتوں میں مشغول کر دیتے ہیں تاکہ اس طرح ان کے گھٹے ہوئے جذبات کی نکاسی ہو جائے، بہر حال یہ مشاہدہ اور واقعہ ہے کہ نظریاتی آمریتیں ہمیشہ سخت حیوانی بے راہ روی کو راستہ دیا کرتی ہیں۔

بلاشبہ اس قسم کی آمریتیں اپنے پابہ زنجیر عوام کی کافی خدمت بھی کرتی ہیں۔ چنانچہ آج کے روسی عوام کی حالت اس حالت سے کہیں بہتر ہے جو ان کی زارِ روس کے زمانے اور جاگیرداری دَور میں تھی۔ نئے نظام نے ان عوام کو یقیناً ایسے معاشی انصاف سے متعارف کر دیا ہے جس سے وہ پہلے واقف نہ تھے بلکہ پہلے تو سرمایہ دار ان کا خون چوستے رہتے تھے اور جب وہ بے جان لاشے رہ جاتے

Marfat.com

تو انھیں برفانی میدانوں اور فقر و محرومی کی گود میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔
مگر اس آمریت میں بھی وہی خامی ہے جو دنیا بھر کی آمریتوں میں ہُوا کرتی ہے اور وہ یہ کہ یہ انسانی مزاج کی ساخت اور اس کی طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس نے انسانِ بلند آفاق کو ایک بے جان پرزۂ مشین اور ایک مکروہ جانور بنا دیا ہے۔

انسانِ بلند آفاق

"انسانِ بلند آفاق" ایک صاحبِ ارادہ اور مستقل شخصیت ہے۔ یہ درست سہی کہ اس کے ارادے کو مفادِ عام محدود کر دیتا ہے اور اس کا مستقل وجود اجتماعی مفاد کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے، جو بالآخر فرد کے ذاتی مفاد میں ہی ہوتا ہے — مگر بہرحال ایک آزاد معاشرے میں مفادِ عامہ اور اس کی تنفیذ کے بارے میں فرد کی اپنی آزادانہ رائے ہوتی ہے جس پر وہ حکومت اور جاسوسی نظام کے خوف کے بغیر سب سے رائے لیتا اور مشورہ کرتا ہے اور اس طرح مختلف آرا کے باہمی ٹکراؤ اور بحث و تحقیق سے کوئی ایسی روشن اور واضح رائے سامنے آ جاتی ہے جس پر چل کر معاشرہ خیر اور بہبود کی منزل کی جانب بڑھ سکتا ہے۔
آزاد معاشرے میں ہر فرد کا کائنات اور زندگی کے بارے میں اپنا علیحدہ نظریہ ہوتا ہے جو اس عام معاشرتی دائرے میں نصب ہو جاتا ہے جس میں سب لوگ باہمی تعاون سے کام کر رہے ہوں اور آگے بڑھ رہے ہوں۔
نیز اس آزاد معاشرے میں فرد اپنے مناسب عمل کے اختیار میں بھی آزاد ہوتا ہے۔

اسی حریت سے ترقی پسند افکار جنم لیتے اور انسانیت کے تغیرِ پیہم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انفرادی محرکات، ملکیت اور تحقیقِ ذات کے محرکات اور اپنی ذات کے اظہار اور اثبات کی خواہش (Self Assertion) سے علم، صنعت اور پیداوار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ انفرادی محرکات کے برعکس اجتماعی اهداف (Target) خواہ کتنے ہی شاندار کیوں نہ ہوں مگر بہرحال

Marfat.com

ان میں اس قدر قوت نہیں ہوتی جس قدر قوت انفرادی میلانات میں ہوتی ہے۔ اور خواہ انسانیت کتنی ہی ترقی کر جائے مگر اس کی ترقی اس کی فطری حدود میں محدود ہو گی اور ترقی کے زینے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھنے والے بہر حال افراد ہی ہوں گے جو یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ذاتی تشخص کا اثبات اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا وجود جماعت کے سپرد نہ کر دیں۔ ان کے اس جذبے پر ہم ان لوگوں کو محبوب بنا لیتے اور ان کی تعریف کرتے ہیں مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ اور اس کے برعکس لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کا ارتقاء ان کی اپنی حدودِ فطرت میں ہوتا ہے۔ اور یہ امر ان کی قدرت میں نہیں ہے، یا انھیں آج تک اس امر پر قدرت حاصل نہیں ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ذاتی میلانات سے کنارہ کش رہیں۔

قیادت اور رہنمائی میں کسی ممتاز فرد کے حق سے انکار ایک دوگونہ جرم ہے۔ اولاً یہ کہ اس حق کے انکار سے انسانیت کی اس نادر و ممتاز طاقت کا ضیاع ہوتا ہے جس سے مناسب موقع پر سب ہی مستفید ہوتے۔ دوم یہ کہ اس ممتاز فرد سے عام افراد کا سا معاملہ کرنا اور اس ضمن میں مطلق مساوات کا دعویٰ کرنا ظلم اور زیادتی ہے، کیوں کہ بہر حال لوگ اپنی انفرادی قوتوں میں اور اپنی جسمانی، فکری اور نفسیاتی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جیسا کہ کائنات کی ہر شے قوت و ضعف اور عظمت اور کمتری میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے مساوات مطلقہ کا دعویٰ یا تو احمقانہ خرافات ہے یا پھر ایک لامتناہی ظلم ہے۔

انفرادی امتیاز اور اشتراکیت

اشتراکیت کے علم بردار بلاوجہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے یہاں فرد کا مقام محفوظ ہے اور فرد کی امتیازی حیثیت کا ریاست احترام کرتی اور اس کا صلہ دیتی ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریاتی فلسفے کے لحاظ سے جس معنی

Marfat.com

میں ہم نے 'فردِ ممتاز' لیا ہے اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فرد اس معاشرے کا پرتو اور نمائندہ ہوتا ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہوتا ہے، وہ کسی بھی صورت میں اس معاشرے سے جدا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاملات و مسائل کو ان کی صحیح صورت میں سمجھنے پر دیگر افرادِ معاشرہ سے زیادہ قدرت رکھتا ہو۔ رہ گیا ایسے ذاتی امتیاز کا مسئلہ جو فرد کو قائد بناتا، اسے معاشرے پر اس طرح متفوق بناتا ہے کہ وہ معاشرے پر اثرانداز تو ہوتا ہے مگر خود معاشرے سے اثر قبول نہیں کرتا اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی تاثیر اور راہنمائی سے سماجی عقائد اور نظامِ زندگی کو بدل کر رکھ دے، یہ سب باتیں اشتراکی نظریے میں خرافات متصور ہوتی ہیں۔ ان باتوں پر ہم جیسے پسماندہ اور سادہ لوح لوگ' یقین کر لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشروں میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا نہ صرف وحی الٰہی سے بلکہ اس وحی کے نفاذ میں اپنے حکیمانہ ذاتی طریقے کے استعمال سے ــــ وہ طریقہ جس میں خود آپؐ کی عظیم اور نادر و عمیق شخصیت جھلکتی ہے اور جس میں تمام قوتیں اور تمام صلاحیتیں انسانیت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس توازن کے ساتھ جمع ہوئی ہیں[1]

اسی طرح ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اپنی ذاتی شخصیت سے ــــ جو روحِ اسلام سے پوری طرح مستفید ہو چکی تھی ــــ

---

[1] بعض مسلمان اس جانب جھکتے ہیں کہ شخصیتِ رسولؐ کے بجائے تمام فضائل رسالت ہی کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں اور مغربی مصنفین شخصیتِ رسولؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جس سے ان کا مقصد رسالت کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ میری رائے میں شخصیتِ رسولؐ اور رسالت دونوں ہی من جانب اللہ بھی ہیں اور اپنی اپنی جگہ اہم بھی ہیں اور دونوں ہی کی تاثیرات نے اسلام کو اس کی اصلی شکل و صورت عطا کی ہے۔ (مصنف)

Marfat.com

اسلامی ریاست کا نظام قائم کیا۔ حکومت اور معاشرے کی تنظیم کا ایک نظام بنایا اور اس کارنامے میں اجتماعی عوامل سے زیادہ ان کی اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت کارفرما تھی۔ کیونکہ اجتماعی عوامل اس وقت بے اثر ہو گئے تھے جب اسلامی ریاست کی قیادت ایک نرم دل اور نرم خو شخصیت کے حصے میں آئی تھی۔

مندرجہ بالا بیان فلسفۂ اشتراکیت کا نظریاتی پہلو ہے۔ رہ گیا اس کا عملی پہلو تو سائبیریا کے برفانی علاقے اور تعذیب خانے ہر اس شخص کے انتظار میں ہیں جس کا انفرادی امتیاز اسے اشتراکی نظام کے کسی پہلو پر تنقید کرنے پر اکسائے، یا جس کے ذہن میں یہ گستاخانہ خیال سر اٹھائے کہ وہ اسٹالن کی شخصیت میں جلوہ گر صاحبِ قوت و جبروت خداوند پر کوئی اعتراض کرے[1]

آمریتوں کا انفرادی اور اجتماعی نقصان صرف اتنا ہی نہیں جس قدر کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بلکہ یہ آمریتیں عوام کے سامنے کوئی نہ کوئی دشمن بنائے رکھتی ہیں تاکہ عوام کی نفرتیں اس کی جانب رہیں اور اس طرح عوام کے گھٹے ہوئے جذبات کی نکاسی بھی ہوتی رہے اور خود ریاست قید و بند اور ایذا رسانی کے ہتھیار استعمال کر کے اپنے آپ کو عوامی نفرت کے ریلے سے بچائے رکھے۔ ہوتا یہ ہے کہ ابتداءً

---

[1] مَیں نے جب پہلے ایڈیشن میں یہ بات لکھی تھی اس وقت اسٹالن زندہ تھا اور اپنے مطلق العنان اقتدار کے ساتھ روس پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس وقت مصر میں اشتراکی بحثیں کرتے اور کہتے تھے کہ روس میں آمریت نہیں ہے۔ مگر جب اسٹالن مر گیا تو خود روسی اخبار اسٹالن کو زبردست مجرم اور ڈکٹیٹر بتانے لگے، جس نے ـــــ بقول ان کے ـــــ عوام پر تعذیب کے کوڑے برسا کر اور جاسوسی نظام کے ذریعے حکمرانی کی تھی۔ اسٹالن کے مرنے کے بعد روس میں اس 'خداوندِ عظیم' کے اثرات مٹانے کے لیے ایک زبردست تحریک چلائی گئی اور ... یہ دعویٰ کیا گیا کہ اب روس میں کبھی آمریت نہیں آئے گی۔

Marfat.com

نفرت کا تمام تر رُخ ایک ہی قوم کے دو مختلف طبقوں میں کر دیا جاتا ہے اور جب ایک طبقہ دوسرے طبقے کو فنا کر کے اقتدارِ کامل حاصل کر لیتا ہے تو یہ نفرت کا ریلہ دوسری قوموں کی جانب رُخ کر لیتا ہے اور بالآخران دونوں متصادم اقوام میں جنگ کا آغاز ہوجاتا ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی حصولِ غلبہ کے لیے یا زیادتی کو روکنے کے لیے حملہ آور ہوجاتا ہے جس کے نتیجے مین ساری دنیا کو بدامنی اور جنگ کی مصیبتیں بھگتنا پڑتی ہیں۔ تاریخ اس امر پر شاہدِ عادل ہے کہ آمریت خواہ کیسا ہی بلند بانگ نظریہ لے کر اٹھی ہو، مگر اس انسانی جرم کے ارتکاب میں وہ ہمیشہ برابر اور مساوی رہی ہے۔

آمریت اور ذہنِ انسانی کی پژمردگی

آمرانہ نظامِ حکومت میں رہنے والے ہزاروں اور لاکھوں افراد ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتے اور سب کے فکر وعمل پر ریاست کی مہر لگ جاتی ہے، اور سب کو ریاست کے عظیم کارخانے کی تیار شدہ فکری غذا ملتی رہتی ہے اور اس طرح افراد میں فکرِ نو کی صلاحیتیں مرجھا جاتی ہیں اور نورِ بصیرت دھندلا جاتا ہے۔ جیسے مستقل تیار شدہ وٹامن دیے جاتے رہنے سے نظامِ ہضم متاثر ہوجاتا ہے اور اس کا غذا کو ہضم کرنے اور اس میں سے بیکار اجزاء کو نکال کر مفید اجزاء کو خونِ صالح میں تبدیل کر کے تمام جسم میں پھیلا دینے کا فطری اور طبعی عمل پورا نہیں ہوتا۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ جو حیوانی عضو اپنے عمل سے کسی ضرورت کے ماتحت یا بغیر کسی ضرورت کے ایک طویل عرصے تک معطّل رکھا جاتا ہے تو وہ بالآخر اس عمل سے ناکارہ اور معذور ہو جاتا ہے۔ اس قانونِ فطرت کو نہ تو سرمایہ داروں نے اپنے مفاد کے لیے ایجاد کیا ہے اور نہ اشتراکی حضرات اسے تبدیل کر سکتے ہیں۔

جس طرح تیار شدہ کیمیائی اجزاء پر گزر کرنے والے انسان کا نظامِ ہضم معطّل ہوجاتا ہے اسی طرح اگر فرد کی آزادانہ سوچ چھین لی جاتے اور اس کی قوتِ تفکیر کو معطّل کر دیا جائے تو اس کی آنے والی نسلیں غلام ذہنیت لے کر آتی ہیں اور ان میں اپنے

Marfat.com

معاملاتِ وسائل میں غور و فکر کی خو باقی نہیں رہتی ، جس کے جی میں آئے ان پر سوار ہو سکتا ہے ، وہ نہ اس کے اقتدار کو روک سکتے ہیں اور نہ روکنے یا سیدھا رکھنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کیونکہ غلام اس بارے میں نہیں سوچا کرتے کہ آقاؤں کو کس طرح درست کیا جائے ۔

اگر کسی معاشرے سے اور اس کے افراد سے آزادیٔ فکر سلب کر لی جائے اور مسائل کی تحقیق اور معاملات کی تدبیر کی قدرت چھین لی جائے تو اس امر کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ یہ نظام ہمیشہ صالح حکمراں پیدا کرتا رہے گا ؟ اشتراکیت کا اصولِ اقتصاد فی حد ذاتہٖ کوئی جبری قوت نہیں ہے جو لازمی طور پر بروئے کار رہے اور انسانوں سے اور انسانوں کے نفوس سے کوئی سروکار نہ رکھے اصل بات یہ ہے کہ ہر نظام اسی وقت تک مفید رہ سکتا ہے جب تک وہ اچھے حکمراں تیار کرتا رہے اور عوام میں شعور اور آزادیٔ رائے برقرار رہے تاکہ وہ حکمرانوں کی غلطیوں پر انھیں ٹوک سکیں ۔ اور اگر عوام کی آزادیٔ رائے مفلوج ہو چکی ہے تو پھر کوئی نظام بھی تباہی سے نہیں بچ سکا ، خواہ اس کے ماننے والوں نے اسے رفعت کے کتنے ہی بلند مقام پر پہنچا دیا ہو ۔

یہ کہنا کہ منصفانہ معاشی تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth) فرد اور معاشرے کی بنیاد نفسیاتی اور اخلاقی بنیادوں پر رکھے بغیر ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ جملہ معاملاتِ وسائل ہمیشہ بہتر طریقے پر انجام پاتے رہیں اور اچھے شہری اور اچھے حکمراں خود بخود پیدا ہوتے رہیں ، یہ ایسا قول ہے جو سادگیٔ فکر اور نفسِ انسانی اور اس کے فطری میلانات سے ناواقفیت کے سوا اور کسی شے پر دلالت نہیں کرتا[1]

---

[1] اس بات کی سب سے قریب ترین مثال خود اسٹالن کی ذات ہے ، جس نے اشتراکی سماج میں پرورش پائی اور ایک عرصہ اس نظام کے دروبست پر قابض رہا

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

Marfat.com

یہی کوتاہ بینی فرد کے نفسیاتی اور فکری پہلوؤں کو کچل کر اسے اس کے عوض میں حیوانی آزادی بخشتی ہے اور یہ دعویٰ کراتی ہے کہ فرد اور معاشرے کا مفاد اسی میں پنہاں ہے۔

فرد کو اس اجتماعی میلان میں آخری حد تک لے جانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اس کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ معاشرتی روایات کو تباہ کرے اور اپنے ذاتی تشخّص کے اثبات کے لیے سماجی اخلاق کو ختم کر دے۔ دونوں ہی پہلو انتہا پسندانہ ہیں اور دونوں ہی سماج اور فرد دونوں کے لیے مضرت رساں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس انتہا پسندی کا نقصان فوری طور پر ظاہر نہ ہو مگر آنے والی نسلیں اس کے نقصانات سے یقیناً دوچار ہوا کرتی ہیں۔

انسانیت کے لیے بہترین نظامِ زندگی وہی ہو سکتا ہے جو فرد کے میلانات اور مفادات میں ہم آہنگی اور اس کے فردِ مستقل ہونے اور جزوِ معاشرہ ہونے کی حیثیت میں توازن پیدا کرے۔ اور یہ ہم آہنگی اور توازن صرف ایک نسل کے لیے نہ ہو بلکہ انسانیت کی تمام آنے والی نسلوں کو شامل اور تمام انسانیت کو محیط ہو۔ اور یہی وہ مقاصد ہیں جو اسلام کے پیشِ نظر ہیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مگر اس کی موت کے بعد روسی اخبارات نے برملا کہا کہ اسٹالن روسی نظام کی ایک زبردست غلطی تھا جس کی بارِ دیگر تکرار نہیں ہونی چاہیے۔

Marfat.com

تحریکِ اسلامی کا ابتدائی نقشہ

اسلام کا نقطۂ نظریہ ہے کہ متوازن فرد سے متوازن معاشرہ تشکیل پاتا اور صالح معاشرے میں صالح فرد پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نہ تو فرد کے وجود سے غفلت برتتا ہے اور نہ معاشرے کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے۔

جس وقت اسلامی معاشرہ وجود میں آرہا تھا تو سب سے پہلے ایک ہستیٔ کامل — جناب محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم — نے نئے پیغامِ الٰہی کو قبول کیا، جو ان کے وجود کی گہرائیوں میں سما گیا اور ان کے ہر ہر قطرۂ خوں میں شامل ہو گیا۔

آپؐ کی ذاتِ گرامی سے یہ تحریک حضرت خدیجہؓ کی جانب منتقل ہوئی پھر بالترتیب اس نئی تحریک کے اثرات حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے قبول فرمائے — اور پھر آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ انتہائی احتیاط کے ساتھ دیگر افراد بھی قافلۂ ایماں میں شامل ہوتے گئے — یہ آہستگی اور احتیاط اس لیے تھی کہ اس وقت کا ماحول تحریک اسلامی کے لیے قطعاً اجنبی اور بیگانہ تھا، اس لیے ضروری تھا کہ تحریک ہر اگلا قدم اٹھانے کے لیے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے اور انتہائی حزم و احتیاط سے قدم بڑھائے۔

تحریکِ اسلامی میں جس قدر بھی افراد شامل ہوئے ان میں سے ہر ایک فرد بدر کامل اور نبوت کے آفتابِ جہاں تاب کا پرتو تھا۔ ہر فرد کے وجودِ منوّر سے اس قدر روشنیاں پھیلیں کہ تاریکی نے منہ چھپا لیا اور کرن کرن اُجالا پھیلتا چلا گیا۔

Marfat.com

مشرکینِ مکہ جن کے دل سیاہ ہو چکے تھے اور جن کی ارواح تاریکیوں میں بھٹک رہی تھیں، تحریکِ اسلامی کے مدِّ مقابل کھڑے ہو گئے۔ اگرچہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کے حق ہونے کا اعتراف کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم اس روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر اس کے باوجود روشنی جس قدر بڑھتی رہی اسی قدر ان کی نگاہوں کی خیرگی بڑھتی گئی اور وہ تاریکیوں میں پناہ لیتے گئے۔

معرکۂ حق و باطل بپا ہو گیا اور ہونا ہی چاہیے تھا، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے کہ یہی قانونِ معاشرہ ہے اور یہی اصولِ زندگی ہے۔ مگر اللہ سبحانہٗ نے اپنے دین کو مکمل فرمایا اور حق کو غالب کر دیا اور باطل پسپا ہو کر رہ گیا۔ مؤمنین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ وہی اکثریت ہو گئے اور وہی اسلامی معاشرہ کہلائے۔ اسلامی تحریک کا یہ ابتدائی نقشہ ان تمام تحریکات سے ملتا جلتا ہے جو تاریخ میں رونما ہوتی رہیں۔ جو ایسے راہنما اور ممتاز فرد کی قدر و قیمت اجاگر کرتی رہی ہیں جس کی روح سے پہلے پہل روشنی کی منور کرنیں پھوٹیں اور آفاق پر پھیلتی چلی گئیں۔ اسلام میں یہ بات زیادہ واضح طور پر اور زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آتی ہے، کیونکہ اسلام کے علاوہ دیگر تحریکات (بالخصوص مغربی تحریکات) کے قیام کے بیشتر عوامل خود معاشرے میں پوشیدہ رہے ہیں اور ان حالات و عوامل کی کارفرمائی کو دیکھ کر خود بخود کسی انقلابِ عظیم کی توقع کی جا سکتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان تحریکات پر تاریخ کی مادی اور اقتصادی تعبیریں چسپاں ہو جاتی ہیں۔

مگر اسلام میں یہ صورتِ حال نہ تھی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسلام عربی معاشرے میں بالکل اجنبی تھا۔ ظاہر ہے اگر اہلِ عرب میں قبولیتِ اسلام کی استعداد ہی نہ ہوتی تو اسلام کیوں کر اپنی بنیادیں استوار کر پاتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب بلکہ اس وقت کی تمام دنیا کے مادی اور اقتصادی حالات ظہورِ اسلام کے اس طور پر محرک نہیں بنے ہوتے تھے، جیسا کہ ہمیں

Marfat.com

یہ محرکات انقلابِ فرانس اور اشتراکی انقلاب میں نظر آتے ہیں۔ یا یہ کہیے کہ اگر اللہ سبحانہٗ اپنے نبیؐ کو مبعوث نہ فرماتے تو انسانیت خود بخود فطرتِ انسانی سے اس عجیب ہم آہنگی کے ساتھ اور مطالبہ ہائے فطرت کو اس توازن اور باریکی کے ساتھ پورا کرتے ہوئے اسلام کی جانب نہ آتی۔

اِکرامِ مسلم

اسی لیے اسلام فرد کو اس کی ذاتی حیثیت میں مستحقِ اکرام و تکریم جانتا ہے اور یہ تکریم فرد کو اس وقت ملتی ہے جب وہ نورِ الٰہی (اسلام) کو قبول کر کے اسلامی معاشرے کا ایک فرد بن جائے اور اللہ سبحانہٗ کے نورِ کامل سے روشنی حاصل کر کے مشرکین اور ملحدین کی حیوانی سطح سے بلند ہو جائے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں مشرکین اور ملحدین مسخ شدہ وجود اور بدترین حیوانات ہیں۔

اسلام ہر مسلمان کو ہر قسم کی زیادتیوں سے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے اور اس کے انسانی حقوق اور انسانی کرامت و عزتِ نفس کی حفاظت کرتا ہے، "ہر مسلمان کی جان، مال اور عزت دوسرے مسلمان کے لیے محترم ہے۔" اس لیے کسی کا (بغیر حق) قتل کرنا جائز نہیں، کسی کی عزت و ناموس کو صدمہ پہنچانا درست نہیں اور کسی کے مال پر بغیر حق دست اندازی کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کسی مسلمان کی عزت کو طعنے دے کر، نام رکھ کر، غیبت کر کے، جاسوسی کر کے اور بلا اجازت اس کے گھر میں داخل ہو کر مجروح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

معاشرے کے افراد میں جو ارتباط اسلام نے پیدا کیا ہے اس پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ اسلام میں فرد کی تکریم و عزت ہے اور فرد کے توسط سے یہ تکریم معاشرے کو بھی شامل ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مکمل اور جامع نظریۂ حیات ہے جو بیک وقت فرد اور معاشرے دونوں کو شامل ہے۔

اسلام ایک ایسا متوازن فرد تیار کرتا ہے جو اپنے طبعی توازن کی بنا پر کبھی بھی دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہیں کرتا، کیونکہ دست درازی فرد کے

Marfat.com

داخلی وجود میں موجود عدمِ توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ہر فرد اپنی جگہ متوازن ہو جائے گا تو ان متوازن اور معتدل افراد سے خود بخود ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے گا جس کے میلانات و مقاصد میں توازن اور اعتدال ہو گا۔

اسی لیے اسلام فرد کی جانب پوری پوری توجہ دیتا ہے کیوں کہ فرد ہی وہ اکائی ہے جو اپنی جیسی دیگر اکائیوں سے مل کر معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ گویا فرد معاشرتی عمارت میں سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں تربیتِ افراد

اسلام فرد کی عمر کے ہر دور میں اس پر توجہ رکھتا ہے جس کے بعض مظاہر کُلّی اجتماعی ریاستوں کے مظاہر سے مشابہ نظر آتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ اس سے بہت مختلف ہیں۔

کُلّی اجتماعی ریاستوں میں ریاست بذاتِ خود بچّوں کے نشوونما اور ان کی تربیت کے لیے مخصوص وسائل اختیار کرتی ہے اور اس کام کے لیے مخصوص لوگوں کی ایک ٹیم تیار کرتی ہے۔ پھر ان کے فرائض کی ادائیگی کے دوران میں کبھی علی الاعلان اور کبھی خفیہ طریقوں سے ان کی نگرانی کرتی ہے اس لیے کہ ریاست ان لوگوں پر اعتماد نہیں کرتی، اور چونکہ اس نے تربیتِ ضمیر کی ہی نہیں ہے اس لیے ان افراد کے ضمیر پر بھی بھروسہ نہیں کرتی۔ پھر یہ کہ جذبات و افکار کی تقدیس کا محل عقیدہ نہیں ہوتا بلکہ ریاست ہوتی ہے، یا ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض حکمران ہوتے ہیں۔

اسلام کو ان امور میں سے کسی بھی بات کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اسلام میں مؤمنین کا ایمان ان کا براہِ راست اللہ سبحانہٗ سے تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اس عبادت میں کسی ریاست یا حکمران کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، وہ اپنی اولاد کی تربیت اپنی مرضی سے اسلامی اخلاق پر کرتے ہیں، اس میں اللہ سبحانہٗ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کوئی مفاد یا کسی حکمران کا خوف

Marfat.com

ملحوظ خاطر نہیں ہوتا۔ بلکہ مسلمان ماں باپ بچوں کی اسلامی اصولوں کے مطابق تربیت کرتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کرتے کہ انھوں نے اپنی جانب سے رضاکارانہ طور پر کوئی خدمتِ اسلام کی ہے بلکہ وہ اسے اپنا فرض گردانتے ہیں اور اس میں کسی کے کہنے اور توجّہ دلانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

مسلمان ماں باپ جب بچوں کی اصول اسلام کے ماتحت تربیت کرتے ہیں تو:۔۔۔

(۱) وہ بچوں کی خواہشوں کو نہیں کچلتے، کیوں کہ خواہشوں کا کچلنا رُوحِ اسلام کے منافی ہے۔ بلکہ وہ بچوں کے فطری میلانات کو منضبط اور منظم کرتے ہیں اور ان کے نفس میں اس ارادے کو پروان چڑھاتے ہیں جو حیوانی طاقت کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ اس حیوانی طاقت کا نہ تو بالکلیہ استیصال کر سکتے ہیں اور نہ اسے بالکل آزاد چھوڑتے ہیں۔ اس تربیت کا فائدہ یہ ہے کہ بچہ نفس میں پیدا ہونے والے ان اعصابی اور نفسیاتی اضطرابات سے محفوظ رہتا ہے جو مستقبل میں اس کے لیے اور معاشرے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، کیونکہ ان اضطرابات کا رُخ اگر جرم پسندی کی جانب نہ بھی ہو تو کم از کم مفید حیوانی قوت تو ضرور رائیگاں جائے گی۔

(۲) وہ بچوں کے نفوس میں ایسے اخلاق کی آبیاری کرتے ہیں، جن سے ان کے جذبات میں بلندی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس قابلِ نفرت انانیت سے گریز کرنے لگتے ہیں جو اپنے آپ زیادہ سے زیادہ مفاد کے حصول کے لیے دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔

(۳) وہ بچوں میں ضمیرِ زندہ پیدا کرتے ہیں جو ان کے اعمال کی نگرانی کرتا اور ان کا محاسبہ کرتا ہے تاکہ وہ خیر کے محرّک پر لبّیک کہیں اور شر کے محرکات سے بچیں۔ خارجی اقتدار کے جبروت سے ڈر کر نہیں بلکہ اس لیے تاکہ تمام انسان سلامتی، اخوّت اور محبّت سے باہم مل جل کر رہیں۔

Marfat.com

(۴) اور بالآخر وہ بچوں میں غیرت و عزت کے جذبات پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ کسی ایسے ظلم کو تسلیم نہ کریں جو خدا کی کسی بھی مخلوق پر کیا جا رہا ہو اور کسی ایسے انسان کے سامنے سر نہ جھکائیں جو خدا کا نافرمان ہو۔

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ذرائع تربیت پر گفتگو اس کتاب کا موضوع نہیں ہے بلکہ یہ علیحدہ مستقل بحث ہے جس پر مستقل کتابیں تصنیف کی جا سکتی ہیں۔ اس مقام پر صرف اسی قدر مناسب ہے کہ اسلام کے نظامِ تربیت کے اصول و مبادی کے بارے میں چند اشارات کر دیے جائیں۔[۱]

جب ہم بچوں کی ان اصولوں کے مطابق تربیت کرتے ہیں اور اس فرض کو اہل خاندان کسی ریاستی جبر اور حکومت کے جاسوسی نظام کے خوف کے بغیر سر انجام دیتے ہیں تو اس تربیت سے متوازن افراد نشو و نما پاتے ہیں اور ان متوازن افراد سے ———— خود بخود ایک متوازن اور معتدل سماج جنم لیتا ہے، جس کی بنیاد نفرت کے بجائے محبت ہوتی ہے۔[۲]

---

[۱] اس مختصر سے اشارے کے بعد میں نے "مصر میں نظامِ تعلیم" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو شائع نہیں ہوئی، اس کتاب میں ایک باب 'اسلامی تربیت' کے بارے میں بھی شامل تھا، بعد ازاں میں نے اسلام کے نظامِ تربیت کو بیان کرنے کے لیے ایک کتاب 'اسلام کا نظامِ تربیت' (منہج التربیۃ الاسلامیہ) کے عنوان سے مرتب کی۔

[۲] فرائڈ کا خیال ہے کہ انسانیت کی بنیاد جذباتِ نفرت ہیں۔ یا یہ کہیے کہ انسانیت کی اساس وہ کشمکشِ پیہم ہے جو کچلی ہوئی اصل نفرت میں اور بیرونی قوتوں کی تقویت ہوئی محبت میں مسلسل جاری رہتی ہے۔ اس خیال پر میں افدارِ عالیہ کے زیرِ عنوان پہلے ہی بحث کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ میری رائے میں انسانیت میں اصل محبت ہے اور نفرت افراد کے درمیان (۲)

Marfat.com

اسلام ایک صالح معاشرے کے قیام کے لیے فرد کی تربیت پر تو یقیناً بہت زیادہ زور دیتا ہے مگر صرف فرد ہی کو تمام اسلامی اصولوں کے نفاذ کا واحد ذمے دار نہیں ٹھیراتا، بلکہ اجتماعی لحاظ سے بھی ایسی ہیئتیں تشکیل دیتا ہے جو اس نظام تربیت کو درست و قائم رکھ سکیں اور اس کی مضبوط تاسیس کا بندوبست کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حکومت اور معیشت کے سارے نظام کو شریعتِ اسلامیہ کی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ میں پہلے ہی کسی مقام پر بتا چکا ہوں کہ اسلامی قانون اپنی طبیعت اور مزاج میں تمام ارضی قوانین سے مختلف ہے کیونکہ اسلامی قانون کسی ایک طبقے کے مفاد میں اور کسی دوسرے طبقے کے خلاف نہیں ہے اور نہ یہ صورت ہے کہ ایک فرد کے مفاد میں ہو اور دیگر تمام افراد کے خلاف ہو۔ بلکہ قانون اسلامی اللہ سبحانہٗ کا نازل کردہ ہے اور ان کی ذات اس بات سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی ایک فرد کی رعایت کریں اور دوسرے افراد کو نظر انداز کر دیں یا کسی ایک طبقے کو نوازیں اور دوسرے طبقے کو چھوڑ دیں۔ وہ تو تمام انسانوں کے خالق ہیں اور سب انسان ان کے یہاں برابر ہیں۔ ان کے یہاں اگر کوئی امتیاز ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون ان کے بندوں میں زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور قرآن کریم جب یہ فرماتا ہے:

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (الزخرف: ۳۲)

"اور ہم نے ان میں سے بعض کو دوسرے (بعض) لوگوں پر کئی درجے بلند کیا ہے۔"

(ص ۲) مفادات کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی وقت اس تصادم کو ممکنہ حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ انسانیت کی عمارت محبت و مودت اور اخوت پر قائم ہو جائے گی۔

Marfat.com

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ (النحل: ۷۱)

"اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر رزق میں فضیلت و برتری عطا کی ہے۔"

تو اس کا مطلب ایک امرِ واقعی اور نفس الامری کا بیان ہوتا ہے اور یہ فرق صرف اسلامی معاشرے ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے بلکہ مساوات مطلقہ کا علم بردار اشتراکی معاشرہ بھی اس حقیقت کا معترف ہے کہ ان کے معاشرے میں انجینیئروں کو ایسی خصوصی مراعات حاصل ہیں جو دیگر گروہوں کو حاصل نہیں ہیں کیونکہ صنعتی نظام میں انجینیئر ایسی اہم خدمات انجام دیتے ہیں جو انھیں اس امتیاز کا مستحق بنا دیتی ہیں، جیسا کہ اشتراکی بڑے فخر سے یہ بھی کہتے ہیں کہ سوویت یونین میں ادیبوں اور فن کاروں کا طبقہ تنخواہوں اور زندگی کی تمام آسائشوں میں ممتاز ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق

گویا امتیاز موجود ہے اور طبعی طور پر موجود ہے کیونکہ لوگوں کی صلاحیتیں اور ان کی استعدادِ کار مختلف ہے۔ مگر اسلام میں اس امتیاز سے کسی فرد کو ایسا کوئی انسانی حق نہیں ملتا جو دیگر افراد کو حاصل نہ ہو۔ اُمّتِ مسلمہ میں فقیر ترین انسان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو کسی بھی دوسرے انسان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسے جان و مال عزّت و آبرو غرض ہر قسم کا تحفظ حاصل ہوگا، وہ ایک عام فرد کی حیثیت میں اپنے حکمران سے اسی طرح باز پرس کر سکے گا جیسے کسی نے حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"قسم بخدا اگر ہم نے تجھ میں کوئی انحراف دیکھا تو ہم اسے بنوکِ سنگین درست کر دیں گے۔"

یہ سن کر نہ حضرت عمرؓ کو کوئی ناگواری ہوئی، نہ انھیں غصہ آیا اور نہ انھوں نے اس بات کو اپنی توہین خیال کیا، بلکہ اس انسان نے صاحبِ اقتدار حکمران

Marfat.com

کے سامنے انسانیتِ کاملہ کے جس احساس کا اظہار کیا اس کے اِس عجیب جذبے پر آپؓ نے اللہ سبحانہٗ کا شکر ادا فرمایا اور کہا :

" اللہ سبحانہٗ کا شکر ہے کہ اُس نے عمرؓ کی رعایا میں ایسے افراد پیدا کیے جو اسے بنوکِ سنگین دُرست رکھ سکیں"۔

اور ذرا خودداری تو دیکھیے ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :

" سُنو اور اطاعت کرو"۔

مسلمانوں میں سے ایک فرد کھڑا ہو کر کہتا ہے :

" ہم پر نہ آپ کو سُننا لازم ہے اور نہ آپ کی اطاعت ضروری ہے"۔

اس سے پوچھا گیا "کیوں ؟" بولا :

" بتائیے یہ کپڑا جو آپ پہنے ہوئے ہیں یہ کہاں سے آیا ہے ؟"

حضرت عمرؓ دراز قد تھے اور جو کپڑا سب مسلمانوں کو ملا تھا وہ آپ کو کافی نہ ہو سکتا تھا ۔ مگر حضرت عمرؓ کو یہ کلمات سُن کر اقتدارِ خلیفہ کا ذرا بھی خیال نہ آیا ، بلکہ آپ مسکرائے اور اپنے بیٹے عبداللہؓ کو مخاطب کر کے ان سے پوچھا :

" خُدا گواہ ہے کیا یہ کپڑا تمھارا نہیں ہے ؟"

اس پر حاضرین کو حضرت عبداللہؓ نے بتایا کہ " یہ چادر میری ہے اور مَیں نے خود اپنے والد کو دی ہے تاکہ کپڑا ان کے جسمِ مبارک پر پُورا آ سکے"۔

اس پر وہ شخص بولا : " اچھا اب فرمائیے ، ہم سُنیں گے اور اطاعت بھی کریں گے"۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام میں حکمراں کسی طبقے ، کسی خاندان اور کسی گروہ کا نمائندہ نہیں ہے ، بلکہ مسلمان حکمران مسلمانوں ہی میں سے ایک شخص ہوتا ہے جسے مسلمان باہمی مشورے سے اور اپنی پوری آزادی سے منتخب کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے قانون کو نافذ کرے (نہ کہ اپنے قانون کو) اور اس شریعتِ الٰہی کو برپا کرے جس کی نظر میں تمام انسان انسانی شرافت

Marfat.com

اور حقوقِ انسانیت میں برابر ہیں۔ اس میں حاکم کے اتنے ہی حقوق ہیں جتنے دیگر افراد کے ہیں۔ اور حکمران کو صرف اس قدر امتیاز حاصل ہے کہ وہ لوگوں کا نگران اور ان کا محافظ ہے۔ جب تک وہ حدودِ شریعت میں رہے عوام پر اس کی اطاعت لازم ہے، اور جب وہ اپنی ذات کے کسی فائدے کے لیے یا اپنے گھر والوں کے کسی مفاد کے لیے، یا مسلمانوں کے کسی طبقے کو مراعات دینے کے لیے شریعتِ اسلامیہ کی حدود سے تجاوز کر جائے تو مسلمانوں پر اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی جیسا کہ خود حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا

"تمہارے بارے میں، میں جب تک خدا کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرتے رہو اور اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو تم پر بھی میری اطاعت واجب نہیں ہے"۔

اسلام اور عدلِ اجتماعی

اقتصادی مسئلہ لیجیے، جو درحقیقت کسی معاشرے کا اساسی رکن ہے اور جس کے بغیر کوئی سماج قائم نہیں رہ سکتا۔ اشتراکیت دعوے دار ہے کہ اس نے اب آکر بیسویں صدی میں "معاشرتی انصاف" (Social Justice) کا سراغ لگایا ہے۔ یہ بلند بانگ دعویٰ سن کر مشرقِ اسلامی کے کچھ بے خبر لوگ بھی متحیّر ہو گئے اور اس "معاشرتی انصاف" کو دیکھ کر پکار اٹھے ــــ "واقعی یہی ہے انصاف، اسلام میں انصاف کہاں؟ اسلام نے تو غیر محدود (Unlimited) انفرادی ملکیت کو جائز قرار دے دیا ہے"۔

میرا خیال ہے کہ تاریخ میں اس سے بڑا جھوٹ نہیں بولا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی انصاف اسلام کا سب سے اہم ستون ہے۔ مگر اسلام میں معاشرتی انصاف کی وہ بنیادیں نہیں ہیں جو اشتراکیت میں ہیں، جو صرف جسمانی ضرورتوں تک محدود ہیں اور جو انسان کو حیوان بنا دیتی ہیں۔ بلکہ اسلام میں معاشرتی انصاف کی بنیاد مکمل اور بلند ترین انسانیت ہے جس

Marfat.com

میں معاشی انصاف بھی آجاتا ہے اور بلند ترین انسانی انصاف بھی سما جاتا ہے۔

سماجی ڈھانچے میں معاشرتی انصاف کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب کا موضوعِ بحث چونکہ نفسیاتی ہے اس لیے مَیں صرف اس جانب اشارہ کیے دیتا ہوں، تفصیلی بحث سید قطب اپنی کتاب 'اسلام کا عدل اجتماعی' میں کر چکے ہیں۔ اسی سے ہم نے اسلامی معاشرے میں اعتدال اور توازن کے تصوّر کو اخذ کیا ہے۔ یہاں ہم اس مضمون کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

سرمایہ کسی شخص کی حقیقی ملکیت نہیں ہے بلکہ مال اللہ کا ہے اور وہ اس مال میں جماعت کو اپنا نائب بناتا ہے۔ مالک اس وقت تک مالک رہتا ہے جب تک وہ اس مال میں عمل اور محنت کرتا رہے اور اس کے تصرفات دُرست رہیں۔ اگر اس نے اسراف کیا، یا جہاں خرچ کرنا چاہیے تھا وہاں خرچ نہ کیا تو اس کے تصرفات کو غلط سمجھا جائے گا اور حکمراں (اولی الامر) کو یہ اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ جماعت کے نام پر اس کی کچھ ملکیت یا تمام املاک ضبط کرے اور اس شخص کے سپرد کر دے جو اس میں صحیح تصرفات کا زیادہ اہل ہو۔ اسی طرح ولی امر کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ معاشرے کے معیار کو دُرست رکھنے کے لیے جس وقت ضرورت محسوس کرے لے لے اور اس طرح معاشرے سے اس نقصان کو دُور کرے جو اس کے غیر متوازن ہونے کی صورت میں یقیناً پہنچے گا۔ ایک اسلامی اُصول یہ بھی ہے کہ محنت کش نفع میں سرمایہ دار کا شریک ہے۔

جب اقتصادی اور انسانی بنیادوں پر اسلام کا عدلِ اجتماعی وجود میں آئیگا تو کوئی بھی شخص اپنے جائز عملِ حیات سے محروم نہ رہے گا اور نہ اسے اس حد سے آگے گزرنے دیا جائے گا جس حد سے گزر کر وہ دیگر لوگوں کی تکلیف کا باعث بن سکتا ہو، کیونکہ اسلامی معاشرے میں ربطِ باہمی کی بنیاد منافرت اور کشاکش نہیں ہوتی، بلکہ محبت و اخوت ہوتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ

Marfat.com

ایک طبقہ مالکین (Haves) کا ہوا اور دوسرا طبقہ محرومین (Haves not) کا ہو۔ بلکہ یہاں تمام افراد محدود وسائل کے مالک ہوتے ہیں اور ریاست اور حاکم کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ لوگوں سے ان کا زائد مال لے کر تنگدستوں کو دیدے۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت ان تنگ دستوں کا حق ہے، یہ بھیک نہیں ہے جو ان لوگوں کو دی جائے گی۔ یہ حق ان کمزوروں کو ریاست دلاتی ہے اور اس طرح دلاتی ہے کہ ان کی عزتِ نفس برقرار رہے اور انھیں ذلیل نہ کیا جائے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ان تنگ دستوں کو یہ مال نقد ہی کی صورت میں دیا جائے۔ بلکہ یہ انھیں اس طرح بھی دیا جا سکتا ہے کہ ان کے لیے اسکول کھولے جائیں، ہسپتال اور صحت گاہیں بنائی جائیں اور ان کو ارزاں وسائل آمد و رفت مہیا کیے جائیں —— غرض جس قدر بھی سہولتیں پہنچانا ممکن ہو پہنچائی جائیں[1]۔

اس مقام پر ایک نہایت اہم تاریخی حقیقت کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد اسلامی معاشرے میں مسئلہ مال اور نظامِ حکمرانی کے بارے میں اسلامی تعلیمات اپنی مکمل روح کے واقعی اور نفس الامری طور پر نافذ نہیں ہوئی ہیں —— مگر اس حقیقت کے اظہار کا یہ مفہوم بھی نہیں کہ نظامِ اسلامی تصوراتی اور خیالی ہے[2]، حقیقی اور عملی نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں اس کا متحقق ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس نظام کا انطباق (Application) ممکن ہے۔ چنانچہ جب اموی حکمرانوں کے نظامِ جبر نے اسلام کے اہم ستون —— آزادانہ بیعت۔ کو گرا دیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی نظام کو ہر معاملے میں اس

---

[1] و [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات۔ (شبہات حول الاسلام)

Marfat.com

کی اصل رُوح کے مطابق دوبارہ جاری فرمایا۔

آج سے تیرہ سو سال پہلے اہلِ عرب کا معیارِ عقلیت اس قدر بلند نہیں تھا جس قدر کہ اسلام کے بلند ترین معیار تک پہنچنے کے لیے درکار ہے، مگر آج کے مسلمان اس معیارِ بلند تک پہنچ سکتے ہیں کیونکہ دورِ جدید میں عالمی شعور کا معیار بہت کچھ بلند ہو چکا ہے، خصوصاً حکومت و مالی مسائل میں آج کی دنیا کا شعور پہلے سے بہت بلند ہے۔

اسلام اور شخصی آزادی

اسلام میں نہ تو ریاست معاشرے کی نمائندہ بن کر افراد کی شخصی آزادی میں مداخلت کرتی ہے اور نہ ہی یہاں شخصی آزادی کا وہ مفہوم ہوتا ہے جو اخلاقی طور پر زوال آشنا حکومتوں میں سمجھا جاتا ہے اور جو شخصی آزادی کے نام پر افراد کو ہر قسم کی بے راہ روی کی کھلی چھٹی دے دیتی ہیں۔

اسلام میں — جیسا کہ ہم نے بیان کیا — ریاست مسئلہ ملکیت میں مداخلت کرتی ہے اور اس لیے کرتی ہے تاکہ معاشرے کو عدم توازن کے خطرات سے بچا سکے اور ان نتائج سے محفوظ رکھ سکے جو اس کے نتیجے میں فتنوں، انقلابات، معاشرتی اختلال، مجرمانہ عیش کوشی کے جواز اور کچھ لوگوں کی بالکلیہ محرومی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ انفصال ہے جہاں سے اسلام سرمایہ دارانہ ریاستوں سے جدا ہو جاتا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ ریاستوں میں مٹھی بھر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ باقی تمام عوام کو اپنے مفادات کے لیے اپنا غلام بنالیں۔

اگر آج سرمایہ دار ممالک ارتفاعی ٹیکسوں کا نظام ایجاد کر کے اور وسائل پیداوار کی ضمانت دے کر معاشرے میں کسی قدر توازن پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اشتراکیت کے پھیلاؤ کے خوف سے قدرے ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو اسلام نو بہت پہلے اور بہت وسیع پیمانے پر یہ اصلاحات

Marfat.com

کر چکا ہے۔ پھر یہ کہ اسلام نے یہ اصلاحات کسی بیرونی خطرے سے ڈر کر نہیں کیں، بلکہ از خود کی ہیں اور اس وقت کی ہیں جب یورپ تاریکیوں اور جہالت کے گہرے گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔ بہر کیف، مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اسلام میں شخصی آزادی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو غلام بنا لیا جائے۔

اسی طرح اسلام اخلاقی بے راہ روی کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام میں اخلاقی بے راہ روی کے عدمِ جواز کی حکمت ان مثالوں سے واضح ہوتی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور ان اثرات و نتائج سے ظاہر ہوتی ہے جو اس بے راہ روی کے آنے والی نسلوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسلام انسانیت کو اس کوتاہ نظری سے نہیں دیکھتا کہ اپنے سامنے صرف ایک نسل کو رکھے جس کا اگلی پچھلی نسل سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ انسانیت اسلام کی نظر میں ایک مسلسل اور پیوست سلسلہ ہے جس میں ہمارا آج کا کیا ہوا عمل کل پر یقیناً اثر انداز ہوتا ہے۔ جو اولاد ہماری اس بے راہ روی کے دور میں پرورش پا رہی ہے اور جس کی بہتر تربیت کی جانب سے ہم بے توجہی برت رہے ہیں، وہ یقیناً آگے چل کر ہم سے بھی زیادہ بے راہ رو ثابت ہوگی۔ کیونکہ افراد ہوں یا معاشرے، ان کے لیے بے قیدی اور حیوانیت کے راستوں پر چلنا زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ خواہشوں کو کنٹرول کریں اور رفعت حاصل کرنے کی سعی کریں۔ اسی لیے والدین پر اولاد کی صحیح تربیت لازمی ہے اور اولیاء امر پر پوری نسل کی تربیت فرض ہے۔

دوسروں پر زیادتی خواہ کسی بھی صورت میں ہو اسلام میں جائز نہیں ہے اور کسی حاکم اور محکوم کو اس امر کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کے جان و مال، عزت و آبرو کو کوئی صدمہ پہنچائے۔

اسلام میں شخصی آزادی پر یہی قید لگائی گئی ہے کہ اس آزادی سے دوسروں کو کوئی ایذاء نہ پہنچے۔ خواہ یہ ایذاء کسی فردِ معین کو پہنچتی ہو یا پورا

Marfat.com

معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہو اور خواہ یہ نقصان واضح اور فوری اثر والا ہو، یا ایسا پوشیدہ نقصان ہو جس کے اثراتِ بد ایک مدت بعد محسوس کیے جائیں۔

کوئی بھی شخص اس حقیقت سے تو منکر نہیں ہو سکتا کہ معاشرہ سے نقصان کا اور ضرر کا دفع کرنا ضروری اور لازمی ہے اور معاشرہ اور ریاست دونوں ہی کے ذمّے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس ضرر کو حتی الوسع دُور کریں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا یہ فرمان اس حقیقت کی ایک دلنشین تعبیر ہے:

"اللہ کی حدود قائم کرنے والوں اور حدود اللہ کو توڑنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قوم کسی جہاز پر سوار ہوئی، کچھ لوگ اوپر چلے گئے اور کچھ نیچے چلے گئے۔ جب نیچے والے اوپر والوں سے ملے تو کہنے لگے 'ہم تو اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں اوپر والوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے' —— اب اگر اوپر والوں نے ان کو اس ارادے سے باز نہ رکھا تو سب ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اوپر والوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے (اور انھیں اس حرکت سے روک دیا) تو سب بچ جائیں گے۔"

شخصی آزادی کے سلسلے میں اسلام کی عائد کی ہوئی حدود اس نوعیت کی ہیں اور یہی دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل راستہ ہے۔

مگر اسلام دفع ضرر اور تمام افراد کے مفاد عام اور مفاد خاص کے تحفظ کے لیے صرف اسی امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ فقط ولی امر (حاکم) کو ہی معاشرے کا نمائندہ اور اس کے معاملات و مسائل کا نگراں ہونے کی حیثیت میں یہ حق دے کہ وہ مضرت رساں افراد کو روکے اور باز رکھے۔ بلکہ اسلام نے منکر سے روکنے کے لیے ہر فرد کو شخصی طور پر مکلف ٹھیرایا ہے۔ خواہ

Marfat.com

اس منکر سے وہ خود متاثر ہوتا ہے یا دنیا کا کوئی اور مسلمان اس سے متاثر ہو رہا ہو اور خواہ اس فعل منکر کا ارتکاب کسی حاکم سے ہو یا کسی محکوم سے ہو۔

"تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے بدل ڈالے"۔

"قسم بخدا! تمھیں ضرور نیکیوں کا حکم کرتے رہنا چاہیے، ضرور برائیوں سے روکتے رہنا چاہیے، ظالموں کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیے۔ لوگوں کو حق کی جانب مائل کرنا چاہیے بلکہ انھیں حق پر مجبور کرنا چاہیے۔ ورنہ تو یہ ہوگا کہ خدا تم سب کے دلوں کو ایک ہی جیسا کر دے گا"۔

غرض اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق ہر شخص اپنے آپ کے لحاظ سے اور اپنے حقوق کے مطالبات کے لحاظ سے فرد ہے اور دوسروں کی نسبت سے معاشرہ ہے یا معاشرے کا ایک نمائندہ ہے۔ اور اس معاشرتی نمائندگی کی صورت میں وہ تمام لوگوں سے مضرت رفع کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور انھیں ان کے حقوق کے حصول میں مدد دیتا اور تعاون کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے زیادہ ہم آہنگِ فطرت اور متوازن 'انصاف' اور کیا ہو سکتا ہے۔

شخصی آزادی کی مندرجہ بالا تحدید کے علاوہ جو معاملات صرف انفرادی مفاد سے متعلق ہوں اور جن میں کسی فردِ معین یا مجموعۂ افراد کا کسی قسم کا نقصان نہ ہو تو ایسے تمام معاملات میں فرد کو بالکلیہ آزادی حاصل ہے۔ ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جو کام چاہے سو کرے اور جس قسم کی صلاحیت وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے اس کے مطابق اپنے پیشے کا انتخاب کرے۔ یہ نہیں کہ ریاست اس کے معاملات میں مداخلت کر کے اس کے لیے کوئی عمل تجویز کرے اور اس پر اس کام کو لازم قرار دے دے، جیسا کہ استبدادی ریاستوں میں ہوا کرتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ فرد سے اور معاشرے کی ضروریات سے زیادہ آگاہ ہیں۔ شخصی آزادی میں سماج بغیر ریاستی مداخلت کے خود بخود اپنے آپ کو منظم کرتا ہے۔ حکومت کا تو صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ پبلک

Marfat.com

کی عمومی سیاست پر نظر رکھے، خوشگوار اور اچھے نتائج کے لیے مواقع فراہم کرے، جب راہنمائی ناگزیر ہو تو راہنمائی کرے اور اس بات پر کڑی نظر رکھے کہ سماج کا کوئی بھی فرد اقتصادی اور اجتماعی حالات کی کروٹ لیتی ہوئی صورتوں میں حصول معاش کے جائز ذرائع سے محروم نہ رہ جائے۔

اگرچہ دور جدید میں ہونے والی صنعتی ترقی کے باعث تشکیل پانے والے معاشرتی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ مخصوص طریقے اور کچھ معین راستے مقرر کر کے ریاست عمومی ریاست کی خط کشی کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاست کسی فرد کو اس امر پر مجبور کرے کہ وہ انجینئر یا ڈاکٹر یا مزدور بن جائے اور دلیل صرف یہ ہو کہ ریاست کی افرادی منصوبہ بندی کا تقاضا ہی یہی ہے۔

والدین کو تربیتِ اولاد کے ضمن میں جو آزادی حاصل ہے وہ بھی ظاہر ہے اسلامی حدود میں رہتے ہوئے ہے۔ اس آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ نئی نسل کے اخلاق کو تباہ کریں اور انھیں بغیر کسی تربیت کے چھوڑ دیں۔ البتہ اگر والدین کچھ ایسے خارجی اسباب کی بناء پر جو ان کی گرفت میں نہیں ہیں، تربیت اولاد سے قاصر ہوں تو پھر ریاست مداخلت کر سکتی ہے اور یہ ذمے داری والدین کے علاوہ دیگر افراد کے سپرد کر سکتی ہے۔ مگر بہر حال والدین یہ سمجھنے میں آزاد ہیں کہ ان کی اولاد —— خدا کے بعد —— ان کی ملکیت ہے اور ریاست کو ان کے کسی چھوٹے یا بڑے مسئلے میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

اشتراکی حکومت کا خیال یہ ہے کہ جب تک وہ پبلک کے روٹی، کپڑے اور مکان کی کفیل ہے اس وقت تک اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ سماج کے بچوں پر مکمل اور پوری نظر رکھے۔ گویا زندگی نام ہی روٹی کپڑے کا ہے، اور ایک لقمۂ طعام کے عوض کسی بھی انسان کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہ تو بہت بڑی انسانی گراوٹ ہے اور انسان کو اس کے بلند آفاق سے اتار کر جسمانی ضرورتوں اور زندگی کی حاجتوں کا غلام بنا دینا ہے۔ بات دراصل

Marfat.com

یہ ہے کہ آمرانہ حکومتیں سرے سے خاندانی روابط ہی کو سخت بُرا سمجھتی ہیں کیوں کہ یہ روابط ریاست کے اس نقطۂ نظر کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں کہ ریاست خود ہی بچوں کی تربیت کرے تاکہ وہ اس جبری نظام کے شکنجے سے نہ نکلنے پائیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خاندانی روابط اس جاسوسی نظام کی ضد ہیں جس کے بغیر ایک نظام استبداد قائم نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ لوگ اس کُھلم کُھلا حیوانیت کا اعتراف کرنے کے بجائے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خاندانی روابط پس ماندہ معاشروں کی نشانی ہیں۔ اور ان کا یہی قول اس امر کا اقرار ہے کہ ان کا 'ترقی یافتہ سماج' انسانی روابط سے تہی داماں ہے۔

اسلام میں فرد کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس شئے کا چاہے مالک بن جائے اس شرط کے ساتھ کہ اس کی ملکیت دوسروں کی ایذا رسانی کا باعث نہ بنتی ہو۔ ساتھ ہی ریاست کو بھی حق حاصل ہے کہ اگر فرد کی یہ ملکیت مفاد عامہ کے خلاف ہو، اور اس ملکیت کے ختم کیے بغیر پبلک کا مفاد پورا نہ ہوتا ہو تو وہ اس ملکیت کو ضبط کرلے۔

اسلام میں فرد کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے حاکم کا اپنی آزادانہ رائے سے انتخاب کرے اور اس کے اس انتخاب پر حکمراں، یا اس کے خاندان، یا طبقۂ حاکم کا اقتدار کسی طرح اثر انداز نہ ہوتا ہو۔

اسلام نے فرد کو یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ زندگی کی تمام طیبات سے اس طرح لطف اندوز ہو کہ نہ تو خود اسے کوئی نقصان پہنچے اور نہ دوسرے کے لیے باعث تکلیف بنے۔ اسے حق حاصل ہے کہ اسلامی حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے وہ پبلک کے متعلق معاملات و مسائل پر آزادانہ غور و فکر کرے، کیوں کہ شریعت اسلامیہ میں تفصیلات ہر نسل کی ضرورت اور اس کے مخصوص حالات پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

Marfat.com

"تم اپنی دنیا کے مسائل سے زیادہ آشنا ہو۔"

گویا اس فرمان مبارک کے ذریعے لوگوں کو یہ آزادی دے دی گئی کہ وہ حدود اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے دنیاوی مسائل کے متعلق تصرفات میں آزاد ہیں۔ فرد کے لیے ہر وہ عمل اور ہر وہ سوچ جائز ہے جو خلاف عقیدہ نہ ہو اور مفاد عامہ کے منافی نہ ہو۔ اسلام نے تو اعتقادی پہلو میں بھی صرف اصول عام ہی کو پیش نظر رکھا ہے کہ خدا ایک ہے اور تمام انسان صرف اسی کے بندے ہیں اور اس کے بعد کی تفصیلات فرد پر چھوڑ دی ہیں۔ مسیحی کلیسا کی طرح لوگوں کو کچھ مخصوص افکار رکھنے پر مجبور نہیں کیا ہے کہ جو یہ افکار نہ رکھے وہ مسیحیت سے خارج اور کافر سمجھا جائے، جبکہ بذات خود یہ افکار علمی لحاظ سے درست بھی نہیں ہیں۔ اسی جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی قوم کلیسا اور مذہب دونوں ہی سے باغی ہو گئی۔۔۔ اسلام میں تو لوگوں میں اختلاف ہے کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی تھی؟ قرآن حادث ہے یا قدیم ہے؟ اور حضرت آدمؑ اولین مخلوق ہیں یا گزشتہ مخلوقات کے خلیفہ ہیں؟۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ ان میں سے کسی بھی نقطۂ نظر سے اصل عقیدہ پر کوئی بھی زد نہیں پڑتی اور ان میں سے کوئی بھی گروہ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

اس پر بھی تعجب یہ ہے کہ اشتراکی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک آمرانہ نظام ہے حالانکہ ان کے یہاں تو سانس باہر نکالنے کے لیے ریاست کی اجازت ضروری ہوتی ہے اور سانس اندر لینے کے لیے ہوا کی مقدار متعین ہوتی ہے۔

ارتداد ایک اجتماعی مسئلہ ہے

کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو جائے، کیونکہ ارتداد کی سزا اسلام نے قتل متعین کی ہے۔ بظاہر یہ بات شخصی آزادی کے دائرے میں آتی ہے مگر فی الحقیقت ارتداد شخصی مسئلہ نہیں ہے،

Marfat.com

اس موضوع پر میں کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا اور نہ ان دلیل بازوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان سیکڑوں اور ہزاروں افراد کو زندگی سے محروم کر دینا کہاں تک درُست ہے جو اسٹالن کو نہیں مانتے تھے؟ جب اسٹالن کو تسلیم کرانے پر اس قدر خوں ریزی ہو سکتی ہے تو خالقِ اسٹالن کے ماننے سے گریز کس لیے؟ — بلاشبہ غیر مسلم کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ جو چاہے نظریہ رکھے، کسی کو اس کے عقیدے میں مداخلت کا اختیار نہیں حتیٰ کہ اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہوئے بھی نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج (بقرہ : ۲۵۶)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے"۔

البتہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو جانے والے کو ضرور سزا دی جائے گی۔ ارتداد کا مفہوم کیا ہے؟ اگر ہم اس مسئلہ کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ ابتداء میں جو لوگ مرتد ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر زکوٰۃ کی وجہ سے مرتد ہوئے ہیں۔ گویا انھوں نے ایک ایسے ناگزیر امر سے پہلو تہی کی ہے جس کا عمومی فائدہ تمام معاشرے کو پہنچتا ہے اور اس معاشرے کو پہنچتا ہے جس میں وہ خود رہ رہے ہیں اور جس کی آسائشوں سے خود بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے ان مرتدین سے مقابلہ اور ارتداد کی روک تھام بھی معاشرے کے لیے اور معاشرتی مفاد کے لیے ہے، کسی حاکم کے ذاتی فائدے کے لیے نہیں ہے۔

ایمان کے بعد مرتد ہو جانے کا مطلب صرف یہ نہیں۔ ہے کہ ایک شخص نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا بلکہ اس کا مفہوم ایک مکمل اور قائم شدہ نظام میں خرابی اور گڑبڑ پیدا کرنا ہے۔ اسلام بھی ایک عملی نظام ہے جو اس عقیدہ

Marfat.com

پر قائم ہے اور ایک معاشرہ ہے جو اس عقیدے پر قائم ہے۔ اسلام کے تمام احکام بیک وقت فرد اور معاشرہ دونوں کے مفاد پر مشتمل ہیں۔ اس لیے ارتداد شخصی معاملہ نہیں بلکہ ایک ایسا اجتماعی مسئلہ ہے جس کے نقصان سے سارے معاشرے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

صرف اللہ سبحانہٗ کی بندگی انسان کو ہر مادی اور دنیاوی قوت کے سامنے سرنگوں ہونے سے بچا لیتی ہے، خواہ وہ ظالم اقتدار ہو یا مال و دولت کی شان و شوکت ہو۔ جس کے سامنے وہ افراد اور سماج ذلیل ہوتے رہتے ہیں جو خدائے واحد پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہی ایمانِ کامل سچے مومن کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ وہ سرکش حاکم کو ظلم و جبر سے روکے اور اس کو قانون الٰہی سے باہر نہ نکلنے دے۔ اس لیے اگر حاکمِ وقت قانون اسلامی کے مطابق مرتد پر ارتداد کی سزا جاری کرتا ہے تو یہ اس کے مفاد میں نہیں ہے بلکہ یہ تمام لوگوں کے مفاد میں ہے۔

اسلام اور فرد اور معاشرے کا ربطِ باہم

اس مقام تک ہم یہ جائزہ لے چکے ہیں کہ اسلام ایک مسلم فرد اور مسلم معاشرے میں کس قسم کا ارتباط قائم کرتا ہے۔ اسلام میں فرد اور معاشرے کا ربط باہم حقوق و فرائض میں باہمی کفالت اور تعاون کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے اور اس ارتباط و تعلق میں اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی ہے کہ معاشرہ استحصالی طبقے اور استحصال کے شکار طبقے میں تقسیم ہو سکے۔ یا یہ کہ سماج میں ایک طبقہ نفرت کرنے والا ہو اور دوسرا نفرت کا شکار ہو، ایک طبقہ مالکین کا ہو اور دوسرا محرومین کا ہو اور دونوں میں نفرت و عداوت قائم ہو۔ اسلام میں فرد کے اس احساس کی بھی گنجائش نہیں کہ فرد سماج کو اپنے پاؤں کی بیڑیاں خیال کرے اور معاشرے کو ایسا درندہ تصور کرے جو اسے پھاڑ کھانے گا۔ یہاں یہ بھی نہیں ہے کہ معاشرے کے تمام افراد اپنے آپ کو باہم متضاد قوتیں متصور کریں اور ہر قوت دوسری قوت کو دبانے اور مغلوب کرنے میں لگی رہے تاکہ

Marfat.com

اس کی خواہشات کی آزادانہ تکمیل ہوتی رہے۔

اسلامی معاشرہ اگر اپنی صحیح صورت میں اور اصل شکل میں برپا ہو تو اس میں دیگر تمام معاشروں کی بہ نسبت ممتاز افراد کے راستے میں کم سے کم دشواریاں حائل ہو سکتی ہیں، کیوں کہ اسلامی معاشرے میں ممتاز افراد کی تمام تر جد و جہد کا ماحصل رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے جس پر معاشرے کے تمام افراد یقین رکھتے ہیں اور حتی الوسع اس مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔

رہ گئے وہ افراد جو جرم کے ریلے میں بہہ چکے ہوں تو ان کا علیحدہ مستقل حکم ہے جس پر ہم جرم و سزا کے عنوان کے تحت گفتگو کریں گے۔

جس قسم کا پاکیزہ اور صاف ستھرا سماج اسلام برپا کرتا ہے اس میں روایات معاشرے کے افراد کے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں اور نہ ایسے نکھرے ہوئے سماج میں روایات بلا وجہ اور فرسودہ ہوتی ہیں ــــ بلکہ فی الحقیقت یہ ایسی رکاوٹیں ہوتی ہیں جو ہر فرد کو سرکشی سے روکتی ہیں اور آپس میں ٹکراؤ اور تصادم سے بچاتی ہیں۔ اور یہ رکاوٹیں جہاں ایک فرد کی امنڈتی ہوئی خواہشوں کے راستے میں بند لگاتی ہیں وہاں یہ فرد کو دوسرے افراد کے ریلے سے بچانے کے لیے ڈھال کا کام بھی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے فرد بخوشی ان روایات کو قبول کر لیتا ہے اور ان پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا اور نہ انھیں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اقدار و روایات ختم ہو جائیں تو پھر وہ اپنی محدود قوتوں کے ساتھ تن تنہا سب لوگوں کی زیادتیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں اس مقام پر اس حقیقت کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ اسلامی معاشرے کے تمام افراد فرشتے نہیں بن جاتے، بلکہ افراد بغیر کسی اضطراب سے دوچار ہوئے اور بغیر کسی دباؤ (Suppression) کا شکار ہوئے اس قدر

Marfat.com

رفعت (Sublimation) حاصل کر لیتے ہیں جس قدر رفعت حاصل کرنا انسانی طاقت میں ہے۔ اور یہ ارتفاع بخوشی ہوتا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انھیں جس انسانیت سے نوازا ہے اور جس مکروہ حیوانیت سے ان کا مقام بلند کیا ہے، اس انسانیت کی تکمیل ارتفاع حاصل کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے ان تاریک ترین زمانوں میں جب اسلامی معاشرہ روحِ اسلام سے بہت دُور ہو چکا تھا اور نظامِ حکومت اور نظامِ معیشت سے اسلامی روح نکل چکی تھی، اس وقت بھی صرف صاحبِ اقتدار ٹولہ ہی بے راہرو اور منحرف ہوا تھا اور ان کے علاوہ باقی سارا معاشرہ بلند انسانی تعاون کے مطابق زندگی گزار رہا تھا اور سارے معاشرے میں نیکی کا چلن اور خیر کا رواج تھا اور جذبۂ خیر ہی تمام افراد کے عمل کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ وہاں کوئی دولت مند یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ وہ اس دولت کا تنہا مالک ہے اور کسی تنگدست کے ذہن میں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ معاشرے کا ایک دھتکارا ہوا اور راندہ و درماندہ فرد ہے۔

بلکہ اس وقت بھی جب سارا عالمِ اسلام ٹوٹ پھوٹ کر چھوٹی چھوٹی متحارب ریاستوں میں بٹ گیا تھا، اس وقت بھی حکومتیں ہی آپس میں نبرد آزما رہتی تھیں، مگر عام مسلمان اس وقت بھی پوری دنیائے اسلام میں آپس میں بھائی بھائی تھے۔ وہ اس وقت بھی باہم فراخدلی اور محبت اور تعاون کے جذبے سے پیش آتے تھے اور ایک دوسرے کی دشواریوں، ضرورتوں اور مشکلات میں کام آیا کرتے تھے۔

اسلام انسانیت کے لیے سراپا رحمت

تمام اسلامی معاشرہ، جس کا دامن ہندوستان سے اندلس تک پھیلا ہوا تھا، اس کے تعاون و محبت کا اعلیٰ و رفیع جذبہ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس جذبۂ بلند نے قبیلے، وطن اور مذہب کی تنگنائیوں سے

Marfat.com

نکل کر تمام انسانیت کو اپنے وسیع دامانِ رحمت میں سمیٹ لیا تھا۔

اسلامی معاشرہ جس وقت اپنے تمام محاسن کے ساتھ برپا تھا تو وہ صرف لوگوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کی صورت میں موجود نہیں تھا اور اس کے بارے میں صرف زبانی جمع خرچ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ ایک حقیقت تھی جو صفحۂ تاریخ پر روشن الفاظ میں مرتسم ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی نظام ہی وہ واحد اور منفرد نظام حیات ہے جس نے اس تعاون اور جذبۂ محبت کو خالص انسانی بنیادوں پر فروغ دیا اور اس میں کوئی شائبہ تک معاشی استحصال اور سیاسی لالچ کا نہیں پیدا ہوا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کی کوئی تشریح تاریخ کی مادی اور اقتصادی تعبیر

کے پاس نہیں ہے حالانکہ تاریخ

کی مادی تعبیر اس امر کی دعوے دار ہے کہ وہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعے اور لوگوں کے ذہنوں میں گزرنے والے ہر احساس کی تشریح کر سکتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی مثال ملاحظہ فرمائیے:

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک اندھے بوڑھے یہودی کو در در بھیک مانگتے دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں: "تجھے بھیک مانگنے پر کس چیز نے مجبور کر دیا؟" وہ کہتا ہے: "جزیے نے، ضرورتوں نے اور بڑھاپے نے۔" یہ جواب سُن کر حضرت عمرؓ کے گہرے انسانی جذبات اُبھر آئے۔ یہ حضرت عمرؓ وہ ہیں جن کو لوگ بڑی جہالت اور نادانی سے درشت مزاج اور سخت گیر کہتے ہیں اور آپ کی پیکرِ عزم اور مضبوط شخصیت کے ماوراء آپ کی اصل طبیعت پر غور نہیں کرتے۔ بہر کیف آپؓ اس یہودی کو اپنے گھر لے آئے، اس پر اپنی نرمی اور مہربانی کی بارش کی اور بیت المال سے اس قدر دلوایا کہ وہ مانگنے سے اور اپنی ضرورتوں سے بے نیاز ہو گیا اور خزانچی سے فرمایا: "اس قسم کے

Marfat.com

اور لوگوں کو بھی تلاش کرو، قسم بخدا ہم ان کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے، اگر ہم ان کے جوانی کے دور کی آمدنی کھاتے رہیں اور انھیں بڑھاپے میں گرتا پڑتا چھوڑ دیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ صرف ایک مسلمان کی حیثیت میں نہیں کیا بلکہ یہ وہ بلند جذبۂ انسانی تھا جس کو مذہبی دشمنی بھی ظاہر ہونے سے نہ روک سکی۔ حالاں کہ یہودی اسلام کے بدترین دشمن تھے، انھوں نے اسلام کا راستہ روکنے اور قبائل عرب کو اسلام کے خلاف بھڑکانے کے لیے وہ کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

مکہ کے مشرک قیدی بن کر مسلمانوں کے پاس آتے ہیں۔ یہ مشرک وہ ہیں جنھیں مسلمان کمترین خلائق سمجھتے تھے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان قیدیوں سے حسنِ سلوک کی تلقین فرماتے ہیں۔ تو مسلمان ان قیدیوں کو خود اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ انھیں وہ کچھ کھانے کو دیتے ہیں جو وہ خود بھی نہیں کھا سکتے، حالانکہ ان لوگوں سے جنگ ابھی تک جاری ہے۔

ابو عزیر بن عمیر بن ہاشم اپنی قید کا حال بتاتے ہیں؛

"جنگ بدر سے واپسی کے بعد میں انصار کی ایک جماعت کے ساتھ تھا، یہ لوگ کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر گزارہ کر لیا کرتے تھے۔"

تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں نے قیدیوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا ہے وہ مسلمانوں کی تاریخ کا اس قدر تابناک باب ہے کہ مسلمانوں کے بدترین دشمن صلیبی بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کیوں کہ اس حسن سلوک کی بنیاد نہ تو مذہب کا اشتراک تھا اور نہ کوئی مفاد اور مصلحت، بلکہ یہ خالص انسانی معاملہ تھا جو صرف انسانی بنیادوں پر رضائے الٰہی کے لیے کیا گیا۔

آج کا وحشی مغرب ان تمام ترقیات اور دعوئ تہذیب و تمدن کے باوجود ان میں سے کسی بھی بات تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ نہ قیدیوں کے معاملے میں، نہ ممالک مفتوحہ کے بارے میں اور نہ ان سیاہ فام لوگوں

Marfat.com

کے بارے میں جو عیسائیت قبول کر چکے اور افریقہ و امریکہ میں بستے ہیں۔

اس وحشت و بہیمیت کا اسلام کی بلند انسانی تعلیمات سے کیا مقابلہ؟

اسلام تو رنگ و نسل، وطن و مذہب اور اختلاف مصالح کے باوجود تمام انسانیت کو اپنے دامان اخوت میں سمیٹے ہوئے ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں "جذبۂ انسانیت، انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسانوں سے گزر کر چرند و پرند تک وسعت اختیار کر گیا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"ایک شخص سفر میں تھا، اسے سخت پیاس لگی۔ وہ ایک کنوئیں میں اُترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ باہر آکر دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور شدتِ پیاس سے زمین کی نمی چاٹ رہا ہے۔ وہ شخص اپنے دل میں کہنے لگا، 'اِس کتے کی بھی وہی حالت ہے جو کچھ دیر پہلے میری تھی'، یہ سوچ کر وہ دوبارہ کنوئیں میں اُترا اور اپنے جوتے میں پانی بھر کر دانتوں سے پکڑ کر لایا اور اس کُتے کو پلا دیا' اللہ سُبحانہٗ نے اس کے اس عمل کو قبولیت عطا کی اور اس کے گناہ معاف فرما دیے۔"

صحابہ کرامؓ نے استفسار کیا: "کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے پر بھی ثواب ہے"؟ آپؐ نے فرمایا: "ہر جاندار کے ساتھ نیکی کرنے پر ثواب ہے"۔

نیز آپؐ نے فرمایا: "اگر کوئی شخص کوئی پودا لگا دے اور اس پودے کے پھل کو کوئی پرندہ یا جانور کھالے، تو اسے اس عمل پر بھی ثواب ملے گا"۔

ملاحظہ فرمائیے! یہ ہیں اسلام کی بلند اور پاکیزہ تعلیمات جن کو انسان از خود رفتہ ہو کر انتہائی تعجب اور حیرت سے دیکھتا ہے!

Marfat.com

جرم اور سزا

جرم کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر

جرم اپنی اکثر صورتوں میں فرد کی جماعت پر زیادتی ہوا کرتا ہے، اس لیے طبعی طور پر فرد اور معاشرے کے تعلق کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے باعث خود جرم کے بارے میں بھی نقطۂ نظر مختلف قوموں میں مختلف ہونا چاہیے۔

وہ اقوام جو فرد کی شخصی آزادی کے بارے میں مبالغہ سے کام لیتی ہیں اور یہ خیال رکھتی ہیں کہ فرد کا اپنا ذاتی تشخص بغیر کسی رکاوٹ کے بروئے کار آنا چاہیے۔ وہ نہ صرف یہ کہ جرائم کی گرفت میں تساہل برتتی ہیں بلکہ الٹا معاشرے کو افراد کی جرم پسندی کا مورد الزام ٹھیراتی ہیں، کیوں کہ --- ان کے خیال میں --- معاشرے نے ان پر پابندیاں لگائی ہیں اور ان کی آزادی کو پابہ زنجیر کر دیا ہے اور اس طرح خود مجرم معاشرے کی زیادتیوں کا شکار رہتا ہے۔ اس لیے فرد کو معاشرے سے اس کی زیادتیوں کا تاوان دلوانا چاہیے نہ یہ کہ مجرم کو سزا دی جائے۔

اس کے برعکس وہ اقوام جو کلیت پسندانہ (Totalitarian) نظام رکھتی ہیں وہ مبالغہ آمیز حد تک فرد کی قیمت گھٹا دیتی ہیں، وہ سرے سے افراد کے مستقل وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس لیے وہ افراد کے جرائم اور ان کی بے راہرویوں پر پوری شدت اور سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہیں کیونکہ ان کی نظر میں فرد کی کوئی حیثیت اور مقام نہیں ہے جبکہ جماعت ایک انتہائی

Marfat.com

مقدس شئے ہے، اس لیے ایک بے حیثیت فرد کو' مقدس اجتماعی نظام' پر دست درازی کی کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے؟

دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی میں اسلام ہی وہ منفرد ضابطۂ حیات ہے جو جرم و سزا کے بارے میں اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور یہ نقطۂ نظر انسانی دنیا کی ممکنہ حدود میں مطلق و کامل انصاف کا حامل ہے۔ وہ نہ جماعتی حقوق میں مبالغہ کرتا ہے اور نہ فرد کے احترام میں انتہاء پسندی اختیار کرتا ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر بلاوجہ ترجیح نہیں دیتا۔ اور یہ امر ایک فطری اور طبعی نتیجہ ہے اس زاویۂ نظر کا جس سے اسلام انسان کو دیکھتا ہے۔ اسلام انسان کو اس کے دنیاوی ماحول میں بند ہو کر نہیں دیکھتا، وہ اس کے متصادم گوشوں اور متضاد پہلوؤں سے اس کا مطالعہ نہیں کرتا، بلکہ اسلام بلندی سے مطالعۂ انسان کرتا ہے، وہ انسان کو آفاق کے کناروں سے جھانکتا ہے اور وہ پورے انسان کو ایک بھرپور منظر سے دیکھتا ہے، وہ اس کے نفس کی گہرائیوں میں پنہاں سرسراتے ہوئے خیالات اور اس کی عملی زندگی میں پوری سرگرمی اور جوش کے ساتھ انجام دیے جانے والے اعمال سے بیک وقت واقف اور پوری طرح آشنا ہے۔

اسلام جس زاویۂ نظر سے انسان کو دیکھتا ہے اس میں انسانی افراد اور گروہ باہم متصادم ٹوٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے اجزاء نہیں ہوتے، بلکہ ساری انسانیت باہم مربوط و متصل اور پیوستہ ہوتی ہے، اس طرح کہ اس کے متفرق اجزاء کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کی نظر میں روئے زمین نہ تو خیر خالص ہے اور نہ سراپا شر اور برائی، بلکہ ایک ایسی ملی جلی شئے ہے کہ اس میں برائی کا چشمہ بھی اُبل سکتا ہے اور خیر و بھلائی کے سوتے بھی پھوٹ سکتے ہیں، اور عمل تخلیق کے تمام تر تانے بانے ایک ماہر خالقِ کائنات کے ہاتھ میں ہیں، جو ان کو کھینچ تان کر انسان کی ساخت کو استوار کرتا رہتا ہے۔

غرض انسان کے بارے میں اسلام کا ایک مکمل، متوازن اور نہایت گہرا

Marfat.com

نقطۂ نظر ہے جس کے تحت وہ انسان پر نظر ڈالتا ہے اور انسان کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور اسے عبادات، معاملات، اجتماعیات، اقتصادیات اور جرم وسزا کے اندازے اور تشخیص میں راہنمائی دیتا ہے۔

شخصی آزادی

انفرادیت پسند اقوام میں فرد کی ذات کو مقدس گردانا گیا ہے۔ مطالعۂ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ نظریہ نومولود ہے، ماضی میں تقدیس بہت ہی تنگ دائرے میں محدود تھی اور انسانی گلے پر حکمرانی کرنے والے سردار ہی کو اس کا مستحق گردانا جاتا تھا۔ عوام کسی شمار ہی میں نہ ہوتے تھے، ان کے کوئی حقوق نہیں تھے، البتہ ان پر ٹیکس لگتے تھے اور ہر ذمے داری کا پھندا ان کے گلے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ تقدیس و احترام سردار قبیلہ سے طبقۂ اشراف، اہل مذہب اور صاحب جاگیر لوگوں کی جانب منتقل ہوگئی۔ اور بالآخر کچھ خونی اور پُرامن انقلابات کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور پسے ہوئے انسانی گلے نے اقتدار سنبھالنا شروع کیا اور چونکہ فرد اقتدار کا سرچشمہ بن گیا اس لیے تقدیس و احترام بھی فرد کی جانب منتقل ہو گیا۔

اشتراکیت کہتی ہے کہ عوام ہمیشہ سے غلام چلے آ رہے ہیں، پہلے آقا، جاگیردار تھا پھر کارخانے دار یا سرمایہ دار ہو گیا —— حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والے ممالک میں فرد کا اقتصادی ڈھانچہ تو بلاشبہ مکمل طریقے پر سرمایہ دار کے تابع ہے، مگر خود فرد —— اقتصادیات کے علاوہ —— ہر شعبۂ زندگی میں بے پناہ شخصی آزادی برت رہا ہے، اور ہر ادب و تمیز سے بے پرواہ شخصی احترام سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ عالمی اخبارات نے قارئین کی دل چسپی اور خوش وقتی کے لیے ایک خبر شائع کی تھی، جو ہمارے مندرجہ بالا بیان پر ایک اچھی دلیل ہے:

"امریکی کانگرس کے اجلاس کے دوران کانگرس ہال کے سامنے

Marfat.com

کی کھڑکی میں ایک امریکی خاتون مکمل برہنگی کی حالت میں کھڑی ہو گئی، جس کی بناء پر قابلِ احترام ممبروں کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور امورِ ریاست تعطل کا شکار ہو گئے ـــــ اس صورتِ حال کا نوٹس لیتے ہوئے صدر کانگرس نے ـــــ خاتون کو ـــــ یا دوشیزہ کو ـــــ پیغام بھیجا کہ یا تو وہ اندر چلی جائے، یا لباس پہن کر کھڑی ہو تا کہ کانگرس سیاستِ عالم پر غور کر سکے۔"

گو یا بہر اس میدان زندگی میں تو شخصی آزادی کی فراوانی ہو گئی جس میں اس آزادی کو پابند قیود ہونا چاہیے تھا، اور یہ شخصی آزادی اس میدان میں پا بہ زنجیر کر دی گئی جہاں انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ اس قید و بند میں اعتدال برتا جاتا۔ اس اباحیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنی شخصی آزادی کے برتنے میں انتہائی فراخدلی کا ثبوت دیا اور اس طرح کچھ افراد نے دوسرے افراد کے حقوق پامال کرنے شروع کر دیے اور افراد نے معاشرے کی بنیادیں کھسکانی شروع کر دیں۔ اس طرح معاشرے کے تمام افراد کے مفادات کی نگرانی کے منصب کو صدمہ پہنچایا اور اس پر ضرب کاری لگائی۔

ماضی میں تو قانون کی گرفت مضبوط تھی اور قانون کسی ایسے فرد کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑتا تھا جس نے زیادتی کی ہو، بالخصوص اس وقت جب اس کی زیادتی کا ہدف سردار قبیلہ بنا ہو (خواہ نفس الامر میں اس کی یہ زیادتی جرم نہ ہو۔) مگر ایک تدریجی عمل کے ساتھ سزاؤں کی سختی اور تندی میں کمی آتی رہی اور نوبت بایں جا رسید کہ بالآخر ایک ہی جرم ایسا باقی رہ گیا جس پر سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک میں سختی کی جاتی ہے ـــــ اور وہ جرم ہے کوئی ایسی زیادتی جس کے ارتکاب سے سرمائے پر زد پڑتی ہو ـــــ رہ گئے دیگر جرائم اور عام طور پر اخلاقی جرائم، تو ان کے لیے حیلے بہانے تراشے جانے لگے اور سزاؤں میں حد درجہ نرمی برتی جانے لگی، اور بسا اوقات جرائم کو اس قدر معمولی بات سمجھا گیا کہ عدالت نے دو جملوں میں

Marfat.com

مجرم کو نصیحت کر دی اور بس ..... سارا معاملہ تمام ہوا۔

جُرم اور تحلیلی نفسیات

اِس موقعہ پر جُرم کی وجہ جواز بیان کرنے کے لیے تحلیلی نفسیات درمیان میں آجاتی ہے۔ چنانچہ آلڈوس ہکسلے (Alduous Huxley) اپنی کتاب (Texts & Pretexts) میں کہتا ہے:

"اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ ماہر تحلیل نفسیات اخلاقی مجرم کی طرف داری کرے۔"

ظاہر ہے تحلیلی نفسیات (Psycho Analysis) کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ مجرم کی طرف داری کرے۔ کیوں کہ یہ تحلیلی نفسیات ہی تو ہے جس نے انسان کو بلند آفاق سے اتار کر اسفل السافلین میں لا پھینکا ہے اور ایک بلند و بالا پھل اور پھولوں سے لدے ہوئے درخت کو مٹی میں گڑے ہوئے بیج کی حیثیت میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسان کی صورت مسخ کرنے کے اس عمل میں تحلیلی نفسیات یہ تاثر دیتی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں کیوں کہ اس کا مرکزِ توجہ بلند آفاق والا انسان نہیں ہے بلکہ وہ سرچشمۂ اصلی ہے جس سے تمام اعمال کا صدور اور ظہور ہوتا ہے یعنی فطری میلانات اور سرکش شہوانی طاقت۔ ماہر تحلیلی نفسیات کے پیش نظر یہ بات ہرگز نہیں ہوتی کہ شہوانی طاقت کے علاوہ بھی انسان میں کچھ قوتیں پنہاں ہیں جن میں وہ قوت بھی شامل ہے جو اس شہوانی طاقت کو بھی کنٹرول کرتی ہے۔ یا اگر یہ قوتیں ماہر تحلیل نفسی کے پیشِ نظر ہوتی بھی ہوں تو اس کا زاویۂ نظر مختلف ہوتا ہے، کیونکہ وہ تو نفسیاتی امراض کے مطالعے میں مشغول ہے جو اس اخفاء (Repression) سے ظہور میں آتے ہیں جو نفس کی گہرائیوں میں غیر محسوس طریقے پر سرکش شہوانی طاقت اور اس پر لگائی ہوئی داخلی اور خارجی بندشوں کے تصادم سے رونما ہوتا ہے۔

Marfat.com

لہٰذا تحلیل نفسیات کا ماہر (Psycho Analyst.) ان قیود اور بندشوں پر نفرت اور غصے کی نظر ڈالتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ فرد کے حق میں یہ قیود مجرمانہ ہیں، ان قیود کی بنا پر فرد کو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، اس کا عملِ نشاط معطل اور اس طرح پراگندہ ہو جاتا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں رہتا۔

ماہرِ نفسیاتِ تحلیلی جس قدر حوادثِ شاذّہ (Abnormal cases) میں اُلجھتا ہے اسی قدر اس کی معاشرتی حدود و قیود سے دشمنی اور عداوت بڑھتی جاتی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر ہر معقول اور غیر معقول بندش کا دشمن بن جاتا ہے۔

چونکہ فرد پر بندشیں اور قیود معاشرے کی جانب سے لگائی جاتی ہیں اس لیے ماہر تحلیلی نفسیات کی نظر میں معاشرہ مجرم ہے اور یقیناً مجرم ہے۔ معاشرہ اپنے موقف کے جواز میں خواہ کتنا ہی زور صرف کرے اس کے جرم کی شدت میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی اور اس کا یہ کہنا بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ وہ یہ بندشیں اس لیے عائد کرتا ہے تاکہ افراد سرکش شہوتوں اور متنوع میلانات کے باہمی تصادم سے محفوظ رہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود تحلیلی نفسیات کے ماہر کا اخلاقی مجرم کی طرفداری کرنا درست نہیں قرار پا سکتا، بلکہ اس کی جانب سے جو اُمور جرم کے جواز میں پیش کیے جاتے ہیں ان سے جرم کی تعبیر و تشریح تو ضرور ہو جاتی ہے اور ان پے در پے وقوع پذیر ہونے والے نفسیاتی اقدامات کی وضاحت یقیناً ہو جاتی ہے جو بالآخر جرم کا سبب بن جاتے ہیں، مگر جرم کا جواز قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل تحلیلی نفسیات کے ماہر کے پیشِ نظر وہ کنٹرول کرنے والی قوت نہیں ہے جو انسان میں موجود ہے اور جو بہر حال ایک سائنسی حقیقت ہے اور اس کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

بلکہ جو نظریات اور قوانین اس قوت کو نظر انداز کر کے یا اس کو بے قیمت قرار دے کر وضع کیے جائیں گے وہ یقیناً غلط اور غیر صحیح ہوں گے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی بالکل غلط ہے کہ ہر مجرم ایک نفسیاتی مریض ہے، جس کے جرم میں خود اس کا کوئی ارادہ شامل نہیں ہوتا بلکہ اس پر معاشرے کی جانب سے زیادتی ہوئی ہوتی ہے، جس پر بجائے اس کے کہ اسے سزا دی جائے اس کے اس شذوذ (Abnormality) کا علاج کیا جانا چاہیے۔

اس تمام نقطۂ نظر کی اصل بنیاد نفسیاتی جبریت (Psychical Determinism) اور اس پر مرتب ہونے والے قواعد و ضوابط ہیں، اور فرائڈ اس میدان کا شاہسوار ہے اور اس خطرناک نفسیاتی اصول کی وضع و ترتیب کا سہرا اسی کے سر ہے۔

فرائڈ کے بارے میں اس کتاب میں پہلے ہی گفتگو کی جا چکی ہے اور خود اس کی ابنارملٹی (Abnormality) کے اسباب بیان کیے جا چکے ہیں اور یہ نتیجہ پیش کیا جا چکا ہے کہ اس نے اپنے نظریات کی تطبیق میں جو انتہا پسندی اور یک رخا پن اختیار کیا ہے اور انسان کے ارفع و اعلیٰ پہلوؤں کو فراموش کر کے اس کے صرف اس پہلو پر سارا زور صرف کر دیا ہے جو اس کو گندگیوں میں لتھیڑ دے — اسی یک رخے پن کی بناء پر اس کے نظریات کی علمی حیثیت ماند پڑ گئی ہے اور اس کی تطبیق کے امکانات محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ مغربی دنیا میں بعض جرائم کے محرکات کا سراغ مسیحی تعلیم کے غلط انطباق (Application) اور اس اخفا (Repression) میں ملتا ہے جس کا فی الواقع کوئی جواز موجود نہیں ہے — کیوں کہ اگر ہر فطری میلان پر قدغن لگا دی جائے، اور نفس کی گہرائیوں میں اس کے احساس تک کو حرام قرار دے دیا جائے تو اس سے یقیناً وہ

Marfat.com

تباہ کن کشمکش پیدا ہوگی جو بعض اوقات جرائم کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

مگر اس نظریے کو جملہ جرائم پر منطبق کر دینا، نہ صرف یہ کہ علمی حقائق سے بہت دُور ہے، بلکہ ایک نہایت خطرناک عمل بھی ہے، کیونکہ اباحیت کے پوری طرح پھیل جانے کے بعد دَورِ جدید کی مغربی دنیا میں بیشتر جرائم کا محرک اخفاء (Repression) نہیں ہوتا، اس لیے کہ اب معاشرے کی خارجی اور داخلی نگرانی ہی ختم ہو گئی، اب تو معاشرہ جنسی عمل کو ناجائز ہی نہیں کہتا۔ (جبکہ فرائڈ اور تحلیلی نفسیات کے دیگر ماہرین کے نزدیک جرم کا اصلی باعث اخفاء ہی ہے) —— اب تو اس شتر بے مہار سماج میں جرائم بے قیدی اور اباحیت ہی کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں، کیونکہ بے قیدی اور اباحیت پر ہر شخص زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر اپنی ذات کا اثبات —— (Self Assertion) چاہتا ہے، جس کے نتیجے میں مطلوبات میں منازعت اور خواہشات میں تصادم ہوتا ہے اور جرائم وجود میں آتے ہیں۔

دنیائے مغرب کی تربیت اطفال کے پیشِ نظر یہ ہے کہ بچوں کی خواہشوں پر قدغن نہ لگائی جائے —— کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اخفاء (Repression) کا شکار ہو جائیں —— اس تربیت کا لازمی نتیجہ یہی تو ہونا ہے کہ فرد جس حد تک چاہے اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتا ہؤا چلا جائے اور اس کو وہ اپنا قابلِ احترام حق سمجھے اور اس حق میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرے —— اس نظامِ تربیت کے ساتھ ہی تحلیلی نفسیات اور تجربی نفسیات کے ماہرین بھی فرد کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں اور وہ اس نظامِ اباحیت کے مختلف جواز بیان کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ دراصل نفسیاتی جبریت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان حیوانیت کے مقام پر اُتر آئے۔

آج کا بے قید مغربی معاشرہ اسی نظامِ تربیت اور اسی علمِ نفسیات پر

Marfat.com

استوار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، پھر ان جرائم کے نئے نئے وجوہِ جواز تلاش کیے جاتے ہیں۔ سماج بھی ان جرائم کو ناقابلِ مزاحمت امرِ واقعی سمجھ کر ان سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے، اور اگر سماج چاہے بھی تو وہ ان جرائم کی روک تھام سے عاجز ہے کیونکہ یہ جرائم نفسیاتی جبریت کی پیداوار ہیں اور نفسیاتی جبریت پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

جُرم کے بارے میں اشتراکیت کا نقطۂ نظر

اشتراکیت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جرائم کے محرکات نفسیاتی یا جنسی نہیں ہوتے بلکہ اس کے اسباب اقتصادی ہوتے ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے ایک غیر متوازن معاشرے میں جرائم کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے، کیونکہ جلنے کڑھنے والے غریبوں کے نفوس میں اور نازوں کے پالے امراء کے دلوں میں فضائلِ اخلاق نہیں پنپنے پاتے، اسی لیے سرمایہ دار ممالک میں جرائم کا وقوع ایک امرِ طبعی ہے۔ اس کی نہ تو کوئی مزاحمت کی جا سکتی ہے اور نہ ان جرائم پر سزائیں جاری کی جا سکتی ہیں، کیونکہ جب تک یہ غیر متوازن اقتصادی نظام موجود ہے جرائم کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ہم اقتصادی جبریت کا پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔

اشتراکی دنیا میں عملاً کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ ہم تک جو باتیں پہنچ رہی ہیں یا تو وہ ان کے حق میں پروپیگنڈہ ہے یا پھر ان کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔ خیر بہر حال ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے یہاں جرائم ختم ہو چکے ہیں، اگرچہ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ عدالتیں اور قید خانے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے چوری ختم ہو گئی ہو کیونکہ جب ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق روٹی، کپڑا فراہم کر دیا جائے تو چوری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ یہ خبریں بھی آتی ہیں کہ ایک تیرہ سالہ لڑکے کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا جس نے زیادہ خوراک

Marfat.com

حاصل کرنے کے لیے خوراک کے کارڈ میں جعلسازی کی تھی، اس پر عدالت نے اسے تنبیہہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے، اور اس نصیحت کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا۔ ہو سکتا ہے یہ سب پروپگنڈہ ہو۔

اصل بات تو یہ ہے کہ اشتراکی، اخلاق کی کسی ذاتی قدر و قیمت کا اعتراف ہی نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں اخلاق سرمایہ داروں کی من گھڑت چیز ہے جو انھوں نے اس لیے گھڑ لی ہے تاکہ ان کا اقتدار برقرار رہے، اور بھوکے ننگے عوام کا دست انتقام ان کی قبائے اقتدار چاک نہ کر سکے۔ جب سرمایہ دار ہی نہ رہے اور ان کا اقتدار ہی باقی نہ رہا تو پھر اخلاق کی کیا ضرورت ہے؟

اشتراکی جنسی جرائم کو جرائم نہیں سمجھتے، کیوں کہ وہ مقام حیوانیت سے بلند و ارفع انسانیت کے وجود پر یقین نہیں رکھتے، نیز وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ انسانی گلّے کو جنسی مسئلے میں کھلی چھٹی دے دیں، تاکہ ان کی گھٹی ہوئی قوتوں کا اخراج ہوتا رہے اور یہ قوتیں مجتمع ہو کر کسی دن اس نظام کی شکست و ریخت پر نہ لگ جائیں[1]۔

---

[1] پہلے تو اشتراکی دعویٰ کرتے ہیں کہ اشتراکیت کو کسی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اشتراکیت لاکھوں افراد کا محبوب نظام ہے ــــ یہ درست سہی کہ اشتراکیت لوگوں کے مخصوص ذاتی مفاد کی تکمیل کرتی ہے مگر اس سے اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں سے انفرادی آزادی چھین لینے کا کسی وقت بھی یہ انجام ہو سکتا ہے کہ لوگ اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اگر پہلے سے احتیاطی تدابیر نہ کر لی گئی ہوں تو وہ اسے ختم کر کے رکھ دیں۔

پھر دوسرے مرحلے میں اشتراکی دعویٰ کرتے ہیں کہ روس اخلاقی محافظت کی جانب لوٹ آیا ہے۔ اب خواہ یہ دعویٰ درست ہو یا صرف پروپگنڈہ ہو

(۴)

دنیائے اشتراکیت کا واحد جرم

اشتراکی دنیا میں سب سے بدترین جرم اشتراکی نظام پر یا اس نظام کے کسی مقدس خداوند، بالخصوص خداوند لینن[1] پر تنقید کرنا ہے۔ یہ ایسا جرم عظیم ہے جس کے سرزد ہوتے ہی آسمان پھٹ پڑتا ہے اور زمین کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ وہ عدالتیں جو جرائم پر سزا دینے کے بجائے نصیحتیں کرنے کو ترجیح دیتی ہیں، ان کی رحمت و رأفت کے سوتے یک لخت خشک ہو جاتے ہیں۔ اشتراکی ریاست کو یہ حقیقت بالکل یاد نہیں رہتی کہ اشتراکی نظام تو ایک مضبوط قلعہ ہے اس میں کون شگاف ڈال سکتا ہے، اور پروپیگنڈا باز یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ اشتراکی نظام "ایسی اقتصادی جبریت ہے جس کے سامنے ساری کائنات سرنگوں ہے، اور یہ جبریت اس قدر زبردست ہے کہ اسے کسی قانون تک کی ضرورت نہیں ہے —— یہ سب حقائق فراموش کر کے ساری اشتراکی ریاست اس گناہگار مجرم پر عذاب کا کوڑا لے کر ٹوٹ پڑتی ہے۔ پھر اگر اس کے ساتھ کچھ نرمی برتی تو اسے قید حیات سے آزاد کرنے کے لیے پھانسی گاہ (Gallows) بھیج دیا اور سختی برتی تو سائبیریا کے برفانی علاقوں میں سزائے مشقت کے لیے روانہ کر دیا گیا، اس نیک کام سے نمٹ کر روسی اخبار بڑی شان سے نکلتے اور بڑے فخر سے سرخیاں جماتے ہیں کہ ریاست نے اشتراکی نظام کے تحفظ کے لیے ناپسندیدہ عناصر کی تطہیر کر دی ہے۔

(م) مگر اس میں اس بات کی تائید ضرور ہے کہ اسلامی نظام جو اخلاق کو اہمیت دیتا ہے وہی صحیح نظام ہے۔

[1] جب لینن آنجہانی ہو گیا تو روس نے اسی لینن کے خلاف اسٹالن کو برا بھلا کہنے کی اجازت دے دی۔

Marfat.com

یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی ان میں یہ ہمّت و جرأت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ مرتد ہو جانے والے مسلمان کی سزا پر تنقید کریں اور اس بے چارے غریب پر رحم کھائیں جس کا آزادیٔ فکر کے سوا اور کوئی جرم نہیں تھا۔ (مگر اسلام نے اسے موت کی سزا سُنا دی)۔

اسلام میں انسدادِ ظلم کی ذمّے داری اجتماعی ہے

گزشتہ باب میں ہم ارتداد کے بارے میں گفتگو کر چکے ہیں اور آئندہ حدود اسلام پر بحث کے دوران ہم اس موضوع پر مزید کلام کریں گے، مگر یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی نظام میں حکمراں کی شخصیت کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہے اور نہ اس پر تنقید کرنا ممنوع ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ حاکم شریعت کے فہم اور اس کے نفاذ میں غلطی کر رہا ہے تو وہ اسے متنبہ کرے اور اس پر تنقید کرے۔ چنانچہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو حکم فرمایا کہ وہ ظالم حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ لیں، اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ (الانفال: ۲۵)

"اور ڈرتے رہو اس وبال سے جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

گویا اسلام میں ظالم حکمراں کو ظلم سے باز رکھنے کی ذمے داری اجتماعی ہے اور اس ذمے داری میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس ظالم کے ظلم پر خاموشی اختیار کرتے ہیں، اگرچہ خود ظلم نہیں کرتے۔

اسلام۔ اور جرم و سزا

اب ہم اسلام میں جرم و سزا کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں:

بڑے بڑے جرائم جن پر اسلام سزا جاری کرتا ہے اور جن کا ذکر درج ذیل

Marfat.com

آیات و احادیث میں آیا ہے وہ یہ ہیں[1]:

۱۔ قتل، ۲۔ چوری، ۳۔ زنا، ۴۔ مے نوشی، ۵۔ ارتداد، ۶۔ اور فساد فی الارض (ملک میں بدامنی پھیلانا)۔

۱۔ قتل

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط

(الانعام: ۱۵۱)

"اور جس جان کو اللہ نے محفوظ کر رکھا ہے، اسے قتل مت کرو بجز حق (شرعی) کے۔"

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ط (البقرہ: ۱۷۸)

"اے ایمان والو، تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔"

وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط (المائدہ: ۴۵)

"اور ہم نے ان پر اس میں یہ فرض کر دیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت اور زخموں میں قصاص ہے۔"

---

[1] اس مقام پر ہم نے صرف ان جرائم کا ذکر کیا ہے جو اہم ترین ہیں اور جن میں حدود نازل ہوئی ہیں، کیونکہ ہمارا مقصد اس سلسلے میں اسلام کے عمومی تصور کو بیان کرنا ہے، جبکہ کتب فقہ میں ان جرائم کے بارے میں' اور ان جرائم کے بارے میں جو حدود سے کم ہیں، اور جن میں صرف قید اور تعزیری سزا ہے، کافی تفصیلات موجود ہیں۔

Marfat.com

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿الاسراء: ۳۳﴾

"اور جو کوئی ناحق قتل کیا جائے گا، سو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دے دیا ہے، سو (اسے چاہیے کہ) قتل کے باب میں حد سے آگے نہ بڑھے۔ بے شک وہ شخص قابلِ طرف داری ہے۔"

"جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم بھی اسے قتل کریں گے، جس نے اپنے غلام کی ناک کاٹی ہم بھی اس کی ناک کاٹیں گے، اور جس نے اپنے غلام کو خصی کیا ہم اس کو خصی کر دیں گے۔" (حدیث)

۲- چوری

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴿المائدہ: ۳۸﴾

"اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو، ان کے کرتوتوں کے عوض میں اللہ کی طرف سے بطور عبرتناک سزا کے۔"

۳- زنا

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿النور: ۲﴾

"زناکار عورت اور زناکار مرد، سو دونوں کا حکم یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے سو سو دُرے مارو، اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ کے دین کے معاملے میں ذرا رحم نہ آنے پائے، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت

Marfat.com

پر ایمان رکھتے ہو۔ اور چاہیے کہ دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر رہے۔"

شادی شدہ ہونے کی صورت میں، سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کو رجم کیا جائے۔

۴۔ مے نوشی

"شراب پینے والے کو کوڑے مارو، اور اگر دوبارہ پیے تو پھر کوڑے لگاؤ۔" (حدیث)

۵۔ اِرتداد

"جو شخص اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو۔" (حدیث)

"جو شخص اسلام سے پھر جائے اسے دعوتِ اسلام دی جائے، اگر وہ اسلام کی جانب رجوع کر لے (تو درست) ورنہ اس کی گردن اڑا دو۔"

۶۔ مُلک میں بدامنی پھیلانا

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط (المائدہ : ۳۳)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں، ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیے جائیں۔"

سب سے پہلے ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ان اعمال کو حرام قرار دینے میں اسلام نے کیا حکمت پیش نظر رکھی ہے۔ سرِ راہے ہم فرائڈ اور دیگر ماہرینِ تحلیل نفسی کی آراء کا بھی جائزہ لیتے چلیں گے۔

Marfat.com

جرم کے بارے میں فرائڈ کا نقطۂ نظر

فرائڈ اپنی کتاب (Totem & Taboo) میں اس امر پر مصِر ہے کہ جرم انسانیت کے لیے ایک امر طبعی کا درجہ رکھتا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تک کسی فعل کے ارتکاب کا انسان میں قوی محرک موجود نہ ہو، اسے اس کام سے روکا نہیں جاتا، اس لیے اگر انسانیت میں جرم کی جانب شدید میلان نہ ہوتا تو جرائم کی روک تھام نہ کی جاتی اور نہ ان پر سزائیں مقرر کی جاتیں۔

بلاشبہ یہ بات درست ہے مگر اس سچائی پر اصرار سے فرائڈ کا مقصود باطل کی ترویج ہے۔ فی الواقع زیادتی اور اعتداء کا رجحان انسانی نفس کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ خود قرآن کریم نے ہابیل اور قابیل کا قصہ بیان کر کے یہی بتایا ہے کہ انسانیت میں جرم کا آغاز انتہائی قدیم ہے۔ مگر یہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور انسان اس وقت تک "انسان" نہیں بن سکتا جب تک اس کی تصویر کا وہ روشن و منور رُخ پیش نہ کیا جائے جو انسان اور حیوان میں تمیز پیدا کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے۔

اس سلسلے میں فرائڈ اس بات پر بضد ہے کہ انسان کا روشن و منور پہلو اس طرح ذاتی اور اصلی طریقے پر رونما نہیں ہوا جس طریقے پر انسان میں تاریک مجرمانہ پہلو طبعی طور پر پیدا ہوا ہے، بلکہ انسان کا روشن پہلو، نتیجہ ہے اس دباؤ کا جو انسان کی جرم کی جانب لپکنے والی جبلّی طاقت پر قائم کر دیا گیا ہے ـــــ چلیے ہم مناظرے بازی سے گریز اور وقت کی بچت کے لیے اور فرائڈ کے اس اقرار کے باوجود کہ "ارتکاب جرم پر انسانِ اوّل کو احساسِ ندامت ہوا تھا" ـــــ فرائڈ کے مندرجہ بالا بیان کو تسلیم کیے لیتے ہیں، مگر اس سوال کا فرائڈ کے پاس کیا جواب ہے کہ "انسانِ اوّل پر احساسِ ندامت کس چیز نے لازم کر دیا اور کس نے اسے القاء کیا کہ فلاں کام غلط تھا اور اس کا ارتکاب درست نہیں تھا؟

Marfat.com

فرائڈ کی ان آراء پر ہم "اقدار عالیہ" میں تفصیلی گفتگو کریں گے، مگر سرِ دست یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابتدائے آفرینش میں خواہ کوئی بھی سبب رہا ہو، مگر بہرحال انسانیت کا روشن و منور پہلو عملاً موجود رہا ہے، اور انسانیت مجموعی طور پر کبھی بھی جرم کی جانب متوجہ نہیں ہوتی، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انسانیت کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا اور کوئی قید و بندش اس پر نہ لگائی جاتی تب بھی تمام انسان جانوروں کی طرح قتل و خونریزی برپا نہ کرتے، بلکہ ان میں کم یا زیادہ ایسے افراد ضرور باقی رہتے جو جرم سے نفرت کرتے اور امن و سلامتی کو دوست رکھتے۔

قصۂ ہابیل و قابیل، جو قرآن نے بھی بیان کیا، کتب مقدسہ نے بھی اس کا تذکرہ کیا اور جو مختلف قوموں کی لوک کہانیوں (Folklore) میں بھی موجود ہے۔ خود اس قصہ میں جہاں ایک انسان کی زیادتی اور اعتداء کا تذکرہ ہے وہاں دوسرے انسان کے جرم سے باز رہنے اور اس سے نفرت کرنے کا ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ قرآن کریم بیان کرتا ہے:

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ (المائدہ: ۲۸)

"تو اگر تو اپنا ہاتھ مجھ پر اٹھائے گا کہ مجھے قتل کر ڈالے تو میں (جب بھی) اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانے کا نہیں کہ تجھے قتل کر ڈالوں۔"

اس قصے پر کسی نے تو یہ دل چسپ اضافہ کیا ہے کہ بدکار بھائی نے نیکوکار بھائی کو قتل کر دیا۔ اب ساری انسانیت اس بدکار بھائی کی اولاد ہے۔ مگر ہم اس قصے پر ازراہ تفنن یہ اضافہ کرتے ہیں کہ انسانیت دونوں بھائیوں کی اولاد ہے، اس میں خیر بھی ہے اور شر بھی ہے، اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی فرزند انسانیت اپنے مجرم دادا کی طبیعت پائے اور مجرم بن جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ہونہار سپوت اپنے نیکوکار دادا پر چلا جائے

Marfat.com

اور پرہیزگار بن جائے۔

فرائڈ صرف انسانیت اولیٰ ہی کو ملوث کرنے پر بس نہیں کرتا، بلکہ وہ تا ایں دم تعاقب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر انسان عشق مادر کی اُلجھن (Oedipus Complex) کا شکار ہوتا ہے اور یہی اُلجھن ہر جرم کا سبب بنتی ہے، البتہ اگر بچپن میں انسان مناسب وقت پر اس اُلجھن کو لاشعور میں دبا دے اور اس کی جگہ فضائل اور اخلاق کو نشو و نما دے دے تو اس اُلجھن سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ گویا بچوں کی اکثریت طبعی طور پر اس اُلجھن پر قابو پا لیتی ہے صرف شواذ (Abnormal) اس اُلجھن میں پھنسے رہ جاتے ہیں، اور اس طرح اعصابی اور نفسیاتی اضطرابات سے دوچار ہو کر مجرمانہ روش اختیار کر لیتے ہیں۔

چلیے، شکر ہے! سب لوگ تو مجرم نہ رہے۔ اور انسانیت کے اس ارتقائی دور میں جرم معمولی روش (Normal) سے ہٹا ہوا شاذ (Abnormal) طریقہ تو قرار دے دیا گیا اور کم از کم فرائڈ نے جرم کو اصل الاصول تو قرار نہیں دیا۔

Marfat.com

اسلام - اور - اجتماعی امن و سلامتی

اسلام جماعتی امن و سلامتی پر بہت شدت سے زور دیتا ہے، اور فی الواقع اجتماعی امن و سلامتی ہی وہ واحد طریقہ ہے جو تمام افراد کی خوشگوار زندگی کا ضامن بن سکتا ہے اور کوئی بھی نظام زندگی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا اور اپنے افراد کو خوشگوار اور مطمئن زندگی عطا نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی پوری توجہ اجتماعی امن و سلامتی پر مرکوز نہ کر دے، کیونکہ یہ بات تو بہر حال بدیہی ہے کہ جماعت مجموعۂ افراد کا نام ہے۔ (اس لیے لامحالہ افراد کی فلاح جماعتی بہبود ہی میں مضمر ہونی چاہیے۔)

وہ جرائم جو اسلام نے حرام قرار دیے ہیں وہ وہی ہیں جن سے جماعتی امن برباد ہوتا ہے، اور اگر ان کا پوری طرح تدارک نہ کیا جائے تو سارے معاملات زندگی ہی تلپٹ ہو جائیں، انارکی پھیل جائے اور لوگوں کے دلوں میں بے چینی اور خوف بیٹھ جائے۔

لوگ کس طرح مطمئن رہ سکتے ہیں؟ کیسے وہ امور انجام دے سکتے ہیں جو ان کے حق میں فلاح و خیر کے ضامن ہوں؟ اور کیسے وہ ایسے اعمال سرانجام دے سکتے ہیں جن کے نتیجے میں انسانیت مجموعی طور پر آسائش اور ترقی سے ہمکنار ہو؟...... اگر لوگوں کو قتل کی اجازت دے دی جائے۔

یہ حقیقت اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اس کے بارے میں کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اس تاریخی حقیقت کا بیان لازمی ہے کہ انسانی تاریخ کے جن ادوار میں بے چینی اور بدامنی رہی ہے وہ ہی ادوار،

Marfat.com

انسانیت کی پس ماندگی اور انحطاط کے ادوار رہے ہیں۔ اور علوم و فنون اور تہذیب و تمدن نے انھی اقوام میں فروغ پایا ہے جن کے مسائل و معاملات پُر امن طور پہ استوار رہے ہیں اور یہ بات نفسیاتی لحاظ سے بھی درست ہے، اور وہ اس طرح کہ جو شخص اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اپنی ذات اور اپنے خاندان کو دوسروں کی ناروا زیادتیوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے میں منہمک رہے گا اس میں اتنی طاقت و توانائی باقی نہیں رہے گی کہ پھر وہ اسے علم و فن میں صَرف کر سکے، بلکہ اگر کچھ توانائی بچ بھی جائے گی جب بھی وہ اس قسم کے حالات میں علوم و فنون کی جانب توجہ نہیں دے گا۔ چنانچہ علمائے نفس کہتے ہیں کہ "جب تک انسان کی اوّلین جبلّت یعنی تحفظ ذات کی تسکین نہیں ہو جاتی اس وقت تک دیگر فطری جبلّتیں آمادۂ عمل نہیں ہوتیں"۔

غرض حرمتِ قتل تو بدیہی ہے اور اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے دلائل تک بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

چوری بھی قتل کے قریب قریب جُرم ہے، البتہ اس کا نقصان و ضرر قتل سے بہر حال کم اور ہلکا ہے، کیوں کہ چوری میں اعتداء (دست درازی) ملکیت پر ہے، جان پر نہیں ہے۔ یا یہ کہیے کہ چوری میں انسان کے دوسرے بڑے فطری میلان ـــ یعنی تحفّظ ملکیت ـــ پر دست درازی کی جاتی ہے[1] جو تحفّظِ ذات کے بعد ترتیب و اہمیت کے لحاظ سے دوسرا درجہ رکھتی ہے۔

---

[1] طبعی ترتیب تو یہ ہے کہ ہم جرم قتل کے بعد جرم زنا کا بیان کریں، کیوں کہ تحفّظ ذات کے معاملے مسئلہ جنس دوسرے نمبر پر ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جرائم کے درجوں کے مطابق بیان کی گئی ہیں، مگر میں نے اس بحث میں زنا کا ذکر اس لیے موخر کر دیا ہے کہ قتل اور چوری کے باب میں ایسا اختلاف و نزاع نہیں ہے جیسا کہ زنا کے مسئلے میں ہے۔ اس لیے میں نے ان جرائم کو جن میں کوئی نزاع نہیں ہے انھیں پہلے بیان کر دیا اور جن میں کوئی نزاع ہے انھیں موخر کر دیا ہے۔

Marfat.com

چوری پر اگر سزا نہ دی جائے تو اس سے بھی تقریباً وہی حالت پیدا ہو گی جو قتل کے جواز سے پیدا ہو سکتی ہے، کیوں کہ اگر لوگ اپنی ملکیتوں کے تحفظ ہی میں لگے رہیں تو کسی مفید عمل میں ان کی توجہ کا مرکوز ہونا ممکن نہیں رہے گا، اور دلوں میں رنجشیں پیدا ہو جانے اور نفوس میں کینہ پرورش پا جانے کے بعد اس سے بڑے جرائم بھی وجود میں آ جائیں گے۔ ہم اس مقام پر بھی ایک تاریخی حقیقت بیان کیے دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ملکی یا عالمی تجارت نے ہمیشہ انہی ادوار میں فروغ پایا ہے جب امن و سلامتی عام ہوئی اور لوگوں کو لوٹ مار کا اور چوری کا کوئی خطرہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ابتری کے زمانوں میں تجارت تعطل کا شکار رہی اور روئے زمین کے بیشتر علاقوں میں قحط و افلاس ٹوٹ پڑا۔

اگر مالک، اپنی ملکیت کو محفوظ خیال کرے اور اس کے تحفظ کے بارے میں مطمئن ہو، جب ہی وہ وسائل پیداوار (Means of Production) کی بہتری کی جانب متوجہ ہو سکتا ہے، اور یہی اطمینان و سکون انسانیت کو تقدم اور ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کر سکتا ہے۔

غرض چوری کی حرمت بھی بدیہی ہے اور اس میں بھی کوئی نزاع نہیں ہے۔[1]

---

[1] اشتراکی حضرات کہتے ہیں کہ چوری صرف جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں ہوتی ہے کیونکہ ان معاشروں میں انفرادی ملکیت جائز ہوتی ہے، مگر اشتراکیت نے انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر کے چوری کا بھی خاتمہ کر دیا اور اب کسی اشتراکی ملک میں چوری کی سزا مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ میں نے اپنی کتاب "شبہات حول الاسلام" (اس کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام اور جدید ذہن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے) میں انفرادی ملکیت پر گفتگو کے دوران ذکر کیا ہے کہ انفرادی ملکیت ایسا ازلی فطری میلان ہے جس کا قلع قمع نہیں کیا جا سکتا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس میلان کو

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

حرمتِ زنا

اصل نزاع حرمت زنا کے مسئلے میں ہے، اور اس مسئلے میں اسلام کا اصل حریف اور مدمقابل بے قید مغرب ہے اور وہ مشرقی لوگ ہیں جن کی نگاہوں میں مغرب کی چمک دمک دیکھ کر خیرگی پیدا ہو گئی ہے، جن کے اعصاب جواب دے گئے ہیں اور جو مغرب کی اباحیت پر کچھ اس طرح ریجھ گئے ہیں جیسے کھانا دیکھ کر شدت اشتیاق سے، کتے کا لعابِ دہن بہنے لگتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے زنا کو کیوں حرام کر دیا ہے؟ کیوں لوگوں کے ان فطری میلانات کو کچلا جا رہا ہے؟ جنھیں گزرنے کا راستہ لازماً دے دینا چاہیے۔ اور یہ تند و تیز فطری میلانات، خواہ ہم ان کے راستوں میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ کھڑی کریں، اور خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، اپنی گزرگاہ بنا لیں گے اور ہر بند کو توڑ کر بہہ نکلیں گے —— اس لیے بجائے اس کے کہ ہم اجتماعی نفاق کا شکار ہوں، ہمیں معقول رویہ اختیار کرتے ہوئے اس حقیقت واقعی اور نفس الامری کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ —— آخر ہر انسان کے نفس میں یہ خواہش موجود ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس خواہش میں عقل کو درماندہ کر دینے والی لذت موجود ہے، پھر اے پس ماندہ اور منافق لوگو، تم اس لذت کو کیوں حرام قرار دیتے ہو؟ مسئلہ جنس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے لیے ایک علیحدہ باب مقرر کر دیا گیا ہے، جس میں مَیں نے اخلاقی انارکی کے نتیجے میں ظہور پذیر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اس قدر مہذب بنا دیا جائے کہ اس سے خیر تو حاصل ہو مگر برائی کا ممکنہ حد تک انسداد ہو جائے —— اس جگہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اسلام نے کس طرح چوری کا انسداد کر کے مکمل انصاف قائم کیا ہے۔

Marfat.com

ہونے والے نتائج کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے اور بتا دیا ہے کہ اخلاقی زوال قوموں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح دیمک لکڑی کو چاٹ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اخلاقی زوال کے اثرات ایک یا دو نسلوں تک ظاہر نہ ہوں، مگر بالآخر اخلاقی انحطاط سے دوچار اقوام کو ان تباہ کن اور ہلاکت خیز نتائج کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور جب یہ مہلک نتائج سامنے آجاتے ہیں تو قوموں کی عمارت انتہائی مختصر سے عرصے میں اس طرح زمیں بوس ہو جاتی ہے، جس طرح کسی اینٹ پتھر کی عمارت کی بنیاد سرک جائے اور وہ چند لمحوں میں زمین پر ڈھیر ہو جائے۔

تاریخ کے ثبت کردہ نقوش برملا اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں اور علی الاعلان بتلا رہے ہیں کہ اخلاقی زوال کے ان طبعی نتائج سے آج تک کوئی امت نہیں بچ سکی۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ٥ (الاحزاب : ۶۲)

"اور آپ اللہ کے دستور میں ردّ و بدل نہ پائیں گے۔"

اس سے زیادہ بے وقوفی اور کوتاہ نظری اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص یہ سوچنے لگے کہ ضروری تو نہیں ہے کہ اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں رونما ہونے والی مصیبت اسی نسل پر ٹوٹ پڑے، یا میں خود ذاتی طور پر متاثر ہو جاؤں۔ جب یہ ضروری نہیں ہے پھر میں خود تو مزے لوٹ لوں اور آخری حد تک پہنچ کر دم لوں، پھر جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایسا کوئی بھی نظام زندگی جو صرف ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ پے در پے آنے والی متعدد نسلوں کے لیے وضع کیا گیا ہو، اور جو اخلاقی زوال اور اباحیت کے بدترین نتائج پر بھی پورا پورا یقین رکھتا ہو، وہ اس قسم کے اشخاص کو اس حماقت کے ارتکاب کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ اور جو نظام اس حماقت کو انگیز کرے وہ کونسا نظام ہو سکتا ہے؟

Marfat.com

اور جو نظام اس حماقت کو گوارا کرے وہ تقدم و ترقی کے بارے میں قانونِ حیات کا کس طرح مقابلہ کرے گا؟ جب وہ لوگوں کو یہ اجازت دیدے گا کہ وہ اخلاقی زوال و انحطاط کا شکار ہو جائیں، اور اپنی تمام تر جسمانی طاقت کو حیوانی لذتوں کے حصول میں اس طرح نچوڑ ڈالیں کہ ان کے پاس کوئی ذخیرۂ قوت، رفعت و ترقی کے حصول کا باقی نہ رہے، یا اگر قوت و طاقت بھی بچ رہے تو ان لذتوں میں منہمک ہو کر رفعت و ترقی کے حصول کا اشتیاق و میلان ہی باقی نہ رہے۔

یہ نظام کس طرح ایک شخص کو اجازت دے گا کہ وہ دوسرے شخص کی غیر موجودگی میں اس کی عزت لوٹ لے؟ پھر اس کا کیا جواز پیش کیا جائے گا؟ اور یہ نظام کیوں کر گوارا کرے گا کہ عورت اپنے شوہر کے سامنے کسی دوسرے مرد کا بچہ پیش کر کے اس کے جذبات اور اس کی اُمنگوں پر ڈاکہ ڈال دے؟ یا یہ ہوگا کہ اس نظام کے ماننے والے یہ کہیں گے کہ عزت پر اور بیوی پر غیرت کھانے کے یہ تمام جذبات پس ماندہ مشرق کو مبارک، ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر پھر ذرا غور فرمائیے! کہ مہذب مغرب، متمدن فرانس اور خداوندان اقتدار کی سرزمین، امریکہ میں عزت پر اور بیوی پر غیرت کھا کر خود کشی کرنے والوں اور قتل کا ارتکاب کرنے والوں کی کیا شرح ہے اور کیوں ہے؟

لوگ بھی کیا خوب ہیں! جو پہلے ہی مجرم ہیں، یہ مزید انہیں زنا کی کھلی چھٹی دینا چاہتے ہیں؟

حُرمتِ شراب۔

شراب کو حرام کرنا اسلام کے لیے طبعی طور پر لازمی تھا، کیونکہ کوئی بھی ایسا نظام جو اپنے وجود کو انسانیت کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہو وہ مے نوشی کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ اگرچہ مغربی ممالک اس

Marfat.com

مسئلہ کو ایک واقعی اور نفس الامری چیز سمجھتے ہیں، مگر پھر بھی ان ممالک میں اس شخص کو سزا دی جاتی ہے جو نشے میں مدہوش ہو کر اپنی حدود کو پار کر جائے۔ خواہ وہ کسی شخص پر یا شے پر کوئی ناروا دست درازی نہ کرے، مگر کسی انسان کا سر راہے مدہوش پڑا رہنا، بجلی کے کھمبوں سے لپٹ کر آہ و زاریاں کرنا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جھومتے ہوئے چلنا، خود انسانی عزت و کرامت کے منافی ہے۔

بہر حال اگر دنیا کے تمام نظامہائے زندگی برملا مے نوشی کو جائز قرار دیں تو بھی اسلام اس کی اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ مے نوشی درحقیقت زندگی سے فرار اور حقائق حیات سے شکست کا کھلا اعتراف ہے۔

اس کارزار حیات میں ہر انسان مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ اس لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ مسائل زندگی کو سلجھانے اور امور حیات پر غور کرنے کے بجائے، انسان اس تنازع للبقاء سے فرار حاصل کرے اور اپنے مصائب و آلام کو ایک پیالۂ شراب میں غرق کر دے جو اس کے اعصاب کو معطل کر دے اور اسے کچھ دیر کے لیے غم و الم کی دنیا سے چھٹکارا دلا کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دے جو اس نے اپنے عالم تخیل میں اپنی مرضی کے مطابق سجائی ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ شراب مے نوش کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس میں سے ایک نیا شخص ابھر آیا ہے جو زندگی اور چستی سے بھرپور ہے۔ پھر یہ شخص نو ایک پیالۂ شراب کے بعد دوسرے جام مے کا حاجت مند ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی سیر نہیں ہوتا۔ جس قدر پیتا ہے اس کی پیاس بھڑکتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دنیائے شعور اجڑ جاتی ہے۔ اس کے اعصاب مضمحل ہو جاتے اور اس کی فکر درماندۂ عمل ہو جاتی ہے۔ وہ ہر دیکھنے والے کی نظر میں ایک مضحکہ خیز شخص اور اس کی ناگفتہ بہ حالت ہر ایک کے لیے قابل

Marfat.com

نفرت بن جاتی ہے۔

چلیے اگر تسلیم بھی کر لیں کہ ہر مے نوش اس حالت کو نہیں پہنچتا، تو اسلام تو سرے سے فرار زندگی کو ہی پسند نہیں کرتا۔ اسلام تو مقابلے، کشاکش، جدوجہد اور غلبہ پانے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام جس جہاد کی نصیحت کرتا ہے، خواہ وہ جہادِ اصغر ہو، یا جہادِ اکبر، (جیسا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس کی جانب اشارہ فرمایا) وہ جہاد، حقائق سے فرار اور عالمِ خیال کا سہارا لینے والی کیفیت سے ہر گز ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

ہم پہلے ہی بتا چکے کہ زندگی گزارنا بھی ایک عادت ہے۔ جو شخص کسی مسئلے کا سامنا نہ کر سکے اور اس سے بھاگ کر دنیائے تصورات کا سہارا لے، وہ ایسا ہی شخص ہوگا جو جہادِ زندگی کے قابل نہیں ہوگا۔ جہادِ زندگانی تو کجا وہ تو کوئی آسان سا بچاؤ کا راستہ تلاش کر لے گا اور اس روشِ سہل پر گامزن ہو جائے گا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ جہاد صرف جنگ و قتال ہی کا نام نہیں ہے، اگرچہ جنگ و قتال کے لیے بھی ضروری ہے کہ نفس کو اس کا عادی بنایا جائے اور اسے اس کے لیے تیار کیا جائے تاکہ اگر کسی وقت اچانک جنگ کا سامنا کرنا پڑ جائے تو لوگ اس کے لیے تیار رہیں ——— جنگ و قتال کی بات تو الگ رہی، پُر امن زندگی میں انسان کے سامنے مسائل و مشکلات کا انبار لگا ہوتا ہے۔ ہر انسان کے بلاشبہ اپنے گھر والوں سے تعلقات ہوتے ہیں، اپنے مالکوں اور اپنے ماتحتوں سے مراسم ہوتے ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے روابط ہوتے ہیں، اور اسے لامتناہی مطالباتِ زندگی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ان سب اُمور کے لیے لامحالہ شعورِ کامل کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے جامِ شراب اور پیکرِ خیال کی مدد سے حل کیا جا سکے بلکہ ان میں سے ہر مسئلہ

Marfat.com

تدبّر اور تربیت چاہتا ہے۔ دیکھیے، تیرنا اسی وقت آتا ہے جب کوئی تیرنا سیکھے اور اس کی عملی مشقیں کرے، اور اگر کسی شخص کو تیرنا نہیں آتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی جسمانی ساخت ایسی ہے کہ اس میں تیرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تیرنے کی مشق نہیں کی اور اس کی تربیت حاصل نہیں کی۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو کسی مسئلے کا مقابلہ کرنے اور اس کے حل کی تدبیر نکالنے کی تربیت حاصل نہیں ہے اور اس نے بار بار اس کی مشق نہیں کی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی مسئلے کا سامنا نہیں کر سکتا، اس لیے نہیں کہ اس میں اس مسئلے کے حل کی صلاحیت ہی مفقود ہے بلکہ اس لیے کہ اس نے اس کی تربیت حاصل نہیں کی اور اس کی مشق جاری نہیں رکھی۔ اسی سے یہ حقیقت بھی سمجھ لیجیے کہ مے نوش کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ یکلخت اپنے نشے کی حالت سے باہر نکلے اور فوراً حالات کا مقابلہ شروع کر دے، کیوں کہ بہرحال کچھ وقت کے لیے اس کی مقابلہ کی صلاحیتیں بے کار و غیر مستعمل پڑی رہی ہیں۔

مے نوش یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب نوشی اس کا انفرادی معاملہ ہے اور جب تک اس کے عمل سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی کسی کو اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اس خیال میں کئی مغالطے پنہاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کو ایذا پہنچانے میں بھی آزاد نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود خالص اپنی ملکیت نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے انفرادی وجود اور اپنے ذاتی تشخص پر ہی زیادتی کر رہا ہے تو اس پر ہمارا جواب بڑا سادہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کا بالکلیہ مالک بن جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ معاشرے سے

Marfat.com

کنارہ کش ہو جائے، اپنے لیے کھانے پینے اور لباس کا تنہا ہی بندوبست کرے اور اپنے آپ کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کا خود ہی کوئی انتظام کرے، لیکن اگر وہ معاشرے میں رہنا چاہتا ہے اور پُرامن، سہل اور خوشگوار سماجی زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے انفرادی وجود اور ذاتی تشخص کو اسی طرح سماج کے کنٹرول میں دے، جس طرح سماج نے اس کے آرام و آسائش کے لیے اپنی خدمات اس کے حوالے کی ہیں۔ معاشرے کو لامحالہ فرد کی ضرورت ہے اور صرف اس کے صحیح اور تندرست جسم ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کی صحیح عقل، متوازن نفس اور درست ضمیر کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ فرد جو ایذاء شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر اپنے نفس کو پہنچائے گا اس کا لازمی نقصان اس معاشرے کو پہنچے گا جس میں وہ خود سانس لے رہا ہے۔

یہ تو تھا پہلا مغالطہ، دوسرا بڑا مغالطہ اس سے بھی بڑا ہے، اور وہ یہ کہ انسانوں میں رسم تقلید ایک متعدی بیماری کی طرح سرایت کر جاتی ہے اور تقلید کا میلان انسان میں طبعی ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ خواہ کوئی شخص کتنا ہی ممتاز و منفرد کیوں نہ ہو وہ کسی نہ کسی معاملے میں اور کبھی کبھی غیر شعوری طور پر بھی کسی نہ کسی کی تقلید ضرور کرتا ہے۔ نشے باز کا سب سے بڑا سماجی جرم یہ ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اور بالخصوص کمزور کردار کے مالک لوگوں کے سامنے ایک بُرا نمونۂ اقتداء پیش کرتا ہے۔ اس مقام پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ذمے داری نشہ باز پر عائد نہیں ہوتی، کیوں کہ اگر لوگ چاہیں تو اس کی غلط اقتداء سے بچ سکتے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جیسے میں لوگوں میں متعدی بیماریوں کے جراثیم پھیلا کر کہوں کہ میرے اوپر کوئی ذمے داری نہیں ہے، لوگ

Marfat.com

چاہیں تو امراض سے بچ سکتے ہیں۔ جی نہیں، بلکہ یہ میری ذمے داری ہے کہ میں لوگوں کو متنبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس جرثومے کو بھی بڑھنے سے روک دوں۔

مے نوشی کے بُرے اثرات

سب سے بُرے اور بدترین اثرات خود نشے باز کے خاندان پر پڑتے ہیں، اور یہ اس قدر بُرے اثرات ہوتے ہیں کہ اگر نشے باز کو علم ہو جائے کہ وہ اپنی اولاد کے حق میں کیا کانٹے بو رہا ہے تو وہ یقیناً اس سے سبق لے۔ بچہ فطری طور پر اپنے باپ کو عظیم سمجھتا ہے اور وہ اسے اپنے من کا دیوتا خیال کرتا ہے۔ پھر وہ غیر شعوری طور پر اپنے نفس کی داخلی دنیا میں اپنے باپ کی شخصیت کی نقل کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بچہ اپنے باپ کو نشے کی اس کریہہ اور قابلِ نفرت صورت میں دیکھے گا تو اس کے نفس میں اس قدر سخت کش مکش برپا ہو جائے گی جو کسی اچھائی کی جانب نہیں لے جا سکتی۔ اس صورت میں بچہ یا تو اپنے باپ سے نفرت کرنے اور اسے بنظرِ حقارت دیکھنے لگے گا تو اس کی شخصیت بٹ جائے گی، ایک شخصیت اس کی ظاہری اور لوگوں کے سامنے ہوگی اور دوسری شخصیت اس کی داخلی اور باطنی ہوگی جو بلا کسی راہنمائی کے حیران رہ جائے گی، یا وہ بدستور اپنے باپ کو پوجتا رہے گا اور اس کے اعمال و اطوار کی نقل کر کے خود بھی تباہ ہو جائے گا اور اپنا حقیقی وجود کھو بیٹھے گا۔ اور اگر لڑکی ہوگی تو وہ بھی اخلاقی طور پر تباہ ہو جائے گی یا پھر تمام مردوں سے نفرت کرنے لگے گی اور شادی سے گریز کرے گی اور اگر اسے زبردستی رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا گیا تو وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جائے گی۔ گویا ایک نشہ باز اپنے خاندان کو تباہ کر دیتا، اپنی اولاد کو ہلاک کر دیتا اور انھیں شیطان کے پنجے میں دے دیتا ہے۔

اس بغض اور کینے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو نشے بازوں میں

Marfat.com

بحالت نشہ، سرایت کر جاتا ہے اور وہ انسانیت کو فراموش کر کے اپنی لاشعور میں چھپی ہوئی حیوانیت کا اظہار شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ مے نوشی ایک ایسا جرم ہے جو بعض اوقات دوسرے جرائم پر اکساتا ہے، مثلاً زنا اور قتل۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝

(المائدہ : ۹۱)

"شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی اور کینہ، شراب اور جوئے کے ذریعے سے ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ سو اب بھی تم باز آؤ گے؟"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"شراب سے بچو یہ تو تمام کبیرہ گناہوں کی جڑ ہے۔"

شراب کو برائیوں کی جڑ اس لیے کہا گیا کہ اس میں ارادہ، ضابطہ اور شعور کے معطل ہو جانے کے بعد اس سے تمام برائیاں پھوٹ پڑتی ہیں۔ خود تحلیلی نفسیات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ شراب اس نگران کو تھپک تھپک کر سُلا دیتی ہے جو لاشعور کے چوکھٹ پر کھڑا ہوا ان امور کو باہر آنے سے روکتا رہتا ہے جن کا باہر آنا جائز نہیں ہے، مگر جب یہ نگران غافل ہو جاتا ہے تو پا بہ زنجیر برائیاں آزاد ہو کر باہر نکل آتی ہیں۔

نشہ کی دیگر اشیاء افیون اور چرس وغیرہ کا عمل بھی شراب ہی جیسا ہے۔ نشہ کی حرمت کے باب میں حکم اسلام پر جو لوگ اظہار رشک کرتے ہیں وہ دراصل کوتاہ نظر ہیں اور اسلام کے مزاج نا آشنا ہیں، کیونکہ جب اسلام

Marfat.com

فرارِ زندگی کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اس امر کی تاکید کرتا ہے کہ انسان مستقل اپنے شعور میں رہے اور اپنے آپ کو مسلسل مشکلات و مسائل کے مقابلے اور تدبیر کے لیے تیار کرتا رہے تو ہر وہ شے جس سے اس کا شعور چھن جائے وہ اسلام کی نظر میں یقیناً اور لازماً حرام ہے۔ اور اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

سمرسٹ مام، اپنے ناول (The Narrow Corner) میں ایک مقام پر افیون استعمال کرنے والے کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک شخص آسٹریلیا اور انڈونیشیا کے درمیان ایک جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ وہ سمندر کی طوفانی موجوں سے سخت خائف تھا، کیوں کہ اسے اس سے پہلے کبھی اس قدر چھوٹے سے جہاز میں سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس نے کیا کیا، فوراً دوڑتا ہوا جہاز میں اپنے کیبن کی جانب بھاگا اور اپنی پائپ میں افیون بھر کر پینے لگا۔ (مشرق بعید کے ممالک میں افیون سگریٹ کی طرح پی جاتی ہے) رفتہ رفتہ اس کے سارے خطرات جاتے رہے۔ اسے جہاز کے سخت ہچکولے ایسے محسوس ہونے لگے جیسے بچہ کے پالنے کو ہلایا جا رہا ہو۔ پھر اس کا ذہن فضاؤں میں تیرنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ اس میں بہت زیادہ جسمانی، اعصابی اور ذہنی قوت موجود ہے۔ اور وہ روئے زمین کے تمام مسائل کو اپنے ناخنِ تدبیر سے پلک جھپکتے میں سلجھا سکتا ہے۔ وہ سوچنے لگا ـــــ یقیناً میرے پاس یہ عظیم قوت موجود ہے۔ میں جب چاہوں، جو چاہوں کر سکتا ہوں، تو اسی وقت مجھے پراگندہ فکر ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اب تو مجھے دنیائے خیال ہی میں آباد رہنا چاہیے اور مسائل کو سر دست رہنے دینا چاہیے جب ان کا وقت آئے گا میں اپنے اشارۂ انگشت سے ایک منٹ میں انھیں حل کر لوں گا۔

Marfat.com

ظاہر ہے، اسلام فکر کو معطل کر دینے والی اور مزاحمت و مقابلے کی قوت کو مفلوج کر دینے والی اس دنیائے خیال کی اجازت نہیں دے سکتا۔ نشہ آور اشیاء کے بارے میں اسلام کی رائے معلوم کرنا اور اس کا رویہ سمجھ لینا قطعاً مشکل نہیں ہے، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام نفس کے تمام پہلوؤں کی تربیت، شعوری ارادے کی افزائش اور جذبات و خواہشات پر حصول قدرت کے بارے میں بڑا مُصر ہے اور ان اُمور پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔

مسئلہ ارتداد

اب ارتداد اور فساد فی الارض (زمین میں ابتری پھیلانا) کے جرائم بیان کیے جاتے ہیں:

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ ارتداد شخصی آزادی کے باب میں نہیں آتا، کیونکہ ارتداد دراصل اجتماعی فرض کی ادائیگی سے گریز ہے اور اس ارتداد کا نقصان اس معاشرے کو پہنچتا ہے جس معاشرے میں رہ کر خود مرتد، اس سے مستفید ہو رہا ہے۔ اور اگر اس جرم کو بلا سزا چھوڑ دیا جائے تو اس میں بھی شراب اور زنا کی طرح متعدی جرائم بن جانے کا خطرہ ہے، کیونکہ ارتداد سے کچھ پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں جو خدا کی طرف سے بندے پر عائد ہوتی ہیں وہی اس پر، اس کے نفس کی طرف سے، اور اس معاشرے کی طرف سے، جس میں وہ رہ رہا ہے، بھی عائد ہوتی ہیں، اور ان پابندیوں سے گریز معاشرے کے لیے زبردست خطرہ بن جاتا ہے۔

اب ہم ان لوگوں کے خیال کا جائزہ لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ارتداد ایک انفرادی مسئلہ ہے اور شخصی آزادی کی حدود میں داخل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود اس مرتد کا باقی مؤمنین کے ساتھ کیا طرزِ عمل ہوتا ہے؟

Marfat.com

وہ تو اپنے بیمار ذہن سے یہ سوچتا ہے کہ اس نے ٹھیک قدم اٹھایا ہے اور اس مغالطے کا سہارا لے کر وہ مخلوقِ خدا کی طرف سے لازم آنے والی ذمے داریوں اور انسانیت کے مقرر کردہ ضوابط سے نکلنا چاہتا ہے، تاکہ وہ بالکل آزاد حیوان بن جائے اور جس طرح جی چاہے اپنی خواہشوں کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ بہر کیف، مرتد یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ٹھیک اور درست قدم اٹھایا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مؤمنین دیوانے ہیں جو اپنے آپ پر بے جا بندشیں لگاتے ہیں اور اپنی آزاد حیوانیت سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ وہ انھیں بزعم خود صحیح راستے کی جانب بلاتا ہے اور انھیں نئی روشنی دکھاتا ہے، جبکہ اصل بات یہ ہے کہ کسی بُرائی کو قبول کرنا اور بندشوں سے آزاد ہو جانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اصل مشکل کام تو رفعت (Sublimation) اور صعود ہے، جس کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس رفعت و صعود کے لیے پہلے مربی (تربیت کرنے والا) جدوجہد کرتا ہے، پھر اور عقل آجانے کے بعد انسان خود جدوجہد کرتا ہے اور ولی امر بھی کوشش کرتا ہے تاکہ ہاتھ کی گھاٹیوں میں گرنے والے کمزور لوگوں کا ہاتھ تھام سکے۔ مگر مرتد ان تمام کوششوں پر پانی پھیر کر لوگوں کو جبلی حیوانیت کی جانب لے آنا چاہتا ہے۔ کیا ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی مرتد کی شخصی آزادی کے دعوے دار، اس کی اس آزادی کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟ اور کیا مرتد، مے نوش کی طرح یہ کہہ سکتا ہے کہ ارتداد اس کا ذاتی معاملہ ہے؟ لوگوں کو خود چاہیے کہ وہ اس کی بُرائیوں سے بچیں۔ یہ سب فکری اُلجھاوے ہیں جو تنقید کے سامنے ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتے۔

پھر لازمی طور پر، مرتد ان اخلاقی جرائم کا بھی مرتکب ہوتا ہے جن کے معاشرے پر پڑنے والے اثراتِ بد کا ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں۔

Marfat.com

اگر کوئی ملحد یہ کہے کہ میں تو صرف نظریہ کا انکار کرتا ہوں اور اخلاقی ضابطوں کو بہر حال پیش نظر رکھتا ہوں، تو یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ قیودِ اخلاق سے آزاد ہو جانا ہی تو قید مذہب سے آزاد ہو جانے کا سبب بنا ہے۔ اگر وہ اخلاق کے ضروری ہونے کو تسلیم کرتا اور اس بات پر یقین رکھتا کہ اخلاق کے بغیر انسانیت کا قیام ممکن نہیں ہے تو پھر تو وہ خود بخود خدا پر بھی ایمان رکھتا اور مذہب پر بھی یقین رکھتا۔

خواہ کچھ بھی ہو، ایسا کوئی بھی نظام جو معاشرے کی سلامتی چاہتا ہو اور اس کے جسمانی، اعصابی، فکری اور روحانی تحفظ کی فکر کرتا ہو، وہ اپنے ماننے والوں کو اس امر کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ حیوانیت کے گڑھے میں گر جائیں۔

فساد فی الارض

فساد فی الارض (ملک میں ابتری پھیلانا) کے تحت بہت سے مجرمانہ اعمال آتے ہیں جیسے :

مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانا، (مسلمانوں کو دین سے ہٹانے کا جرم دعوتِ دین کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے اور جب تحریک مضبوط ہو جاتی ہے اور جم جاتی ہے تو یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اگرچہ قانونی طور پر دین سے ہٹانے کی بات، مصر، سوڈان اور دیگر اسلامی ممالک میں بھیجی جانے والی مشنری جماعتوں پر بھی صادق آتی ہے)۔

فساد فی الارض کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ناروا طریق اور بدنیتی سے اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو منہدم کرنے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک صحیح اسلامی حکومت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے اور دشواریاں کھڑی کرنے کی حرکت کا ارتکاب کیا جائے۔ اس مقام پر فساد فی الارض اور شریعت اسلامی کی خلاف ورزی کرنے والے

Marfat.com

مسلمان حاکم کی مخالفت کے درمیان فرق کو اچھی طرح ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے، کیونکہ ایسے حاکم کی مخالفت ہر مسلمان پر فرض ہے، اس کے بغیر اس کا ایمان مکمل نہیں ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس فرض سے کوتاہی کرے گا تو اسے دنیا اور آخرت میں اس کوتاہی پر سزا ملے گی۔

جان و مال اور عزت و آبرو لوٹنے کے لیے پارٹیاں اور ٹولیاں بنائی جائیں، تو یہ جرم بھی فساد فی الارض میں داخل ہے۔ اس لیے چوری، ڈاکہ، رہزنی، غنڈہ ٹیکس وصول کرنے اور بے حیائی اور بداخلاقی پھیلانے والی جماعت اس جرم کی مرتکب سمجھی جائے گی۔

لازمی طور پر اس قسم کی جماعتوں پر افراد سے زیادہ سختی کرنی چاہیے، کیونکہ تنہا فرد کے جرم کے نقصانات، جماعتی امن و سلامتی کے لیے اس قدر خطرناک نہیں ہیں، جس قدر کہ ان لوگوں کے نقصانات ہیں جو اجتماعی صورت میں جرم کے مرتکب ہوں۔ وہ اجتماعی حیثیت میں منظم ہو کر جو ارتکاب جرم کرتے ہیں اس کی برائی تو زیادہ ہوتی ہے مگر وہ خود کوئی زیادہ تکلیف نہیں اٹھاتے۔ یہ لوگ اپنے کچھ آدمی جاسوسی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اگر پولیس کا خطرہ ہو تو بھاگ سکیں اور کچھ لوگوں کو پولیس کے مقابلے اور مزاحمت کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ملک میں ابتری پھیلاتے ہیں اس لیے ان کی سزا بھی سخت ترین ہونی چاہیے، تاکہ بے ضمیر مجرم خوف زدہ ہو کر باز آجائیں۔ حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے:

"خدا تعالیٰ اقتدار کے ذریعے انسانوں کو زیادہ روکتا ہے، بہ نسبت قرآن کے۔"[1]

---

[1] مطلب یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے کم ہوا کرتے ہیں اور حکومت سے ڈرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ (س۔ صدیقی)

Marfat.com

اسلامی سزاؤں پر مغرب کا اعتراض

یہاں تک تو جرم کا بیان، اس معاشرے کے نقطۂ نظر سے تھا جس پر زیادتی ہوتی ہے، اور کوئی بھی شخص معاشرے کے اس استحقاق پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اسے اپنے امن اور سلامتی کی حفاظت کرنا ہے اور اپنے وجود کو تباہی اور فساد سے محفوظ رکھنا ہے۔ ہر فرد جو اپنے گھر میں بیٹھا ہے، یا اپنے کام پر جا رہا ہے یا کسی جائز و مفید تفریح کے لیے نکلا ہے، اس کا یہ حق ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائے اور نہ ہی وہ کسی کی تکلیف کا باعث بنے اور اسے اپنی جان و مال اور اپنے اہل و عیال کا مکمل اطمینان حاصل ہو۔ اور ریاست کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اسے یہ اطمینان مہیا کرے۔

مگر جدید تہذیب کے حامل، اہل مغرب اور دنیائے اسلام میں ان کے مقلد دانش ور، اسلامی سزاؤں کو ناگوار خیال کرتے اور انھیں وحشیت و بربریت بتلاتے ہیں۔ ان کی رائے میں اب اس دور جدید میں اس قدر وحشیانہ سزائیں مقامِ انسانیت سے فروتر ہیں، مگر یہ دانشور یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ جب اس دور میں اسلامی سزائیں مقام انسانیت کے مناسب نہیں ہیں تو پھر یہ کس طرح انسانیت کے شایانِ شان ہے کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں اور ظالموں اور امن پسندوں کو بیک وقت و بیک لحظہ ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں سے موت کی نیند سُلا دیا جائے؟ یہ دانش ور بتاتے ہیں کہ اسلام میں پس ماندگی اور بربریت کی علامتیں یہ ہیں کہ اسلام فرد کے وجود کو ناکارہ گردانتا ہے، جب ہی تو اسلام میں فرد کو سزائے موت دے دینا اس قدر سہل ہے، جب ہی تو اسلام میں فرد کو سنگسار کر دیا جاتا ہے اور اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور معمولی سی بات پر ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ کیا یہی انصاف ہے کہ دس کھجوروں

Marfat.com

پر کسی آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے؟ یہ تو انتہائی قابلِ نفرت وحشیت ہے جو تاریک ماضی میں عرب بدؤوں کے مناسب تو ہو سکتی ہے، مگر بیسویں صدی کی اس ترقی یافتہ دنیا کے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتی۔

ٹھیک ہے، ہم تو ان پارسا اہلِ مغرب سے یہ نہیں پوچھتے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں کیا ہُوا؟ برفانی علاقوں میں پھیلے ہوئے قیدیوں کے باڑے کیسے ہیں؟ سال بسال جو عمل تطہیر ہوتا ہے، اس میں سیکڑوں اور ہزاروں افراد کیوں موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں؟ اور ہم تو یہ بھی نہیں پوچھتے کہ سیاہ فام اقوام جو انسانیت کے ناتے ہی نہیں، بلکہ مسیحیت کے رشتے سے بھی اہلِ مغرب کے بھائی ہیں، وہ کیوں اپنی آخری سانسوں تک اپنے پاؤں کی بیڑیاں گھسیٹتے پھرتے ہیں؟ اور انھیں کیوں درختوں کی ٹہنیوں میں مجسمۂ عبرت بنا کر پھانسیوں پر لٹکایا جاتا ہے؟ اسی لیے تو، کہ انھوں نے ایک بدترین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اس جرم پر اصرار بھی کر رہے ہیں۔ اور ان کا یہ بدترین جرم یہ ہے کہ وہ سیاہ فام ہونے کے باوجود بھی زندہ ہیں۔

ہم یہ سب سوال ان سے اس لیے نہیں کرتے کہ ان فسیخی خوروں کو نہ تو شرم آتی ہے اور نہ ان بے ضمیر لوگوں کو کوئی احساسِ گناہ ستاتا ہے، البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ مشرق ہو یا مغرب، ساری روئے زمین پر ایسا کوئی نظام موجود نہیں ہے جو فرد کی کرامت و شرافت اور اس کی انسانیت کو اسلام سے زیادہ ملحوظ خاطر رکھتا ہو۔ ساری دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا واحد نظام ہے جو جماعت کی طرف سے ناحق فرد کی زندگی چھین لیے جانے کی صورت میں معاشرے کو مجرم گردانتا ہے، اور فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ معاشرے سے مقابلہ کرے، اور اگر اس مقابلہ میں وہ مارا جائے تو اس کے وارثین کو خون بہا دلایا جائے گا، اور اگر وہ

Marfat.com

اپنی جان کی حفاظت کے لیے معاشرے کے کسی فرد کو قتل کر دے تو خود اس پر خون بہا نہیں ہے۔ اسلام نے اس بات کو صرف ایک دلی آرزو اور ایک زبانی دعوے کی صورت میں نہیں رہنے دیا ہے بلکہ اس کو قانون کی حیثیت دی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جس محلے میں کسی شخص نے بھوکے رات گزاری، اللہ تعالیٰ اس محلے کے بارے میں اپنے عہد سے بری ہو جاتا ہے۔"

ابن حزمؒ جو بڑے فقیہ ہیں، فرماتے ہیں کہ جو آدمی بھوک سے مر جائے تو تمام اہلِ محلہ پر اس کا خون بہا لازم ہے —— (یا معاشرے کی نمائندہ ریاست پر خون بہا لازم ہوگا)۔

اہل مغرب اسلامی سزاؤں کو اس لیے بُرا سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ خود اپنے ملکوں میں بے تحاشا سزائیں جاری کرتے رہتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق، اسی طرح اسلام میں قید و تاوان کی سزائیں روزانہ دی جاتی رہتی ہیں۔ ان کی نظر میں اسلامی معاشرہ ایک زبردست قتل گاہ ہے جہاں کسی کو قتل کیا جا رہا ہے، کسی کو سنگسار کیا جا رہا ہے اور کسی کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی سزائیں اپنی سختی اور شدت کے باوجود شاذ و نادر ہی جاری ہوتی ہیں، بلکہ اسلامی معاشرے میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ پوری پوری نسل گزر جاتی ہے اور کسی پر سزا جاری نہیں ہوتی۔ بس وہ صورت ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمائی:

"اپنا کوڑا ایسی جگہ لٹکا دو جس جگہ سے گھر والے اسے دیکھتے رہیں۔"

گویا صرف دھمکی کافی ہے، ضرب کی اور مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

Marfat.com

اِسلامی سزاؤں میں فرد کے نقطۂ نظر کا لحاظ

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام جرم کو صرف جماعتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ فرد کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہے اور ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے درمیان پورا توازن اور کمال انصاف ملحوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ جب جماعتی نقطۂ نظر ملحوظ رکھتا ہے تو معاشرے کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو ارتکاب جرم سے محفوظ رکھے اور اس تحفظ کے لیے اسلام سزائیں مقرر کرتا ہے، اور جب فرد کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتا ہے تو ارتکاب جرم کے محرکات و جوازات کو پیش نظر رکھتا ہے اور انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کی رعایت کرتا ہے اور سزا کے اجراء سے پہلے جرم کے تمام معقول محرکات و اسباب کے ازالے کی سعی کرتا ہے اور اگر اس شدید احتیاط کے باوجود معقول جوازات کی موجودگی میں جرم سرزد ہو جائے تو اسلام میں اسے جرم نہیں سمجھا جاتا اور نہ اس پر سزا جاری ہوتی ہے۔

مَیں مندرجہ بالا بیان کی تائید میں حضرت عمرؓ کے دَور میں پیش آنے والے دو واقعات بطور دلیل پیش کرتا ہوں:

(ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شریعت کے نفاذ میں کوئی تساہل یا نرمی برتیں گے۔ وہ تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید حالت مرض میں موجود تھے اور آپؐ نے فرمایا تھا: "میرے پاس کتاب لاؤ، مَیں تمھیں ایسی بات لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو۔" تو اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر مرض کی شدت ہے، ہمارے پاس کتاب اللہ ہے جو ہمیں کافی ہے۔" ملاحظہ فرمائیے حضرت عمرؓ تو شریعت کے اس قدر پابند تھے، ان کے بارے میں یہ کیوں کر خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی نرمی اور ملائمت برتیں گے۔ ان کا تو ہر عمل اسلامی حدود میں داخل اور ایک مسلّمہ فیصلہ ہے)۔

Marfat.com

پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ جس سال قحط پڑا آپ نے چوری کی سزا ساقط فرما دی۔ اور قحط سالی کو آپ نے شبہ کا درجہ دیا، جس سے حد کا قیام روک دیا جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ جو واضح تر دلالت پر مشتمل ہے، یہ ہے کہ:

"حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلۂ مُزَینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی۔ پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لائے گئے اور انھوں نے اقرار بھی کر لیا۔ آپؓ نے کثیر بن صلت کو کہا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ جب وہ جانے لگے تو انھیں واپس بلایا اور فرمایا: 'قسم بخدا اگر مجھے یہ علم نہ ہوجاتا کہ تم ان لوگوں سے کام بھی لیتے ہو اور انھیں بھوکا بھی رکھتے ہو اور اس قدر بھوکا رکھتے ہو کہ اگر ان میں سے کوئی حرام شے بھی کھائے تو اس کے لیے جائز ہو، اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو میں ان کے ہاتھ ضرور کاٹتا۔ پھر آپؓ نے حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو مخاطب کر کے فرمایا: 'قسم بخدا میں نے ان لوگوں کے ہاتھ تو نہیں کٹوائے مگر تمہارے اوپر ایک تکلیف دہ تاوان لگاؤں گا۔' اس کے بعد آپ نے مزنی سے پوچھا: 'تمھاری اونٹنی کس قیمت کی ہے؟' اس نے کہا: 'چار سو کی'۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے ابن حاطب کو حکم دیا: "جاؤ اس مزنی کو آٹھ سو ادا کرو۔"

اس واقعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں اس وقت تک سزا کا نفاذ عمل میں نہیں آتا جب تک یہ ضمانت موجود نہ ہو کہ جرم کا کوئی سببِ جواز موجود نہیں ہے۔ اگر شبہ کے درجے میں بھی وجوہ جواز موجود ہوں تو سزا ساقط ہو جائے گی۔ خود فرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہے:

"شبہ سے سزا کو ساقط کر دو۔"

یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقرر کردہ ایک قانونی اصول

Marfat.com

ہے۔ اور فرد کے معاملے میں اس سے زیادہ رحم اور نرمی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جماعتی امن و سکون کو نقصان پہنچا رہا ہے اور اسلام اس کے لیے سہولت مہیا کر رہا ہے۔

اسلام اور اسبابِ قتل

اب ہم جرائم پر علیحدہ علیحدہ نظر ڈالتے ہیں اور ان معقول اسباب کو دیکھتے ہیں جو فرد کے نفس میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام سزا کے جاری کرنے سے پہلے کس طرح ان اسباب کے ختم کرنے کی سعی کرتا ہے:

اگر ہم دنیا میں ہونے والے قتل کے واقعات کے اعداد و شمار جمع کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر وارداتوں کے اسباب، یا تو اقتصادی ہوتے ہیں، یا پھر وہ اسباب ہوتے ہیں جو عزت اور غیرت سے متعلق ہوتے ہیں۔

اقتصادی مسئلہ کو اسلام نے اجتماعی کفالت اور اجتماعی تامین (Collective Insurance) کے پروگرام کے ذریعے حل کر دیا ہے۔

اسلام میں حکمراں پر لازم ہے کہ وہ معاشرتی انصاف کو فروغ دے اور ایسا معاشرتی توازن پیدا کرے کہ نہ تو معاشرے میں مجرمانہ عیش و عشرت کی گنجائش رہے اور نہ مہلک تہی دستی اور فاقہ کشی ہی موجود رہے۔ اسی لیے اسلامی قانون نے سُود اور ذخیرہ اندوزی کو حرام کر دیا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں سرمایہ داری کی بڑھوتری اور افزائش کی اصل غذا ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے زکوٰۃ عائد کر دی ہے جو صرف منافع ہی پر وصول نہیں کی جاتی بلکہ اصل سرمائے پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسلام نے قوانین میراث نافذ کیے، تاکہ سرمایہ اکٹھا نہ ہونے پائے۔ اور کارکن کو منافع میں سرمایہ دار کا شریک بنایا ہے، تاکہ سرمایہ، دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے اور ان سب اصول و قوانین کے

Marfat.com

بعد ریاست کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ دولت مندوں کے زائد مال کو غریبوں میں تقسیم کرائے۔ (جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے ارشاد فرمایا تھا) اسی طرح اسلام نے اسلامی حکومت پر یہ ذمے داری عائد کی ہے کہ وہ امت کے ہر فرد کو، اس کے مناسب، معقول روزگار فراہم کرےلے اور اگر کوئی شخص کمانے سے عاجز ہو تو اس کی اقتصادی اور اجتماعی ذمے داریاں بیت المال سے پوری کی جائیں۔

اسلام صرف اس معاشی انصاف کے برپا کرنے ہی پر اکتفاء نہیں کرتا جس کے وجود میں لانے کے لیے اشتراکیت اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہے اور پھر یہ سمجھ کر بیٹھ رہتی ہے کہ اقتصادی جبریت خود ہی یہ سارا عمل انجام دے دے گی اور کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس امر کا بہت زیادہ اہتمام کرتا ہے اور مسلسل اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگوں کی ابتدائے طفولیت ہی سے ایسی تربیت کی جائے جس سے ان میں محبت، الفت اور تعاون کے جذبات بیدار ہوں اور دلوں سے کینہ اور حسد بالکل مٹ جائے۔

اس طرح کے معاشرے میں قتل کے اور ظلم و زیادتی کے اقتصادی اسباب کا بالکلیہ خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس قدر احتیاط کے باوجود بھی اسباب قتل پیدا ہو جائیں تو خود اسلام نے فرد کو ایسے شخص کے قتل کی اجازت دی ہے جس کے پاس اس کا طعام ہو اور وہ بھوک کی ہلاکت کے خطرے کے باوجود اسے کھانے کو نہ دے۔

لے کسی نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دست سوال دراز کیا تو آپؐ نے اس کو منع فرمایا اور اس کے لیے کام کا بندوبست فرما دیا ــــ اور یہ وہ بنیادی حق ہے جو مسلمان عوام کی جانب سے حکمرانوں پر لازم ہے۔

Marfat.com

اسلام نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ معاشرے میں تمام اجتماعی مظالم بھی موجود رہیں اور لوگوں سے یہ مطالبہ بھی کیا جاتا رہے کہ وہ جرم نہ کریں، بلکہ اسلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ پہلے تمام مظالم کا خاتمہ کرتا ہے اور پھر لوگوں سے کہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں۔

جو اسباب قتل، عزت اور غیرت سے متعلق ہیں، اسلام نے ان کے بھی عدم وجود کی ضمانت دی ہے اور اس کے لیے حد زنا کا قانون نافذ کیا ہے۔ اور اس مسئلے میں بھی صرف قانون سازی پر اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ اس بات کی انتہائی بھرپور کوشش کی ہے کہ فرد اپنے آپ کو خواہشوں کے ضبط کرنے کا عادی بنائے اور اپنی شہوانی قوتوں کو معقول قانونی حدود میں بند رکھے، تاکہ پورا معاشرہ اس سے مستفید ہو اور آخرالامر، خود اس کو بھی اس تحفظ کا فائدہ پہنچے۔

اگر معاشرہ اخلاقی بنیادوں پر استوار ہو، اس کے افراد حیوانیت کو ناپسند کریں اور بہیمیت سے گریز کے عادی ہوں اور اس معاشرے میں عزتوں کے لوٹنے والوں کو سزائیں دی جاتی ہوں، تو اس سماج میں ایسا کوئی سبب باقی نہیں رہتا جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنی عزت کے تحفظ کے لیے قتل کرے۔

چوری کے اسباب

فاقہ کشی، معقول روزگار کی نایابی اور سماجی معیشت کی بدنظمی اور ابتری چوری کے بنیادی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نے حکمرانوں پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ اس معاشی بدنظمی کا خاتمہ کریں، ہر فرد کو مناسب روزگار فراہم کریں اور ہر شخص کو اور اس کے زیر کفالت لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کریں۔ اگر روزگار ناکافی ہو تو بیت المال باقی ضرورت پوری کرنے کا ذمے دار ہے۔ اور اگر کوئی شخص بڑھاپے، بیماری، کمزوری اور

Marfat.com

نوعمری کی بنا پر کسب رزق سے عاجز ہو تو اس کی تمام شریفانہ ضروریات زندگی کی فراہمی بیت المال کے ذمے لازم ہے۔ اور ان سب قانونی تحفظات کے ساتھ ہی اسلام اپنے معاشرے کے افراد کی تربیت اس طور پر کرتا ہے کہ ان میں انفاق فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں خرچ کرنا) کا شوق وجذبہ پیدا ہو، بلکہ اسلام نے انفاق کو ایسا فرض بتلایا ہے جس کے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اگر ان تمام تحفظات اور تربیت کے باوجود کوئی شخص ایسا رہ گیا جس نے بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر چوری کر لی، یا اپنے وسائل زندگی کے کمیابی کے ازالے کے لیے چوری کر لی، تو اسلامی قانون کے مطابق، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور حضرت عمرؓ کے دونوں واقعات کی روشنی میں اس شخص سے حد ساقط ہو جائے گی اور اس پر سزا جاری نہیں ہوگی۔

زنا کے محرکات

زنا کا اصل محرک، تند و تیز اور ہیجان انگیز فطری جبلّت ہے جس کا اسلام نے کئی طریقوں پر علاج کیا ہے:

(۱) اسلام نے فرد کو اس بات کی تربیت دی ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کو، بالخصوص جنسی شہوت کو بغیر دبائے اور بغیر کچلے کنٹرول کرے۔ اور اس طریقے پر کنٹرول کرے کہ نفسیاتی اور اعصابی اضطرابات کا شکار نہ ہو۔ اگر نوجوان اس خواہش کا احساس کرے، مگر اس کا دل گنہگار نہ ہو تو اس کے اعصاب سے کافی دباؤ (Repression) ختم ہو جائے گا۔

(۲) اسلام نے ایک ایسا معاشرہ برپا کیا جس میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں وہ تبرّج نہیں ہوتا جو چھپی ہوئی شہوانی خواہشوں کو ابھارتا ہے۔ اس معاشرے میں عُریاں تصاویر نہیں ہوتیں، وہ سنیما

Marfat.com

اور وہ لشریات نہیں ہوتیں جو سب مل جل کر انسان کو آمادۂ جرائم کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام نے عزتوں کے تاجروں اور لٹیروں پر بھی قدغن لگائی ہے۔ اور اس طرح ان تمام عوامل کی روک تھام کی ہے جو اس جبلت کو مجنونانہ بے حیائی کی حد تک اُبھار دیتے ہیں اور اس حد تک برانگیختہ کر دیتے ہیں کہ ضبط اور کنٹرول ہی دشوار ہو جاتا ہے اور پھر نوجوانوں کو اپنے گھٹے ہوئے جذبات کی نکاسی کی تمام راہیں سجھا دیتے ہیں۔ مگر اسلام چونکہ انسانی طبیعت سے آشنا ہے اور اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسان کا تحفظ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب اس جبلت کے اوپر طاری ہونے والے عوارض کی تخفیف کی جائے، اس لیے وہ اس کا واحد علاج شادی مقرر کرتا ہے۔ نکاح میں جلدی کی تاکید کرتا ہے اور نکاح کے لیے اس قدر سہولتیں فراہم کرتا ہے کہ بیت المال پر لازم کرتا ہے کہ وہ اس شخص سے تعاون کرے جس کی مالی حالت شادی کی راہ میں رکاوٹ ہو[1]

مندرجہ بالا بیان کردہ عملی اور تربیتی احتیاط کے بعد اس جرم کا کوئی معقول سبب باقی نہیں رہ جاتا۔ مگر اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہے کسی فرد کا جبلی دباؤ انتہائی شدید ہو اور وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس طرح اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈال دے۔ پھر اس کمزور شخص پر اس کے اس قدر عظیم جرم کے باوجود اس سے زیادہ رحمت و مہربانی کیا ہو سکتی ہے کہ شریعت اسلامیہ نے کچھ ایسی گنجائشیں رکھ دی ہیں جن کی بناء پر یہ مجرم شخص سزا سے بچ جائے۔

---

[1] آج کے سماج میں ہر شخص کا ذہن اس طرف جانے کا کہ یہ حل ناممکن العمل ہے۔ "مسئلۂ جنس" کے باب میں میں نے ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میں اسلامی معاشرے کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں اور

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

جرم زنا کا اثبات صرف اس صورت میں ہوتا ہے کہ چار آدمی جنھوں نے عملاً جرم ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، وہ اس جرم کی شہادت مضبوطی اور یقین کے ساتھ دیں۔ اگر ان چار میں سے ایک کم ہوگیا یا کسی ایک نے اپنی گواہی واپس لے لی تو باقی لوگ جھوٹی بات پہنچانے کے مجرم سمجھے جائیں گے اور اصلی مجرم کے بجائے خود ان جھوٹے گواہوں کو سزا دی جائے گی۔

اس احتیاط کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بدکاروں کو بدی کرنے کی سہولت مل جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی رنجشوں کی آسودگی اور بیمار ذہنیت کی تسکین کی خاطر اس مسئلے میں جھوٹی خبر پہنچا کر، بے گناہ لوگوں کو سزائیں نہ دلوا سکے۔ جیسا کہ اسلام نے اس احتیاط میں یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ اگر جرم زنا کا اثبات دشوار ہو اور جو گواہ مضبوطی سے گواہی پر جمے نہ رہیں انھیں سزا دی جائے، تو اس سے جرم کی تبلیغ بالکل نادر الوقوع ہو جائے گی اور سماج میں کسی کو یہ ہمت نہیں ہو سکے گی کہ وہ جرم زنا کے سرزد ہونے کو بیان کرے اور اس جرم کے بارے میں افواہیں پھیلیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سننے والوں کے سامنے وقوع جرائم کا جس قدر زیادہ تذکرہ ہوتا رہے گا وہ اس کو اتنا ہی ہلکا سمجھتے رہیں گے اور کمزور کردار کے لوگ اس کے کرنے پر آمادہ ہوتے جائیں گے۔ لیکن اگر سماج میں جرم کا ذکر نہ ہو تو لوگوں کے ذہنوں میں جرم کی دہشت باقی رہے گی، لوگ اسے برا سمجھتے رہیں گے اور اس کے ارتکاب کی ہمت نہیں کریں گے۔ اور اس طرح سلبی طور پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میری گفتگو کا موضوع وہ معاشرے نہیں ہیں جن میں اسلام کے نام کے سوا اور کوئی بات اسلامی نہیں پائی جاتی اور جن میں حدود اللہ کا اجراء ممکن نہیں ہے۔

Marfat.com

یہ مانع، جرم کی اشاعت میں رکاوٹ بنا رہے گا بغرض اثبات وقوع زنا کو دشوار ترین بنانے سے، مقصودِ اسلام یہ ہے کہ برائی کی اشاعت نہ ہو اور لوگوں کے کانوں میں یہ خبریں نہ پڑیں، تاکہ پاکباز لوگ اور پاکباز عورتیں ہر اس بات سے بچی رہیں جس سے ان کی پاکبازی اور نزاہت پر حرف آتا ہو۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس شخص کو نصیحت فرمائی، جس نے کوئی گناہ کیا ہو اور اللہ سبحانہٗ نے اس کی پردہ پوشی فرما دی ہو، کہ وہ پھر لوگوں میں کہتا نہ پھرے کہ مَیں نے یہ کیا اور مَیں نے وہ کیا۔

گویا اسلام میں جرم زنا پر سزا صرف اس سرکش پر جاری ہو گی جس کی سرکشی اس حد سے بڑھ جائے کہ چار گزرنے والے اسے جرم میں ملوث دیکھ لیں۔ مَیں نے گزرنے والے اس لیے کہا ہے کہ اسلام میں تجسس ممنوع ہے اور جرم کے اثبات کے لیے گھروں کی دیواریں پھلانگ کر اندر جانا اس سے بھی زیادہ ممنوع ہے۔ سوائے اس کے کہ ایسے قرائن موجود ہوں کہ جن سے پتہ چلتا ہو کہ فلاں گھر میں مفسدین نے برائی کا اڈہ قائم کر لیا ہے۔

یہ سرکش جو برملا ارتکابِ جرم کرتا ہے یہ در اصل بیک وقت دو جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک تو اس نے اپنی جبلت کو کنٹرول نہیں کیا۔ دوسرے اس نے اس برائی کا کھلم کھلا ارتکاب کر کے سماجی روایات و اقدار اور قوانین کا مذاق اڑایا اس لیے وہ کسی شفقت و رحمت کا مستحق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس کے بارے میں اور اس جرم میں اس کی شریک کے بارے میں کہتا ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ (النور: ۲)

"اور تم لوگوں کو ان دونوں پر، اللہ کے دین کے معاملے میں ذرا رحم نہ آنے پائے۔"

وہ چھپا ہوا مجرم جو لغزش کے وقت بھی سماجی روایات کو ملحوظ رکھے

اور اخفاء برتنے وہ معاشرے کے لیے کم خطرناک ہے کیونکہ اس کے جرم کی اشاعت نہیں ہوتی اور یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ اس کی بری مثال سے برائی کی ترویج میں مدد ملے گی۔ اس وقت تو وہ جانے اور اس کا ضمیر جانے۔ آخرت میں یقیناً سخت عذاب اس کا منتظر ہوگا۔ اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے تو، ہو سکتا ہے، خدا اسے معاف کر دے۔ یا اگر اپنی روش بد پر قائم رہے تو اپنی حیوانیت میں اضافہ کرتا رہے اور آخرت میں ملنے والے عذاب کی مدت بڑھواتا رہے۔

مندرجہ بالا بیان غیر شادی شدہ نوجوانوں سے متعلق تھا۔ مگر بسا اوقات شادی شدہ لوگ بھی اس لغزش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت ازدواجی زندگی ایک ایسا قلعہ ہے جس میں داخل ہو جانے کے بعد جرم کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے ان کے لیے سخت سزا مقرر کی گئی ہے اور انھیں سنگسار کر کے مار دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود رشتۂ ازدواج میں منسلک جوڑے پر اس سخت سزا کا اجراء اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ اس جرم کے تمام معقول اسباب کا سدباب نہ ہو جائے۔

مثلاً یہ سبب کہ شوہر میں اس قدر سخت جنسی طاقت ہے کہ اسے ایک بیوی کافی نہیں ہے، یا وہ اس بیوی کو اس لیے پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق اس سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ اسی لیے تعدد ازدواج کا اصول اور قانون طلاق رکھا گیا ہے، تاکہ ان دونوں کی رعایت ہو جائے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر اسباب ہیں جو مختلف حادثاتی واقعات میں پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً بیوی کا یہ عذر کہ اس کا شوہر اس کی پوری طرح تسکین نہیں کر پاتا یا وہ اسے ناپسند کرتی ہے اور اس کے اتصال سے مطمئن نہیں ہوتی، تو ان دونوں صورتوں میں اس کے لیے جائز ہے کہ وہ طلاق حاصل کر لے۔ غرض اس طرح تمام معقول اسباب کا سدباب کر دیا گیا ہے اور اس کے

Marfat.com

سوا کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ اس بدترین جرم پر سخت سزا دی جائے۔

اسبابِ مے نوشی

مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک پاکیزہ فطرت کا حامل، مے نوش کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کو کیا چیز اس فعل پر آمادہ کرتی ہے اور کیوں یہ اپنی کرامت، نفس کو فراموش کر کے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں؟ یہ مے نوش کہتے ہیں کہ وہ اپنے افکار پریشاں کو غرقِ مئے ناب کر دیتے ہیں اور ناامیدی کی تاریکی سے نجات حاصل کر کے طرب و نشاط کی فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر کیا یہ بات فی الحقیقت درست ہے؟ اور کیا اس نشہ کی کوئی قیمت ہے جس کے بعد خمار اور دَورانِ سر اور شدید ہو جاتا ہے اور اس کے بعد طلوع ہونے والی صبح پہلے سے کہیں زیادہ ہجوم مصائب لے کر آتی ہے؟

بہرکیف مَیں تو یہی کہوں گا کہ مے نوشی ایک غیر متوازن اور پراگندہ سماج کی بیماری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بے پناہ آسائشوں میں گم کر انسان احساس آسائش ہی بھول جاتا ہے اور پھر اس کند احساس کے جگانے کے لیے مصنوعی نشاط آور اشیاء کا استعمال کرتا ہے تاکہ کسی قدر اس کا کھویا ہوا نشاط اسے میسر آسکے۔ عیاش طبع لوگ جس قدر فراغت اور بے کاری کی زندگی گزارتے ہیں اس سے ان کے مزاج میں کدورت اور اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کے دُور کرنے کے لیے وہ مصنوعی مصروفیات اور دلکشیوں کا سہارا لیتے ہیں اور اس نو بہ نو بدلتے ہوئے کیف میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک خوش گوار و پرکیف زندگی گزار رہے ہیں۔ محلات کے اندر ان آسائش پسندوں کی زندگی چونکہ برائیوں میں گزرتی ہے اس لیے ان کی زندگی مے ناب میں ڈوبی رہتی ہے۔

اس کے برخلاف محروم و غمگین کچلے ہوئے عوام، جن کی تشنہ کام

Marfat.com

آرزوئیں ان کے گوشۂ دل کو گرماتی رہتی ہیں اور زندگی کی صعوبتوں کا پھندا ان کی گردن میں پھنسا رہتا ہے وہ شراب اور دیگر منشیات میں ان صعوبتوں کا فرار ڈھونڈتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ رنج والم اور مصائب و افکار کو بھلا کر رات کا کچھ حصہ کیف و نشاط میں بسر کریں۔ مگر جب سویرا طلوع ہوتا ہے تو ان کی زندگی پھر اسی طرح شروع ہو جاتی ہے جس طرح کہ کل شروع ہوئی تھی۔

سب سے زیادہ نشہ کا شکار بے روزگار مزدور کارکن ہوتے ہیں، کیونکہ کارکن کے لیے نفسیاتی لحاظ سے مالی پریشانی اس قدر خطرناک نہیں ہے جس قدر کہ بے کاری خطرناک ہے۔ اسی لیے وہ اپنی اس بے کاری کو فراموش کرنے کے لیے زیادہ نشہ کرتا ہے۔ پھر اپنی کم مائیگی کی بنا پر وہ خراب ترین نشہ آور اشیاء استعمال کرتا ہے جو قوت فکر کو مفلوج کرنے میں سب سے زیادہ شدید ہوتی ہیں۔ دراصل شراب اور نشہ آور اشیاء اس معاشرے کا لازمہ ہیں جس میں طبقاتی امتیازات زیادہ ہوں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام معاشروں میں آج نشہ آور اشیاء مستعمل ہوتی ہیں اور مقصد یہی ہے کہ کچھ وقت کے لیے زندگی کی مشکلات سے فرار حاصل کیا جائے ـــــ آج کی جدید تہذیب، وہ مغربی مادی تہذیب ہے جو روح پر ایمان نہیں رکھتی اور مادیت سے قطعاً بلند نہیں ہوتی۔ یہ تہذیب ایک ناگوار بوجھ کی طرح اعصاب پر لدی رہتی ہے۔ اس میں تھکا دینے والی مشقتوں اور اعصابی تھکاوٹوں کا روحانی علاج موجود نہیں ہے، بلکہ ایسی مصنوعی تفریحات فراہم کی گئی ہیں جو انسان کو بے جان و بے روح مشینی زندگی کے تسلسل سے کچھ دیر کے لیے ایک نئی فضا میں پہنچا دیں اور اس طرح دفتروں اور کمپنیوں میں سارا سارا دن بیٹھ کر کام کرنے والے کچھ گھڑیاں فرحت و انبساط کی گزار لیں۔

جہاں جہاں تہذیب مغرب اپنا قافلہ لیے ہوئے پہنچی ہے وہاں شراب اور دیگر اخلاقی برائیاں اس کے جلو میں ضرور پہنچی ہیں۔

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک کی سخت سردی سے بچنے کے لیے اہلِ مغرب شراب پیتے ہیں۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ امریکہ کے شدید گرم علاقوں میں بھی شراب نوشی عام ہے اور یورپ کے سرد علاقوں میں بھی ایسے لوگ آباد ہیں جو شراب استعمال نہیں کرتے۔ مگر اس کے باوجود ان کے نشاطِ عمل اور کارکردگی میں فرق نہیں آتا ـــــ یہ بیان مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ یورپ میں انسانوں کے تعلقات ایک طویل زمانے سے ایسے غیر انسانی بنیادوں پر قائم ہیں جس میں روحانیت اور محبت و انسیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے تہذیب مغرب پر ایک قسم کی سختی اور قساوت چھا گئی ہے، اور کشاکشِ حیات نے زندگی پر ایک سخت چھلکا جما دیا ہے جسے پگھلانے کے لیے کسی ایسی شئے کی ضرورت ہے جو اس جمود کو توڑ سکے اور چٹانیں تراش کر انسانی سکون و اطمینان ڈھونڈ کر لا سکے۔ مشرقی اور اسلامی معاشروں میں انسانیت تو موجود ہے، سطحِ زندگی پر بھی تیر رہی ہے اور ضمیر کی گہرائیوں میں بھی اتری ہوئی ہے۔ یہاں وہ خواص شراب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو محلوں کی پُرآسائش زندگی سے اکتا جاتے ہیں، اور وہ عوام فرارِ زندگی کے حصول کے لیے لپکتے ہیں جو ایک طویل عرصے سے سیاست و حکومت کی چکی میں پس رہے ہیں۔

اسلامی نظام، اختلال سے دوچار معاشرے میں توازن پیدا کرتا اور خالی وقت گزارنے والے، کوٹھیوں کے باسیوں اور تنگ دست عوام، سب کو مشاغل فراہم کر کے پریشان کن ضرورت اور اکتا دینے والی فراغت کو ختم کر دیتا ہے۔

اسلامی تربیت چونکہ دلوں میں نرمی اور محبت کے جذبات ابھارتی ہے اس لیے کسی کے دل میں غم و الم کی ایسی کیفیت پیدا نہیں ہوتی جس کا وہ اظہار نہ کر سکے اور لوگ اس کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ نہ کریں

Marfat.com

اور اسے دوبارہ امید و رجا کی فضا میں واپس نہ لائیں اور وہ اس پر مجبور ہو جائے کہ اس ساری مصیبت سے چھٹکارا حقیقت نفس الامری سے فرار اسی کے ذریعے سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے علاوہ اسلام کیف کے خواہاں لوگوں کو عبادت الٰہی کا کیف فراہم کرتا ہے اور اس طرح اس نفسیاتی حالت کا علاج کرتا ہے۔ البتہ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان عبادت میں مشغول ہو کر حصول رزق کی جدوجہد ہی سے غافل ہو جائے اور کش مکش حیات کے لیے جس قدر چوکس ہونے کی ضرورت ہے وہ تندہی ختم ہو جائے۔

اس ساری احتیاط و تدبیر کے باوجود اگر کسی کی نفسیاتی یا جسمانی حالت اسے مے نوشی پر مجبور کر دے تو دو گواہوں کے بغیر اسے شراب نوشی پر سزا نہیں دی جاتی۔ جب کوئی شخص کھلم کھلا شراب پیتا ہے تو اس پر سزا جاری ہوتی ہے۔ اور کھلم کھلا پینا ایک علیحدہ جرم ہے، کیونکہ اس طرح معاشرے کے سامنے ایک بری مثال آجاتی ہے جو دوسروں کو برائی پر اکسانے کا سبب بنتی ہے۔ چھپا کر پینے والا اگر توبہ نہ کرے تو اس کو اس دنیا میں سزا نہیں دی جاتی بلکہ اس کو آخرت ہی میں سزا ملے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مے نوشی کا عادی اپنی اس عادت کی زیادہ دن پردہ داری نہیں کر سکتا بلکہ کسی نہ کسی وقت وہ علی الاعلان اس کام کو کر کے سزا کا مستحق ٹھیر سکتا ہے۔

اسباب ارتداد

ارتداد کے اسباب بیان کرنا میرے لیے بڑا مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی وقت تشکیک کی ایک رو آتی ہے جس کی زد میں آنے والا اپنے خدا کے وجود میں شک کرتا ہے، اپنے گرد و پیش کے بارے میں شبہ کرتا ہے حتیٰ کہ خود اپنے بارے میں شک کی کیفیت سے گزرنے لگتا ہے۔ یعنی گویا یہ ایک نفسیاتی کش مکش ہے جو کبھی وقتی طور پر پیدا ہوتی

Marfat.com

اور کبھی دائمی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یا یہ کہیے کہ یہ ایک نفسیاتی خلل ہے جو قوت فکر کو متاثر کرتا ہے۔ یہ توجیہہ اس صورت میں ہے جب ہم حسنِ ظن سے کام لیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس فکری حیلہ سازی کے پس پردہ، قیود اور بندشوں سے آزاد ہونے ہی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں افراد کی تربیت، ایمان پر کی جاتی ہے اور لوگوں کے نفوس میں یہ بات راسخ کر دی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کریں اور ہر مشکل میں اسی کی جانب رجوع کریں اور اسلام بندوں اور خدا کے درمیان محبت و رجاء کا تعلق پیدا کرتا ہے جس سے وہ روحانی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں جو متشککین کے دلوں میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا سے قبل نصیحت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود اگر مرتد اپنے افکار کو اپنے تک محدود رکھتا ہے اور ان کی معاشرے میں اشاعت نہیں کرتا، تو چونکہ اس کے افکار کا کسی کو علم نہیں ہے اس لیے اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ بلکہ جب وہ اپنے ان افکار کا برملا اظہار کرے گا تو اس کو سزا دی جائے گی۔ چونکہ اس برملا اظہار میں بُرے اثرات کے پھیلنے اور سماج کو صدمہ پہنچنے کے خطرات پوشیدہ ہیں۔

چھپا ہوا مرتد اگر توبہ کر لے اور ہدایت اختیار کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے آخرت میں اس جرم کی سزا ملے گی۔

فساد فی الارض کے اسباب

فساد فی الارض، (ملک میں ابتری پھیلانا) گزشتہ تمام جرائم کا مجموعہ ہے سوائے اس کے کہ اس کا ارتکاب کرنے والے، افراد نہیں ہوتے بلکہ جماعتیں ہوتی ہیں جنھیں برائی پر افراد سے زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے۔ فساد فی الارض

Marfat.com

کے اسباب صرف ایسے گرے ہوئے معاشرے میں مِل سکتے ہیں جس میں لوگوں کو پاکیزہ روزگار میسر نہ آتا ہو اور اس سے وہ اپنی روزی نہ کما سکتے ہوں۔

اسلامی معاشرہ اس صورت حال کو بالکل برداشت نہیں کرتا بلکہ جب بھی ایسی صورت پیدا ہوتی ہے فوراً اس کا ازالہ کرتا ہے۔ اس طرح فساد فی الارض کا کوئی معقول جواز موجود نہیں ہے اور مفسدین کو لازماً سزا دی جائے گی۔

غرض جرم و سزا کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ سماج کے اس حق کو بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ اس میں اطمینان و سکون موجود رہے اور اس اطمینان کی فراہمی کے لیے قوانین بھی بناتا ہے، مگر ساتھ ہی فرد کے نفس میں پیدا ہونے والے ارتکاب جرائم کے محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور اس وقت تک سزا جاری نہیں کرتا جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ فرد کے شعور میں اس جرم کے جوازات موجود نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام جرم کے اقتصادی اور نفسیاتی محرکات دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور اہلِ مغرب کی یاوہ گوئی سے ایک ہزار سال قبل سے رکھتا ہے۔

مکمل انصاف وہ ہے جو اسلام نے انسانیت کو عطا کیا ہے، اور بغیر کسی کمی بیشی کے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیا ہے۔ اسلام میں وہ کمزوریاں بلاشبہ نہیں ہیں جن کا لوگ ذکر کیا کرتے ہیں اور نہ وہ جزئی انصاف ہے جس تک اب کچھ کوتاہ فکر انسانوں نے رسائی حاصل کی ہے۔

اسلام ان باتوں کا قائل نہیں ہے جو تحلیلی نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ تمام مجرم مریض ہوتے ہیں اس لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ معاشرہ کے شذوذ پر انھیں سزا دے۔ البتہ اسلام معاشرے کو تمام اقتصادی، نفسیاتی اور روحانی وسائل کو کام میں لاکر اس سطح پر لے آتا ہے کہ اس میں شذوذ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور اگر اس کے بعد بھی کچھ شاذ و نادر حالات میں تمام کوششیں کر لینے کے باوجود کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس میں معاشرے کے ان بے گناہ

Marfat.com

افراد کا کیا قصور ہے جن کے معاملے میں ارتکاب جرم ہوا ہے اور جنھوں نے اس شذوذ کے رونما ہونے میں کوئی دخل نہیں دیا ہے؟ تقاضائے انصاف تو یہی ہے کہ اس شاذ کو ارتکابِ جرم سے ڈرانے کے لیے سزائیں مقرر کی جائیں تاکہ وہ ارتکاب جرم سے پہلے اس کے انجام پر غور کرلے اور اس سے باز آجائے۔ اور اگر شذوذ (Abnormality) اس قدر شدید ہو کہ قوتِ ارادی ہی مفقود ہو جائے تو سزا خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ سزا کا اجراء تو شخصِ مسئول (جواب دہ) پر ہوتا ہے۔

البتہ ان نارمل حالات میں جب قوتِ ارادی مفقود نہ ہو اور مسئولیت باقی ہو، تو زیادہ سے زیادہ نقصان یہی ہے کہ سزا کے خوف سے جرم کے میلانات کچلے جائیں گے اور یہ معاشرے کے تمام افراد کے تحفظ کی خاطر کم سے کم نقصان ہے۔ اسلام تو بہر حال یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگوں کے نفوس کی اصلاح کرے اور جس قدر بھی ممکن ہو جرم کے محرکات کا بالکلیہ سدِّباب کردے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تمام معاشروں میں، صحیح اسلامی معاشرے نے سزاؤں کا کم سے کم سہارا لیا ہے کیونکہ اسلام تو نفس انسانی کو اس کی اصل و منبع پر استوار کرنا چاہتا ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

مسئلۂ جنس

احساسِ ذات کے بعد فرد کے نفس میں پیدا ہونے والے تمام احساسات میں احساس جنس زیادہ شدید ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ انسان خونخوار درندوں کی چیرہ دستیوں اور حادثات واقعات کی ستم ظریفیوں سے کسی وقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لے۔ مگر جنسی قوت انسانی وجود پر ہر وقت چھائی رہتی ہے اور اسے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر زندگی کی پیچ در پیچ راہوں میں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف تمدن اور تہذیبیں، جب انسانوں کو جان و مال کا پورا پورا تحفظ دے دیتی ہیں، تو ان میں جنسی محرک زیادہ شدید ہو جاتا ہے اور زندگی میں اس کا میدان وسیع ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں بسنے والے وحشی لوگ جنسی معاملہ میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اگرچہ یہاں اس فرق کی وضاحت بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ ابتدائی تمدن کے لوگ محدود پیمانے پر اور مقرر دائرے میں تمام معاملات زندگی بشمول جنسیت میں سختی و تندی کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے بالمقابل جدید تہذیب اور اہلِ تہذیب ہر معاملے میں پوری وسعت و ہمہ گیری برتتے ہیں۔

ہر وہ تمدن جس میں زندگی کی آسائشیں بکثرت مہیا ہوں اور زندگی کے وسائل متعدد و متنوع ہوں، مگر اس کے سامنے کوئی مقصدِ عظیم نہ ہو جس کے لیے اہلِ تمدن جان کھپائیں، تو ایسے تمدن میں جنسی شعور بہت زیادہ اُبھر جاتا

Marfat.com

ہے اور خود جنس ہی زندگی کا ایک اہم شغل اور مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایسی متمدن زندگی میں غذا بھرپور ہوتی ہے، بستر آرام دہ ہوتے ہیں اور جسمانی توانائی کا ایسا فالتو ذخیرہ بچا رہتا ہے جو اہم مقاصد میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مطالباتِ زندگی بسہولت پورے ہو جانے کے بعد بھی اس قدر وقت و فرصت باقی رہ جاتے ہیں کہ ان کے گزارنے کے لیے جنس کے سوا اور کوئی مشغلہ باقی نہیں رہتا۔

مسئلہ جنس کی مشکل یہ ہے کہ جہاں جنس انسان کے لیے لازمی اور ضروری ہے وہاں اس میں کچھ مضرتیں اور نقصان بھی ہیں۔

جنس ضروری تو اس لیے ہے کہ جب تک ہر نسل میں مرد و زن کا ازدواج نہ ہوتا رہے، اس وقت تک بقائے نسلِ انسانی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر نسل انسانی کے ہر فرد کے نفس میں یہ مطالبہ جنس ہو تاکہ ازدواج مکمل ہو سکے اور نسلِ نو آکر روئے زمین کو آباد کر سکے۔ اور ضروری ہے کہ ہر فرد کے نفس میں جنسی میلان اس قدر شدید ہو کہ اگر وہ چاہے بھی تو اس سے بچ کر نہ نکل سکے۔

جنس کا نقصان یہ ہے کہ اس محرک پر پوری طرح لبیک کہنے کے نتیجے میں انسان اپنے مقام سے گر کر درجۂ حیوانیت پر آجاتا ہے، جس سے زندگی تہہ و بالا ہو جاتی ہے، کیونکہ اس وقت زندگی کا مقصد جسم کی ضروری اور فطری خواہش کی تکمیل رہ جاتی ہے اور ہر فکرِ بلند، ہر شعورِ انسانی اور ہر پاکیزہ فن اسی خواہش کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس طرح معاشرہ ٹوٹ پھوٹ جاتا اور تہذیب زوال آشنا ہو جاتی ہے۔

جنس اور انسانی ذمے داریاں

ان دونوں متضاد سمتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا انسانیت کا فریضہ ہے۔ دنیائے حیوانات میں جبلت خود بخود جنسی سرگرمی کے موسم متعین کر دیتی ہے،

Marfat.com

موسم گزر جاتا ہے، مادہ حیوانات نئی نسل کے لیے تیار ہو جاتی ہے تو مذکر و مؤنث جنسی سرگرمی سے قطعاً کنارہ کش ہو جاتے ہیں، اپنے کنٹرول اور ارادے سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ان میں پھر رغبت ہی باقی نہیں رہتی۔

مگر انسان اس جبلّی قید سے آزاد ہے۔ اس کے لیے ہر موسم و ہر وقت جنسی سرگرمی کے لیے موزوں قرار دے دیا گیا ہے۔ مگر اس آزادی کے بدلے میں ذمے داری بھی سونپی گئی ہے کیونکہ زندگی میں کوئی بھی عطیۂ فطرت بلا حساب و مواخذہ نہیں بخشا جاتا۔ اور اسی ذمے داری اور جوابدہی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبات کی تنظیم کرے اور انھیں اس طرح کنٹرول کرے کہ اس سے مطلوبہ مقاصد تو حاصل ہو جائیں مگر کسی فرد یا جماعت کو اس کا نقصان نہ ہو۔

جس قدر انسان اس ذمے داری کو نبھائے گا اسی قدر شاہراہ ترقی پر زیادہ آگے بڑھ سکے گا۔ کیونکہ اگر انسان جنسی لذتوں میں مستغرق ہو جائے اور زندگی کے دیگر ان اہم مقاصد کو فراموش کر دے جن کو قانون ارتقاء اور اصول تغیر کے ماتحت مسلسل ترقی دینا اور بہتر بنانا لازمی ہے، یا انسان جنسی محرک سے بالکلیہ لاپرواہی اختیار کرلے اور پاکبازی اور طہارت اختیار کرنے کے لیے دنیاوی ضروریات سے کنارہ کش ہو جائے تو دونوں صورتوں میں انسانیت حقیقی ترقی حاصل نہیں کرسکتی، کیونکہ اس طرح انسان دباؤ اور بے چینی کا شکار ہونے کے علاوہ زندگی کے اصل مقصد سے منحرف ہو جائے گا۔

انسان حقیقی ترقی اسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ مختلف مطالبات اور متضاد میلانات میں ہم آہنگی پیدا کرلے، جسمانی بندھنوں اور روح کی آفاقیت میں توازن پیدا کرلے اور اپنی دنیا کے محدود ماحول اور وسیع تر کائنات کی لامتناہی بیکرانیوں میں ربط قائم کرلے۔ زندگی کے متضاد

Marfat.com

میلانات کے درمیان ربط و ہم آہنگی ہی دراصل انسانی زندگی کی رفعت و ترقی ہے۔ اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ ربط و ہم آہنگی کوئی آسان کام ہے، بلکہ اس ربط و ہم آہنگی کے لیے مسلسل و پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اور اس راستے میں ہر ممکن مشقت اٹھانا لازمی ہے تاکہ ان مشقتوں کے سہنے اور ان صعوبتوں کے برداشت کرنے کے بعد انسان رفعت و امتیاز کا شعور اور عظمت حاصل کر سکے اور اس مسرت سے ہمکنار ہو سکے کہ وہ جبلّی ضروریات پر بھی کچھ دیر کے لیے قدرت رکھتا ہے اور اسے یہ خوشی حاصل ہو سکے کہ وہ عظیم تر کائنات اور عظیم تر وجود سے وابستہ ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی، کدورتوں اور مشقتوں سے پاک نہیں ہو سکتی اور جسمانی خواہشوں کو مکمل آزادی دینے سے بھی انسان کو ایسی خوشی حاصل نہیں ہوتی جس میں کوئی پریشانی اور تردد نہ ہو، بلکہ فی الواقع ہوتا یہ ہے کہ جس قدر زیادہ جسمانی لذتوں کی تکمیل کی جاتی ہے اسی قدر آتشِ شوق اور بھڑکتی ہے اور اس قدر بھڑکتی ہے کہ انسانی جسم تھک جاتا اور اعصاب پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ ...... بلاشبہ یہ ایک معمولی سا نقصان ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس قدر انسان ترقی کر جائے گا اسی قدر اس کی خوش بختی اور بدبختی کا معیار بھی بلند ہوتا جائے گا۔ اگر انسان پستیوں میں گر جائے اور انحطاط کے بالکل نچلے گڑھے میں جا گرے تو وہ جانوروں کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، اور صرف چند معمولی اور حقیر اشیاء سے محروم رہے گا۔ مگر یہی انسان، جب انسانیت کے آفاقِ بلند تک پہنچ جاتا ہے تو اسے زندگی اور زندہ لوگوں میں پھیلے ہوئے شر کو مٹانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر کہیں جا کر اس راستے میں فتح و کامرانی کی لذت و انبساط سے ہم کنار ہوتا ہے۔ گویا خوش بختی حاصل کرنے کے لیے کچھ لذتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے اور کچھ تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں تو پھر یہی کیا

Marfat.com

ضروری ہے کہ ہم معمولی سی محرومی کے بدلے ارزاں اور بے قیمت سی خوشی حاصل کریں ؟ اور کیوں نہ ہم عظیم ترین سعادت اور خوش بختی کے حصول کے لیے زیادہ قربانیاں دیں اور زیادہ جان کھپائیں ؟

فرائڈ کی نظر میں جنس کی اہمیت

جنس کے موضوع پر گفتگو کے دوران فرائڈ پر گفتگو لازمی ہے۔ کیونکہ اس کی تمام تر توجہ پورے مبالغے اور شدت کے ساتھ اسی مسئلے پر مرکوز ہے۔ اس نے اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے "نظریۂ جنس پر مقالات ثلاثہ" (Three Contributions to the Sexual Theory)۔ اس مخصوص تصنیف کے علاوہ اس کی باقی دیگر کتب بھی اسی موضوع کے گرد گھومتی ہیں۔ کیونکہ اس کی نظر میں جنس ہی زندگی کا اصل محور ہے اور انسانی جذبات و میلانات کی تمام لہریں اسی سرچشمۂ حیات سے پھوٹتی ہیں۔ جذبات و میلانات تو ایک طرف رہے وہ تو ہر انسانی حرکت کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے حتیٰ کہ اس کے نزدیک بچے کی حرکاتِ طفلانہ اسی تند و تیز جذبے کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب وہ دودھ پیتا ہے تو اس میں لذت جنس ہوتی ہے اور جب وہ اپنی ماں سے لپٹتا ہے تو یہ لپٹنا جنسی میلان کے تحت ہوتا ہے (کوئی پوچھے کیا لڑکی بھی اپنی ماں کی جانب اسی قسم کا میلان رکھتی ہے ؟) اور جب وہ انگوٹھا چوستا ہے تو اس میں بھی اسی محرک کا دخل ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے جسمانی اعضاء کو حرکت دیتا ہے تو اس میں بھی یہی جذبہ شامل ہوتا ہے —— مگر اس کے ان تمام اوہام پر کوئی دلیل نہیں ہے سوائے ان شاذ حالات (Abnormal Cases) کے جو اس نے اپنی زندگی میں مطالعہ کیے ہیں۔ اور ہم اس کتاب کے ابتدائی باب میں ابنارمل حالتوں میں غلط طرز استدلال پر گفتگو کر چکے ہیں۔

Marfat.com

فرائڈ کے یہاں تہذیب و تمدن کا سرچشمہ بھی جنسی جبلت (Sexual Instinct) ہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ اس جبلت کی بناء پر مرد و زن کا ملاپ ہوتا ہے اور نسلِ انسانی آگے بڑھ کر معاشروں کی صورت میں ڈھلتی ہے اور اس طرح اس کی ضروریات میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور انسانیت ترقی کرتی ہے۔ کیونکہ یہ بات تو بالکل معقول ہے اور فرائڈ جیسے عظیم عبقری کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی عام اور معمولی باتیں کرے بلکہ اس کی عبقریت اور اس کے نادرۂ روزگار شخصیت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یہ کہے کہ "انسانیت اولی نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تاکہ اپنی ماں پر غلبہ و قدرت حاصل کر سکیں، اور اس طرح ان کے جنسی دباؤ کی تسکین ہو سکے، مگر باپ کے قتل کرنے کے بعد اندیشہ یہ ہوا کہ ماں پر کسی ایک کے غلبہ حاصل کرنے کے لیے ایک خونی جنگ ناگزیر ہے۔ اس لیے انھوں نے ماں کے بارے میں اپنے احساسات کو کچل ڈالا اور احساسات کے اس طرح کچل دینے ہی سے تہذیب و تمدن پیدا ہوئے"۔

"جنسی کشاکش میں پھنس کر باپ کو قتل کر دینے کے جرم سے مذہب نے جنم لیا۔ کیونکہ انھیں اپنے اس بُرے کام کا احساس ہوا تو وہ اس حرکت پر شرمسار ہوئے اور انھوں نے اپنے والد کی یادگار کو مقدس بنا کر اس کا ایک حیوانی مجسمہ تیار کیا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ پھر یہ نظریہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا اور انسان آسمانی مذاہب کے نزول سے قبل مختلف خداؤں کی پرستش کرتے رہے۔ اور جب آسمانی مذاہب کا دور آیا تو وہ بھی اس مخصوص ڈگر سے نہیں ہٹے، بلکہ مسیحؑ اپنے باپ کو قتل کر کے خود اس کی جگہ خدا بن بیٹھا، جیسا کہ انسانیت اولی میں بیٹے نے ماں کو حاصل کرنے کے لیے باپ کو قتل کر دیا تھا۔

Marfat.com

غرض فرائڈ نے بڑی زبردستی اور دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے تمام انسانی اعمال کی تعبیر جنسی (Sexual Interpretation of Human Activities) نقطۂ نظر سے کی ہے۔ تاکہ ہر شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے کہ جنسی محرک انسانی زندگی میں بڑی گہرائی رکھتا ہے اور شدید اثرات کا حامل ہے ــــ اور بلاشبہ ایسا ہی ہے کہ انسانی زندگی کا بقا و قیام بغیر جنسی میلانات کے ممکن نہیں ہے۔ یہی جنسی جبلّت تو ہے جس کی وجہ سے خاندان نے جنم لیا ہے، اور اس خاندان کے وجود کے ساتھ تمام مادرانہ اور پدرانہ شفقت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ اولاد کی خاطر ہی باپ کو فکر معاش کے لیے باہر نکلنا پڑا ہے۔ اور کش مکش اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے جذبوں نے ذرائع پیداوار کو بہتر بنایا ہے اور علم و سائنس نے ترقی کی ہے۔

جنسی جبلّت سے ہی جمالیاتی فن پیدا ہوئے ہیں جن کی ابتدا م فی الواقع ایک جنس کے دوسری جنس کی جانب میلان اور اشتیاق وصال کی بنیاد ہی پر ہوتی ہے۔ پھر جمالیاتی احساسات نے ترقی کرنی شروع کی اور ترقی کر کے تمام وسیع و عریض کائنات پر چھا گئے اور اپنے اصل سرچشمے سے دُور ہو گئے۔ اگرچہ تعلق اس سے اب بھی قائم ہے۔

ہر جنس چونکہ جنس مخالف کو پسند کرتی ہے تو اس پسندیدگی کے اظہار کے لیے متنوع خیالات پیدا ہوئے اور مختلف اعمال وجود میں آئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مردوں نے اپنی طاقت و قدرت کا مظاہرہ کیا اور عورتوں نے اپنے حسن و جمال اور گھر کی حسن کاری پر اپنی قوتیں صرف کیں اور اپنی ان صلاحیتوں کا برملا اظہار کیا۔ گویا دونوں صنفوں میں جنس بھرپور زندگی کا ایک فعال محرک ہے۔

Marfat.com

بہرحال یہ تو حقیقت ہے کہ مرد و زن کی زندگی میں ایسا کوئی امر نہیں ہے جس میں جنس کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ بلاشبہ زندگی کے ہر مسئلے میں جنس کا دخل ضرور ہے، مگر تمام انسانی زندگی کی تعبیر جنسی کر دینا ایک سنگین غلطی اور ایک طفلانہ حرکت ہے۔ اور فرائڈ نے عظیم عبقری ہونے کے باوجود اسی سنگین اور فاش غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اس نے مکمل انسانی زندگی کی تعبیر جنسی محرکات سے کر ڈالی ہے۔

مَرد و زَن کے درمیان جنسی فرق

قوت جنسی کے بارے میں مندرجہ بالا امُور کی وضاحت سے یہ حقیقت متاثر نہیں ہونی چاہیے کہ بنیادی اصل میں، اتحاد کے باوجود مرد و زن کے احساس جنس کی طبیعت اور مزاج مختلف ہے۔ مرد و زن میں سے ہر ایک زندگی میں ایک مقرر و مخصوص کردار کی انجام دہی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے جسم کی ساخت اور اس کے تصورات و افکار اس نہج پر ڈھالے گئے ہیں جو اس کے مخصوص کردار کی انجام دہی میں معاون بن سکیں۔

چونکہ مرد کی جسمانی اور اعصابی ساخت ایسی رکھی گئی ہے جس سے وہ حصولِ رزق کی جدوجہد میں شریک ہونے کے قابل بن سکے، اس لیے اس میں اپنی ذات کا احساس اور غلبے اور قدرت کے حصول کی خواہش بھی زیادہ ہے، اور اس کے جسم اور ذہن پر جنس اس قدر محیط نہیں ہے جس قدر کہ عورت کے جسم اور ذہن پر جنس چھائی رہتی ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے مرد کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ زیادہ طویل وقت کشمکش معاش میں صَرف کر سکے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مرد اگر چاہے تو جنس کے بندھن سے آزاد ہو جائے..... کیونکہ اگر ایسا ہوا تو مقاصدِ حیات کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ جب کہ تقاضائے زندگی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقاصد حیات کی تکمیل ہوتی رہے۔ بلکہ اس کا

Marfat.com

مفہوم یہ ہے کہ مرد کچھ وقت کے لیے جنس کے مسائل سے کنارہ کش ہو کر زندگی کے ایسے دیگر پہلوؤں پر بھی توجہ دے سکے جو براہِ راست جنس سے مربوط نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں متضاد مقاصد میں ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے جنسی جذبات کو ایک ایسے سیلِ بے کراں اور ایک ایسی تند برقی رَو کی حیثیت دی گئی ہے، جو یکایک آتی ہے اور آ کر فوراً گزر جانا چاہتی ہے —— تاکہ پھر دوبارہ آسکے —— اور اسی اثناء میں مرد بقائے حیات کے میدانِ عمل میں سرگرم ہو جاتا ہے۔

عورت کا احساسِ جنس اس قسم کا نہیں ہے بلکہ وہ یکایک گزر جانیوالی تیز برقی رَو کا اس وقت احساس کرتی ہے جب عمل فطری کے وقت وقتی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صنف نازک کا احساسِ جنس بڑا گہرا اور بڑا مکمل ہوتا ہے۔ اور اس قدر ہمہ گیر ہوتا ہے کہ اس سے گریز ممکن نہیں ہوتا، حتیٰ کہ عورت حمل، وضع حمل اور دودھ پلانے کی مشقتیں سہتی ہے مگر اس سے گریز نہیں کرتی۔ مرد کی طرح عورت کا احساس جنس صرف جنسی نشاط پر مرکوز نہیں ہوتا، بلکہ جہاں جنسی استفراغ پر مرد کے یہاں سارا معاملہ ختم ہو جاتا ہے عورت کے یہاں اس استفراغ پر مسئلے کی ابتدا ہوتی ہے اور حمل، ولادت، رضاعت اور تربیت اور دیگر امور شروع ہو جاتے ہیں جو عورت کے یہاں اصل احساسِ جنس کا ایک حصہ ہیں۔

خود جسم انسانی کی طبیعت مرد و زن کے اس فطری فرق کی جانب اشارہ کرتی ہے، جہاں مرد میں جنسی خواہش ایک مخصوص دائرے میں محدود ہے وہاں عورت کے احساس میں اس قدر مرکزیت نہیں ہے، بلکہ مختلف درجوں میں عورت کا تمام جسم جنسی احساس کا مرکز بنتا ہے، خود عمل فطرت کے دوران عورت جسم کے ہر حصہ میں شدید حساسیت محسوس کرتی ہے۔

Marfat.com

کارکردگی اور مقاصد کے اختلاف کا لازمی تقاضا ہی یہی ہے کہ مرد و زن کی طبیعتیں مختلف ہوں تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے ان بنیادی مطالبات کی تکمیل کر سکے جن کی تکمیل کے لیے فطرت نے تمام ممکن سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے مناسب حالات پیدا کر دیے ہیں۔

دونوں صنفوں میں مساوات کا مسئلہ

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ دونوں صنفوں میں بالکلیہ مساوات کیوں کر ہو سکتی ہے؟ جہاں تک انسانی بنیادوں پر مساوات کا تعلق ہے تو یہ مطالبہ معقول اور درست ہے۔ کیونکہ مرد و زن دونوں ہی انسانیت کے دو بازو ہیں، یا مشہور داستان (Myth) کے مطابق دونوں ایک سیب کے دو حصے ہیں۔ مگر جہاں زندگی کے اعمال اور طریقہ ہائے زندگی کا تعلق ہے تو اس میں کس طرح مساوات ہو سکتی ہے؟ خواہ اس کے لیے ساری دنیا کی خواتین جمع ہو جائیں، کانفرنسیں منعقد کریں اور قراردادیں پاس کریں۔ کانفرنسوں سے اور کانفرنسوں میں پاس شدہ قراردادوں سے اشیاء کی طبیعتیں نہیں بدل سکتیں اور نہ مرد حمل، ولادت اور رضاعت میں عورت کا شریک بن سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی وظیفۂ حیات بغیر مخصوص نفسیاتی اور جسمانی ساخت کے سرانجام دیدیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دونوں صنفوں میں سے ایک صنف حمل و ولادت جیسے امور کے لیے مخصوص ہو مگر اس واقعہ عظیم کا سامنا کرنے کے لیے اور اس کی تمام ذمے داریوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس صنف کے ایسے مخصوص میلانات و جذبات اور افکار نہ ہوں جن کی افزائش خاص اسی مقصد کے لیے کی گئی ہو۔

مامتا، مامتا کے پاکیزہ جذبات، مامتا کے بلند اعمال، مامتا کا پرورشِ اولاد کی مشقتوں پر صبر پیہم اور فرائض کی ادائیگی اور بروقت تکمیل کا لامتناہی اشتیاق

Marfat.com

ان تمام اُمور کی اساس صنفِ نازک کی نفسیاتی، اعصابی اور ذہنی ساخت اور وہ جسمانی ترکیب ہے جسے خاص حمل اور رضاعت کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ ان تمام اُمور میں سے ہر امر دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور اس سے اس طرح پیوست رہتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک جذبہ دوسرے کے بغیر پایا جائے تو شذوذ (Abnormality) شمار ہو۔

میلانات کی نرمی اور لطافت، وجدان کی سرعت اور انفعال اور احساسات کی تندی و تیزی، جذباتی پہلو کو ہمہ وقت مستعد و سرگرم رکھتی ہے اور فکری پہلو کے بجائے جذباتی پہلو یکلخت بیدار ہو جاتا ہے۔ اور فرائض مادری کا تقاضا بھی دراصل یہی ہے کیونکہ بچپن کے مطالبات اور تقاضے اس فکر کے محتاج نہیں ہوتے جس میں سُرعت و تاخیر دونوں کا امکان ہوتا ہے اور جو کبھی ان تقاضوں پر لبیک کہتی ہے اور کبھی نہیں کہتی۔ بلکہ یہ تقاضے ایسی بھرپور جذباتی لہر کے محتاج ہیں جس میں سوچ کا کوئی دخل نہ ہو اور جو بلا کسی تاخیر کے ان تقاضوں کی تکمیل پہ مجبور کر دے۔ بہر حال صنفِ نازک کے لیے یہی صورت بہتر ہے کہ وہ اپنے اصلی وظیفۂ زندگی کی تکمیل کرلے اور اپنے مقصدِ حیات کو پورا کرے۔ جیسا کہ مرد کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے اس مقررہ وظیفۂ زندگی کو انجام دیتا رہے جس کے لیے اسے تیار کیا گیا ہے۔

مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ گھر سے باہر کارزارِ حیات میں منہمک رہے خواہ جنگلوں میں وحشی جانوروں سے نبرد آزما ہونا ہو، یا کائنات کی طبعی قوتوں کا سامنا ہو، یا حکومت اور اقتصادی قوانین سے نمٹنا ہو ــــــ یہ سب مراحل مرد کو صرف اس لیے پورے کرنے ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی روزی حاصل کر سکے اور اپنی ذات کو، اپنی بیوی کو اور اپنے بچوں کو تحفظ فراہم کر سکے۔۔ مرد کے اس وظیفۂ زندگی کے لیے یہ بات مفید نہیں ہے کہ

Marfat.com

جذبات اس کے صدور و ظہور کا مرکز ہوں کیونکہ جذبات تو لحظہ بلحظہ بدلتے رہتے ہیں، اور وہ بہت کم وقت کے لیے ایک مقصد پر ٹھیرتے ہیں تاآنکہ کوئی دوسرا مقصد سامنے آجاتا ہے تو وہ اس جانب متوجہ ہوجاتے ہیں۔ جذبات کی یہ صورت نو بہ نو بدلتے ہوئے مادری تقاضوں کے لیے تو مفید ہے مگر یہ کسی ایسے مجوزہ پروگرام کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے جس کے نفاذ کے لیے طویل وقت تک ایک ہی نہج پر ثابت قدمی سے جما رہنا پڑے۔ بلکہ ایسے پروگرام کے لیے سوچ اور فکر ہی مناسب ہے۔ کیونکہ سوچ اور فکر کے ساتھ تدبیر کی جاسکتی ہے، مقدمات ترتیب دیے جاسکتے ہیں اور نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ عملِ تفکیر کا ظہور تند و تیز جذبات کی بہ نسبت ایک تاخیری عمل ہے، مگر یہاں جلدی مقصود ہی نہیں ہے بلکہ یہاں تو احتمالات و نتائج کا اندازہ کرنا ہے اور مقررہ ہدف (Target) کے حصول کے لیے بہتر اسباب کا اختیار کرنا ہے۔ شکار کرنا ہو یا کسی مشین کا ایجاد کرنا، کوئی اقتصادی پروگرام تیار کرنا ہو یا نظام حکومت وضع کرنا، جنگ کی آگ بھڑکانا ہو یا امن و آشتی کی تدبیر کرنا —— یہ تمام ایسے امور ہیں جو جذبات سے بگڑتے اور سوچ اور فکر سے سنورتے ہیں —— اس لیے مرد ہی اپنی صحیح ساخت کے مطابق ان امور کی انجام دہی کے لیے مناسب ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے مرد و عورت کے مابین اختلاف کی اچھی خاصی وضاحت ہوجاتی ہے اور اس بیان سے یہ علم ہو جاتا ہے کہ مرد اپنے کام میں کیوں کر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کام کے لیے بیشتر وقت و توجہ صرف کرتا ہے، جبکہ وہ دنیائے جذبات میں بچوں کی طرح ڈانواں ڈول رہتا ہے، اس کے برعکس عورت مرد کی جانب اپنے جذباتی تعلق میں ثابت قدم رہتی ہے اور اس قدر ثابت قدم رہتی ہے گویا اس نے تمام حالات کا اندازہ کرکے کوئی لائحہ عمل

Marfat.com

مرتب کر لیا ہو اور پوری طرح اپنے اس مجوزہ پروگرام پر چل پڑی ہو۔ اس معاملے میں اس کی نظر بڑی گہری اور دُور رس ہوتی ہے۔ وہ بعید ترین مقاصد کے لیے بھی خاکہ تیار کر لیتی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے پیہم سرگرم عمل رہتی ہے۔ جبکہ وہ عملی زندگی میں مستقل مزاج ثابت نہیں ہوتی، سوائے اس صورت کے کہ اس کا پیشہ ہی اس کی طبیعت کے مناسب ہو، جیسے نرسنگ، تدریس اور آیاگیری۔ عورت جب کسی تجارتی مرکز میں کام کرتی ہے تو اس وقت بھی وہ تلاش شوہر کرتی ہے اور اس طرح اپنے جذباتی میلان کی تسکین کرتی ہے۔ مگر عورت کے یہ تمام اعمال شوہر، خاندان، گھر اور اولاد سے متعلق اصلی اعمال نہیں ہیں بلکہ ان کا بدل ہیں۔ اور جب بھی ان اصل اعمال کی انجام دہی کا عورت کو موقعہ ملتا ہے وہ فوراً اپنے ان اعمال کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے سوائے اس کے کہ اس کی شدید مالی ضروریات اسے پیشہ ورانہ زندگی جاری رکھنے پر مجبور کر دیں۔

اس ساری گفتگو کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ دونوں صنفوں میں کوئی قطعی حد فاصل قائم ہے اور دونوں میں ایک دوسرے کے اعمال سرانجام دینے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی۔

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ حمل کے ابتدائی چند ہفتوں میں جنین کی کوئی جنس متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے اعضاء میں بیک وقت تذکیر و تانیث ہوتی ہے۔ پھر تیسرے مہینے میں جا کر جنس کا تعین ہوتا ہے، اور کسی ایک صنف کے اعضاء نشو و نما پا جاتے ہیں اور دوسری صنف کے اعضاء ابتدائی حالت میں رہ جاتے ہیں مگر ختم نہیں ہوتے اور اس طرح ہر صنف میں دوسری صنف کے اعضاء بھی باقی رہتے ہیں۔ یہ بھی سائنس کا بیان ہے کہ دونوں صنفوں میں ازدواجی ہارمون (Harmone) ملے جلے ہوتے ہیں۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ کسی ایک صنف کے ہارمون غالب آجاتے

Marfat.com

ہیں اور اس غلبے کی نسبت سے اس کی تذکیر اور تانیث کا تعین ہو جاتا ہے۔
جب بڑھاپا آتا ہے تو ھارمون کمزور پڑ جاتے ہیں اور یا ایک دوسرے پر غالب آنے لگتے ہیں، جس کے نتیجے میں عورت کی آواز میں درشتی اور مرد کی آواز میں کمزوری آجاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مختلف نسبتوں کے ساتھ دونوں اصناف باہم دگر مربوط اور ملی جلی ہیں۔ اگر ایک عورت ایک اچھی حکمراں بن سکتی ہے، ایک بہترین جج ثابت ہو سکتی ہے اور بو جھل کام کرنے اور میدان حرب و ضرب میں نبرد آزما ہونے کی اہل ثابت ہو سکتی ہے اور اگر ایک مرد ایک اچھا باورچی بن سکتا ہے ایک اچھا گھریلو منتظم ثابت ہو سکتا ہے، بچوں کی بہترین نگہداشت کر سکتا ہے مادری شفقت و نرمی کا حامل ہو سکتا ہے اور لمحہ بلمحہ بدلتے ہوئے جذبات کا شیدائی ہو سکتا ہے تو یہ سب کچھ بالکل فطری ہے اور دونوں اصناف کے ربطِ باہم کا ایک صحیح نتیجہ ہے۔ بلا شبہ یہ ایک حقیقت تو ضرور ہے مگر اس حقیقت میں اس دعوے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس دعوے کے پرچارک بے قید مغرب اور پراگندہ مشرق کے کچھ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔

اصل میں اس مسئلے کو اس صورت سے دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ تمام اعمال جنھیں عورت اپنے فطری فرائض کے علاوہ سرانجام دیتی ہے، عورت کو اس کے اصل وظیفۂ زندگی سے بے نیاز کر دیتے ہیں؟ کیا یہ اعمال عورت کو اپنا گھر بسانے، اپنی اولاد کی پرورش کرنے اور اپنے شوہر کی خوشنودی ڈھونڈنے سے بے پروا کر دیتے ہیں؟ اور کیا اسے اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس کے گھر میں بہرحال ایک مرد ضرور ہو؟ اور کیا اسے جنسی خواہش اور جسمانی بھوک باقی نہیں رہتی؟

دونوں صنفوں میں ہم آہنگی

دونوں اصناف میں مندرجہ بالا طبعی اور فطری اختلاف کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

مساوات انسانی بھی بہر حال ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ دونوں صنفوں کی تخلیق ایک طرح ہوئی ہے اور دونوں کی اصل ایک ہے۔ ہم نے اس حقیقت کو اس کتاب کے باب "اسلام کا نقطۂ نظر" میں بیان کر دیا ہے۔ اور بتا دیا ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ نہ تو وہ فرشتہ ہے اور نہ شیطان۔ البتہ اگر وہ روحانی رفعتیں حاصل کرلے تو وہ فرشتوں جیسا پاکباز بھی بن سکتا ہے اور اگر برائیوں کی پستیوں میں گر جائے تو اس حد تک بھی گر سکتا ہے کہ شیطانِ مجسم بن جائے۔

دونوں اصناف کی ایک دوسرے پر برتری کے بارے میں جو مضامین اور مکالمے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں، میری نظر میں ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے وہ بالکل ایسے ہی ہیں جیسے بچوں کی کتابوں میں "ریل گاڑی اور ہوائی جہاز" کے درمیان مکالمہ ہوا کرتا ہے۔

میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ دونوں اصناف میں سے ہر ایک کی کچھ بلند ترین خوبیاں ہیں اور کچھ کمزوریاں اور گراوٹیں بھی موجود ہیں۔ وہ مرد جو اپنی پوری زندگی غور و فکر اور تأمل میں کھپا دیتا ہے وہ دنیا کے فریبِ حسن میں زیادہ دیر نہیں اُلجھتا، اور جب تک کوئی مفاد پیشِ نظر نہ ہو وہ اپنی سرگرم جدوجہد سے ایک لحظہ غافل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بلا امتیاز انسانیت کے مفاد کے لیے کام کرتا رہتا ہے ...... جس انسانیت سے اسے محبت ہے اور جو ہر کینہ اور حسد سے پاک ہے اور جو ایک مکمل اور جامع محبت ہے ...... ان بلندیوں تک عورت یقیناً نہیں پہنچ سکتی[1]! اور وہ مرد جو جنس کی پستیوں میں گر کر درندہ بن جاتا

---

[1] میں نے جب پہلے ایڈیشن میں یہ بات تحریر کی تھی اس وقت میرے ذہن میں انبیاء کرام، (جو سب مرد ہیں) مصلحین (Reformers) اور کسی فکر و نظریے کے لیے جد و جہد کرنے والے مجاہدین تھے۔ مگر پھر بعد میں عورتوں میں بھی چند ممتاز و مشہور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

ہے، اس کی بہیمیت کی آگ کسی طرح سرد نہیں پڑتی اور وہ ایک شکار کے بعد دوسرے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے .... یہ پستیوں کا وہ مقام ہے کہ اس پستی تک عورت نہیں اتر سکتی۔

وہ عورت جو اپنے آپ کو اپنے شوہر، اپنی اولاد اور اپنے گھر کی محبت کے لیے وقف کر دیتی ہے، اور اس محبت کو عبادت کا درجہ دے دیتی ہے' اور اس محبت کی خاطر اپنی ذات کو اور اپنی انا کو اس طرح فراموش کر دیتی ہے' جیسے اس کے وجود کے ذرہ ذرہ میں بے پناہ طاقت سما گئی ہو اور وہ اس ساری طاقت کو اپنے پیاروں کی خوشنودی میں صرف کر دینا چاہتی ہو' (یہ وہ بلندی ہے جس تک مرد کی رسائی نہیں ہو سکتی) ـــــ اور وہ عورت جس میں دوسری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خواتین کے نام ذہن میں آئے جیسے اسماء بنت ابی بکرؓ، مادام کوری اور جان آف آرک۔ اور ان کے علاوہ دیگر خواتین جنھوں نے کسی نظریے کو اپنا کر اس کے فروغ کے لیے جدوجہد کی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں دو حقیقتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ عورت شکست و ہزیمت کے ساتھ طویل جدوجہد پر صبر نہیں کر سکتی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ عورت ایسی جدوجہد کو بھی جاری نہیں رکھ سکتی جس کے نتائج خود اس کی اپنی زندگی میں ظاہر نہ ہو سکتے ہوں۔ جب کہ مردوں میں ایسے بے شمار مجاہدین ملیں گے جو بار بار کی شکست اور پے در پے ہزیمت کے باوجود اسی عزم و ہمت کے ساتھ حصولِ مقصد میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح مرد اس نظریے کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہتے ہیں جس کے بارے میں انھیں بالیقین معلوم ہے کہ وہ ان کی اپنی زندگی میں روبہ عمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مردوں میں اور خواتین میں یہ بڑے اہم فرق ہیں جن کو مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔

Marfat.com

عورت سے اس قدر جلن اور رقابت پیدا ہو جائے کہ وہ ناخنوں سے اس کا جسم لہولہان کر دے اور اس کے بچوں کو مار ڈالے ...... یہ عورت کی وہ پستی اور گراوٹ ہے جس میں ایک مستقیم (Normal) مرد نہیں گر سکتا۔

ان پستیوں اور ان بلندیوں کے درمیان بہت سے مقامات ہیں جن میں مرد و زن رنگ رنگ کی پاکیزگیوں اور ناپسندیدہ گراوٹوں میں اپنے اپنے طریقے کے مطابق اور اپنے اپنے میدان میں باہم مل جاتے ہیں۔ زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ دونوں اصناف میں سے ہر ایک کا فراز دوسرے کے نشیب سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے، جیسے یہ نشیب باقاعدہ اسی لیے رکھا گیا ہو کہ اس میں دوسری صنف کا فراز ہم آہنگ ہو کے اور اس میں فٹ آسکے۔ اگر ایک طرف خلا ہے تو دوسری جانب اسی قدر ابھار ہے۔ اور اگر اس جانب ابھار ہے تو دوسری طرف اس کے مطابق خلا ہے ـــ دونوں صنفوں کے اس طرح ہم آہنگ ہونے سے دونوں میں اس قدر ربط باہم، تعلق اور محبت پیدا ہو جاتی ہے جیسے دونوں مل کر ایک مخلوق بن گئے ہوں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں جزء باہم پیوست نہیں ہو پاتے، جس کا مطلب یہی ہے کہ ان کا ایک دوسرے کا انتخاب غلط ہوا ہے اور دونوں اپنے اپنے اصل جوڑے کو حاصل نہیں کر سکے۔ مکمل نفرت و بیزاری بہت کم ہوتی ہے کیونکہ انسانیت میں اس قدر لچک ہوتی ہے جس سے تمام نشیب و فراز ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اور ممکنہ حد تک دونوں صنفوں میں ارتباط پیدا ہو جاتا ہے۔

مرد و زن کی مستقیم فطرت

مجھے یقین ہے کہ دونوں صنفوں میں نشیب و فراز کے تقابل کی اساس پر توافق و ہم آہنگی پائی جاتی ہے تاکہ دونوں مخالف صنفوں میں مکمل امتزاج پیدا ہو جائے مگر میں دونوں صنفوں کی مکمل مماثلت کا قطعاً قائل نہیں ہوں

Marfat.com

مرد و زن کی مکمل مماثلت کا دعویٰ جہاں غلط ہے وہاں یہ دعویٰ جسمانی، نفسیاتی، حیاتیاتی اور عضویاتی ناواقفیت پر بھی مبنی ہے۔ اس مماثلت سے دونوں صنفوں میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے بجائے ان میں ہر صنف کی بعض اُبھاروں کا دوسری صنف کے اُبھاروں سے مسلسل ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ کوئی بھی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ بالکل اپنے جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزارے اور کوئی بھی عورت اس بات کو پسند نہیں کرے گی کہ اپنی طبیعت کے مشابہ عورت کے ساتھ رہے، جس میں خود وہی کمزوریاں ہوں جو اس میں ہیں اور بعینہ وہی خوبیاں ہوں جو پہلی میں ہیں، یہ نہ ہو کہ ایک کی کمی دوسری کی زیادتی سے پوری ہوتی رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دونوں پیروں میں دائیں یا بائیں پیر کا جوتا پہن لے، کچھ دیر اس تکلیف کو برداشت کر کے لنگڑاتا ہوا چلے مگر بالآخر تنگ آجائے اور اسے نکال پھینکے۔

عورت و مرد کے تعلق کی اساس کشمکش و قتال نہیں ہے کہ ہر ایک ان میں سے زندگی بھر دوسرے کے مقابلے کے لیے ہتھیار تیز کرتا رہے۔ اور اگر کسی خیالی کشمکش کا تصور کیا جائے، تو وہ ان دو مسلح لشکروں کی کش مکش نہیں ہوگی جو ایک دوسرے کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسی کش مکش ہوگی جس کے انجام پر غور کر کے اور اس کش مکش کی حقیقت معلوم کر کے وہ اپنے ہتھیار رکھ دیتے ہیں اور آگے بڑھ کر مد مقابل کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔

مرد و زن کی اس کش مکش میں مماثلت نہیں ہے، بلکہ تطابق ہے اس طرح کہ اگر مرد عورت پر اپنے جسم، اپنی عقل اور اشتراکیوں کے بقول، اپنی کمائی سے غلبہ پاتا ہے تو عورت اس پر اپنے حسنِ دلفریب سے اور اپنے ناز و انداز سے فتح حاصل کر لیتی ہے۔

مرد و زن کی مستقیم فطرت یہی ہے اور اسی میں دونوں صنفوں کی

Marfat.com

تمام تر بھلائی پنہاں ہے۔ اگر عورت اس کش مکش میں اپنے ہتھیاروں کو نظرانداز کر کے مرد کے ہتھیاروں سے مسلح ہو جائے تو یہ کش مکش ایک حقیقی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی اور اس جنگ میں دونوں ہی صنفوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور محبت، نرمی اور مہربانی اس جنگ کی نذر ہو جائیں گے اور جب محبت مٹ جائے گی تو صرف پتھر کے دل، سُتے ہوئے چہرے اور نامرادیاں اور ناکامیاں باقی رہ جائیں گی۔

اس بات سے انکار نہیں ہے کہ عورت تاریخ کے تمام اَدوار میں مظلوم و بےکس رہی ہے اور اسے مردوں کی جانب سے یہی طعنہ ملا ہے کہ وہ صرف بچے جن سکتی ہے مگر اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتی ...... میری نظر میں تو یہ سوچ انسانیت کی گراوٹ ہے اور ایسی پستی ہے جس میں گر جانا انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اس مسئلے کا حل یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ عورت جدوجہد کے میدان میں نکل کھڑی ہو اور حصول معاش کی تگ و دَو میں لگ جائے ...... مغربی سماج میں عورت کی اس روش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عورت اپنی خوشی سے مرد کی بھڑکتی ہوئی حیوانی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اور امریکی معاشرے میں — جہاں مکمل اقتصادی مساوات ہے — یہ حالت ہو گئی ہے کہ عورت مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے اور جنگل کے شکار کی طرح اس کے تعاقب میں لگی رہتی ہے۔

کیا عالمِ نسواں کے لیے اسی اعزاز و اکرام کا مطالبہ ہے؟ اور یہی وہ 'آزادیٔ نسواں' اور 'استقلالِ عورت' ہے جس کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں؟ مَیں انسانیت کی اس پستی کا دفاع نہیں کرتا، جس میں گر کر انسانیت نے عورت کو یہ طعنہ دیا کہ وہ اپنی معاشی کفالت میں مرد کی دستِ نگر ہے۔

Marfat.com

مگر اس صورت حال کی بھی مدافعت کون کرے گا؟ آج عورت نے جن ممالک میں معاشی استقلال حاصل کر لیا ہے وہاں اس کا مقام باندیوں اور غلاموں کے برابر ہو گیا ہے ؟

میری نظر میں اس مسئلے کا حل تربیت ہے۔ ہر ماں اپنے بچے کو تربیت دے کہ وہ کشمکش حیات اور جہدِ زندگانی کا ذمے دار ہے اور یہ اسی کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لیے کما کر لائے اور ان پر خرچ کرے۔ اور یہ امور اس کے فرائض میں شامل ہیں اور ان کی انجام دہی کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ عورت کو حقیر جانے اور اسے کمتر سمجھے ——— اگر ہر ماں اپنے بچے کی اسی انداز پر تربیت کرتی رہے تو اس مسئلے کا صحیح حل سامنے آجاتا ہے۔ ایسا صحیح حل جو معاشی مساوات سے اور حقوق و فرائض کی قانونی مساوات سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قانون تو صرف ان امور کی تنفیذ کرتا ہے جو ضمیر انسانی میں راسخ نہ ہوں ——— بلاشبہ یہ ایک دیر طلب حل ہے اور اس میں وہ شور و غوغا نہیں ہے جس کی آزادئ نسواں کی تحریکیں، جماعتیں اور مجلسیں شوقین ہیں۔ مگر اس بے کیفی اور خاموشی کے باوجود یقیناً یہ ایک صحیح اور نتیجہ خیز حل ہے۔

جنس اور اخلاق

دونوں صنفوں کا ایک دوسرے کی جانب میلان و التفات طبعی اور فطری ہے۔ اس سلسلے میں انسانیت کے لیے لازمی ہے کہ وہ دونوں صنفوں کے فطری ملاپ کا ان دونوں طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ منتخب کر لے، یا تو تمام عورتیں تمام مردوں کے لیے برابر سرابر جائز کر دی جائیں، یا پھر ایک عورت کے لیے ایک مرد ہو[1]۔

---

[1] ماہرین اجتماعیات، مرد و زن کے ربطِ باہم کی پانچ صورتیں بتاتے ہیں:

Marfat.com

اسلام نے بالخصوص اور تمام آسمانی مذاہب نے بالعموم دوسری صورت کو اختیار کیا ہے، جبکہ تہذیب کا متوالا مغرب پہلی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے —— اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کون سی صورت انسانیت کے لیے زیادہ مفید اور اس کی فطرت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز اہلِ مغرب سے کرتے ہیں، اور اس موضوع پر خالص نفسیاتی بحث کرتے ہیں، کیونکہ اخلاقی طرز بحث مغرب کے ماہرین نفسیات کو سخت ناپسند ہے، اور وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انسان کے بارے میں بحث کے دَوران اخلاق کو بیچ میں گھسیٹا جائے۔

ان کی نظر میں اخلاق، انسانیت کے تاریک ماضی کا ایک بھاری بوجھ ہے جسے انسانیت غیر شعوری طور پر اور محض اندھی تقلید اور جمود کی بنیاد پر اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلی آرہی ہے۔ مگر اب مغرب نے اپنے شانے جھٹک کر اخلاق کے بوجھ اور روایات کے گٹھڑ کو اٹھا پھینکا ہے۔ درحقیقت اخلاق اور روایات انسانیت کے زمانۂ طفولیت اور عہدِ پسماندگی کے لیے موزوں تھیں ..... اس وقت کا انسان طیاروں میں بیٹھ کر مہینوں کی مسافتیں گھنٹوں میں طے نہیں کیا کرتا تھا اور نہ اس وقت کے انسان کو یہ طاقت حاصل ہوئی تھی کہ وہ چند گھنٹوں میں دنیا کے کشت زار کو جہنم کدہ بنا دے۔ اس وقت کا بے چارہ انسان عزت کے مسئلے پر پھر جایا

---

(۴) ۱۔ جنسی اشتراکیت　　　۲۔ کثیر شوئی اور کثیر زوجگی

۳۔ ایک بیوی اور کثیر شوئی　　　۴۔ ایک شوہر اور کثرت ازواج

۵۔ ایک بیوی اور ایک شوہر

یہاں پر ہم نے دو نمایاں صورتوں کو بیان کیا ہے، جنسی اشتراکیت اور ایک بیوی اور ایک شوہر والی صورت۔

Marfat.com

کرتا تھا اور کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ درندگی، وحشت و بربریت سے اس کی عزت پر ٹوٹ پڑے اور اسے لوٹ لے جائے۔ اس وقت کا انسان بہت ہی سیدھا اور ناسمجھ تھا، اسے یہی پتہ نہیں تھا کہ انسان کی جنسی قوت ایک خالص حیاتیاتی مسئلہ (Biological Problem) ہے اور اس کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت کے انسان کو علم ہی نہیں تھا کہ انسان کے لیے بھی جنس کا ایسا ہی درجہ ہے جیسا کہ تمام حیوانات کے لیے ہے۔ اس مسئلے میں بلا وجہ مصنوعی قیود لگا کر اپنے آپ کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرنے سے کیا فائدہ؟...... واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ دور تھا جب ہم منافق تھے، ہم اپنے دل سے اور اپنے ذہن کے اعتبار سے گناہ گار تھے مگر سماج میں ہمیں شریف سمجھا تھا، کیونکہ ہم جسمانی طور پر گندگی میں ملوث نہیں ہوئے تھے...... اب جبکہ حقائق کے چہرے سے نقاب گر چکی ہے تو ہمیں اپنے جسم، اپنی روح اور اپنے قلب سے گندگیوں اور نجاستوں کے جوہڑ میں کود پڑنا چاہیے تاکہ ہم اپنی اصل اور خالص حیوانی طبیعت پر آجائیں اور ہم پر نفاق کی تہمت باقی نہ رہے۔

بہر کیف اب انسان ان بندھنوں سے اور ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہو گیا ہے اور اس کی روح —— اگر فی الواقع روح کا کوئی وجود ہے —— قابل نفرت تاریک ماضی سے نجات حاصل کر چکی ہے۔ اب اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہمارے نفس میں جس قدر شوق اور ولولے ہیں ہم ان کا برملا اظہار کر دیں۔ ہر نر اپنی مادہ کا اشتیاق ظاہر کرے اور ہر مادہ اپنے نر کی تلاش میں نکل کھڑی ہو۔ فی الواقع انسان کی تخلیق بھی اسی طرح ہے کہ دونوں صنفیں ایک دوسرے میں رغبت رکھیں اور فی الحقیقت طبیعت نے انسانی وجود میں ایک ایسا کیمیائی عمل رکھ دیا ہے جس کی بناء پر ہر صنف دوسری صنف کے اشتیاقِ ملاقات پر مجبور ہے۔ یہ کیمیائی عمل ہے

Marfat.com

جس سے جاہل و پس ماندہ لوگ نا آشنا ہیں اور جس میں اخلاق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ یہ صنفی اشتیاق تو کسی قسم کے جذبات کا بھی حامل نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کیمیائی عمل کے نتیجے میں لازمی طور پر کچھ افکار جنم لیتے ہیں، جن کے بارے میں علم حیاتیات سے نابلد اور تجربی نفسیات سے ناآشنا لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان جذبات کی بھی کوئی اپنی قیمت ہے، یا یہ جذبات قابل احترام و وقعت ہیں، یا ان جذبات کی بنیاد پر کچھ اشخاص کو دوسرے بعض اشخاص پر برتری دی جا سکتی ہے۔

جب ایک حیوان اپنی مادہ پر جھپٹتا ہے، کیا اس کے پاس کوئی اخلاق ہوتا ہے؟ کیا اس کے اس عمل میں جذبات کا کوئی دخل ہوتا ہے؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مخصوص معاملے میں فلاں جانور فلاں سے بہتر ہے؟ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان بھی تو حیوان ہی ہے۔ تو اگر انسان کی شہوانی قوت کی آگ اس کے جسم میں سُلگ اُٹھے تو اسے کیوں تردّد ہو؟ اور وہ کیوں مصنوعی شرم و حیا کے جال میں پھنس کر اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دے؟ آخر کیوں؟ حیوانات جو تمہارے اسلاف ہیں کیا انھیں کوئی ایسا تردد لاحق ہوتا ہے؟ آؤ! اے انسانو آؤ! تم بھی حیوانات کی طرح اپنی مادہ تلاش کرو۔ اور اگر مرد سبقت نہ کرے تو پھر اے سرگرم و پرجوش امریکی خاتون، تو ہی اس مرد کے جمود کی سل توڑ ڈال اور آگے بڑھ کر اس کی دنیائے آرزو کو جگا دے۔ پھر تم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر نکل کھڑے ہو یا اگر سڑکوں پر چلنے والوں سے تمھاری لطف اندوزی میں کوئی رُکاوٹ محسوس ہوتی ہو تو پھر تم پارکوں اور درختوں کے کنجوں میں چلے جاؤ، یا ساحل سمندر کی طرف نکل جاؤ۔ تمھارے آباؤ اجداد بھی اسی طرح آزاد ویرانوں میں گھوما کرتے تھے، تم بھی ان کی طرح آزاد ہو جاؤ اور انسانیت کے ناگوار اور بوجھل بندھن اُتار پھینکو۔ تم جو چاہو کرو کسی کو

Marfat.com

تم پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم تا آخر لحظہ تمہارے ساتھ ہیں تاکہ تمہاری حرکات کا مشاہدہ کریں۔

مغرب کی جنسی اباحیّت

مسیحی تعلیمات انتہائی سخت تھیں، ان پر عمل کرنا بے حد دشوار تھا، ان تعلیمات سے نہ صرف فطری میلانات دباؤ (Repression) کا شکار ہوتے تھے بلکہ انسان خیر اور بھلائی کے کاموں کی جانب پیش قدمی میں بھی اپنے پاؤں بوجھل محسوس کیا کرتا تھا۔ اہلِ مغرب جس وقت ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اباحیت مطلقہ کی روش زشت پر گامزن ہوئے، شاید اس وقت ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے لیے انتہائی پیچیدہ اور سنگین مسئلہ جنس کا حقیقی حل اباحیت اور بے قیدی ہے۔ اور جس قدر دنیائے مغرب، تہذیبِ مادی میں ترقی حاصل کرتی جائے گی اسی قدر اس کے لیے اباحیت اور بے قیدی ناگزیر ہوتی جائے گی۔

اس تصورِ خام پر مغرب کی ایک نسل تربیت پا کر تیار ہوئی۔ اس نسل کا طرۂ امتیاز ہی یہ تھا کہ اس نے بھرپور آزادی کو شعار بنا کر فطری جذبات و میلانات پر سے دباؤ (Repression) کو ختم کر دیا تھا۔ اور نوجوان نسل بے پرواہ اور بے فکر ہو کر جسمانی خواہشوں اور لذتوں کے حصول میں منہمک ہو گئی، اُسے کسی نگران کا کوئی خطرہ نہ رہا اور اسے ضمیر، سماج، ریاست اور مذہب کا کوئی ڈر باقی نہیں رہا۔

دنیا آس لگا کر بیٹھ گئی کہ اس اباحیت مطلقہ سے بھوکی جبلّت کی تسکین ہو جائے گی، جسمانی آتشِ شوق سرد ہو جائے گی اور بالآخر ایک ایسا سماجی ڈھانچہ تشکیل پا جائے گا جس میں تمام امورِ زندگانی سنور جائیں گے۔ کیا ایسا ہوا ہے؟

Marfat.com

پروپیگنڈے کو نظر انداز کر کے نفس الامری صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ان دعوؤں میں کہاں تک صداقت موجود ہے۔ سب سے پہلے ہم امریکہ کا جائزہ لیتے ہیں جو اباحیت مطلقہ میں سائنسی اور تجرباتی بنیادوں پر آگے بڑھا ہے، جس نے مسائل زندگی اور بالخصوص مسئلہ جنس پر اعداد و شمار کے ڈھیر لگا دیے ہیں اور جو مشرق کے پراگندہ ذہن اور پراگندہ فکر لوگوں کی کج نگاہی کا مرکز نظارہ ہے [1]

اس نسل کے تمام عوام اور خواص نے یہ سمجھ لیا ہے کہ بے قید آزادیٔ عمل سے جبلت کی تسکین ہو جاتی ہے، اور ان لوگوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ جبلت کی بالکلیہ تسکین نہیں ہو سکتی خواہ اس کی تسکین کے کتنے ہی سامان کیوں نہ فراہم کیے جائیں۔ بہر حال کسی نہ کسی بلند تر حکمت کی خاطر جبلتوں کی یہ فطرت بنائی گئی ہے کہ ان کی بھوک کبھی نہیں مٹتی، کیونکہ اگر کثرت 'غذا' سے ان کی بھوک مٹ جائے تو ان کا عمل ہی ختم ہو جائے اور گردش حیات کا پہیہ جام ہو کر رہ جائے۔ اگر لوگ ایک مرتبہ خوب کھا کر سیر ہو جائیں اور اس کے بعد کھانا چھوڑ دیں تو ان کے جسم کمزور و بے کار ہو جائیں۔ اسی طرح اگر انسان بھرپور جنسی تسکین کے بعد عمل جنس سے باز آجائیں تو نسل ہی منقطع ہو جائے۔

غرض یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہم زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ فطری ہیجانات بار بار سر اٹھاتے رہیں اور ہر مرتبہ ان کی تکمیل کی جاتی رہے۔

---

[1] یہ بات پہلے ایڈیشن میں لکھی گئی تھی۔ اب تو مشرق اسلامی میں وہ دور بھی گزر چکا ہے جس میں ان کا قبلہ واشنگٹن سے تبدیل ہو کر ماسکو ہو گیا تھا۔ مگر ان دونوں قبلوں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔

Marfat.com

اس حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ بھوک پوری زندگی پر محیط اور چھائی ہوئی نہیں ہے۔ اس طرح کہ اس بھوک کا رفع کرنا ہی دشوار ہو جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو زندگی ایک جہنم بن جاتی اور انسان کے پاس اتنا وقت و فرصت باقی نہ رہتی کہ وہ اس جسمانی بھوک کے سامان فراہم کرنے کے لیے مناسب تیاریاں کرتا اور پھر ان ہیجانات کی تسکین کرتا۔

گویا زندگی دو قسم کے لمحات میں تقسیم ہے۔ کچھ لمحات بھوک کے ہیں کہ ان میں جسمانی تسکین کی جاتی ہے، اور کچھ لمحات سیر ہو جانے کے ہیں کہ ان میں پھر دوسرے وقت کی غذا تیار کی جاتی ہے۔

یہ انسانیت اولیٰ کے اس وقت کے بنیادی تقاضے تھے جب وہ بالکل ابتدائی حالت میں حیوانات سے مشابہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ مگر چونکہ قانون ارتقاء کے مطابق انسانیت اس ابتدائی حالت پر برقرار نہیں رہ سکتی تھی، اور اس میں وسائل کو بہتر بنانے کا فطری جذبہ بھی موجود تھا اور پھر انسانی ارتقاء کے لیے اس کی گزشتہ نسلوں کی بہ نسبت جو عظیم ترمیمات ہوتی رہیں، انھوں نے انسان کو عقل بخشی، قوت گویائی دی اور چلنے اور سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کی طاقت دی، تو ان سب ارتقائی انقلابات کے جہاں انسان کے خارجی وجود اور انسانی زندگی میں عظیم ترین اثرات رونما ہوئے وہاں نفس انسانی میں بھی انتہائی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ انسان ضرورت کے دباؤ سے قدرے مرتفع ہو اور انسانی جبلت کے دباؤ کو دور کرنے والے وسائل کو بہتر بنائے۔ اس تحسین وسائل سے کچھ مشاعر اور کچھ میلانات پیدا ہوئے جن کا اصل سرچشمہ تو اگرچہ جبلت ہی ہے مگر تحسین وسائل کے بعد وہ زیادہ قابل قبول اور بلند ہو گئے۔ اس کے بعد ان مشاعر و میلانات سے مختلف فنون نے جنم لیا اور مجموعی طور پر تہذیب انسانی نے پرورش پائی۔

Marfat.com

حیوانی لذّت اور نفسیاتی نشاط

بہر کیف ہم اپنی گفتگو تھوڑی دیر کے لیے خالص جسمانی جبلت اور اس سے منسلک احساسات و مشاعر پر مرکوز کرتے ہیں۔

عملی تجربے سے ثابت ہے کہ کثرتِ غذا سے جبلّت کی تسکین نہیں ہوتی، بلکہ بھوک اور زیادہ چمک اٹھتی ہے، اگرچہ تمام نظریاتی فلسفوں کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے مگر ہم اس قول کے اثبات کے دلائل امریکی زندگی میں تلاش کرتے ہیں۔

اگر جنسی عمل کی آزادی کے اطمینان اور اس مقصد کے انتہائی سہل الحصول ہو جانے سے جبلت کی تسکین ہو سکتی اور اس کی آتش فروزاں مدھم پڑ سکتی تو ہمیں وہ ہولناک مظاہر نظر نہ آتے جو سخت محرومی اور انتہائی گرسنگی کی صورت میں نظر آیا کرتے ہیں۔

جنہوں نے امریکی زندگی کا قریب سے جائزہ لیا ہے اور امریکی لوگوں میں گھل مل کر ان کے بارے میں واقفیت حاصل کی ہے وہ بتاتے ہیں کہ وہاں نوجوان مرد و زن جب باہم ملتے ہیں تو وہ ابتدائی کلماتِ محبت بھی ادا نہیں کرتے، جو جانور بھی جسمانی ملاقات سے قبل کورٹ شپ کے طور پر کرتے ہیں، بلکہ جب وہ ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہیں ان کی آنکھوں میں چمک اور کھلم کھلا دعوت ہوتی ہے اور ان کی تمام حرکات زبانِ حال سے یہی پکارتی ہیں "آؤ" بس جلدی سے آخری عمل تک پہنچ جائیں۔

گویا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اباحیت مطلقہ اس جبلت کو مہذب بنانے میں ناکام رہی ہے ___ مگر وہ خود اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ "ہم لوگ بڑی جلدی میں ہوتے ہیں، ہمارے پاس اس قدر فالتو وقت نہیں ہوتا کہ ہم اسے کورٹ شپ میں ضائع کریں۔ ہم تو عملی لوگ ہیں، اس لیے بلاتاخیر مقصد تک پہنچ جاتے ہیں؟..... ہو سکتا ہے کچھ بھکے

Marfat.com

ہوئے لوگ اس بکواس سے بھی متاثر ہو جائیں جن کے پس پردہ حیوانی سرکشی کارفرما ہے جو اتنا بھی صبر نہیں کرتی کہ چھیڑ چھاڑ اور ملاعبت سے ایک دوسرے کو نفسیاتی نشاط کے لیے تیار کر لیا جائے۔

پھر یہ کہ جلدی کیا ہے؟ اور ایسی کیا مصروفیت ہے جس میں چند لمحے وہ حیوانی لذت کے ساتھ نفسیاتی نشاط کے لیے نہیں نکال سکتے؟ نائٹ کلبوں میں جوا کھیل کر تو ساری رات گزار دیتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں اور وحشیانہ مقابلے دیکھتے ہیں...... ان سب تفریحات کے لیے ان کے پاس وقت ہوتا ہے مگر ان کے پاس چند لمحے نفسیاتی نشاط کے نہیں ہوتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی سرکش حیوانیت کی اس اباحیت مطلقہ سے تسکین نہیں ہوتی۔

باوجودیکہ مندرجہ بالا بیان ہمارے قول پر واضح دلیل ہے مگر ہم صرف اسی دلیل پر اکتفا نہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عریاں اور برہنہ تصاویر جن سے سینما، رسالے، اخبارات اٹے پڑے ہیں اور جو سڑکوں، گھروں اور کلبوں میں ہر جگہ لٹکی ہوتی ہیں ـــــ ان برہنہ تصاویر کی جانب امریکی نوجوان اس شیفتگی اور وارفتگی سے کیوں لپکتے ہیں؟ مشرق میں اگر ایسا ہو تو وہ قابل فہم ہے کہ مشرق کے بے چارے محروم لوگوں کو جو چیز عملاً میسر نہیں ہے وہ اس کے تصور سے خوش ہو لیتے ہیں۔ مگر امریکی لوگ تو تشنہ نہیں ہیں۔ پھر یہ کیوں عریاں تصاویر دیکھنے میں اس قدر وقت صرف کرتے ہیں؟ یہی نہیں کہ تصویریں اتفاقاً سامنے آجاتی ہیں بلکہ یہ ان عریاں تصاویر کے دیکھنے کے لیے ان کے مخصوص ٹھکانوں پر جاتے ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے پروجیکٹروں کی مدد سے ایک وقت میں ایک ہی منظر دکھایا جاتا ہے، جس طرح ہمارے یہاں بچوں کو مناظر دکھانے کے لیے لوگ صندوق سا لیے پھرتے ہیں، اور بچے اس کے شیشوں سے آنکھیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح

Marfat.com

امریکی ان چھوٹے پروجیکٹروں پر آنکھیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس میں عریاں مناظر دیکھتے ہیں — یہی نہیں بلکہ رقاصاؤں اور ایکٹرسوں کی نیم عریاں اور ہیجان انگیز تصاویر کے البم ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں — اور یہ البم وہ قوم خریدتی ہے جو جنسی محرومی اور نامرادی کا شکار نہیں ہے — اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ جنسی آزادی سے جذبۂ جنس سرد نہیں پڑا اور نہ یہ جذبہ مہذب ہوا بلکہ آتشِ شوق اور بھڑک اٹھی اور مجنونانہ بے راہ روی کا رجحان اور بڑھ گیا[1]

---

[1] امریکہ اور فرانس، جہاں مکمل جنسی آزادی حاصل ہے، وہاں ایک بات اور بھی بہت زیادہ نمایاں ہے، اور وہ ہے جنسی کجروی (Sexual Perversion)۔ یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ سماج میں ہر قسم کی جنسی آ[illegible] حاصل ہو اور فطری ملاپ پر کوئی قدغن نہ ہو پھر بھی لوگوں میں جنسی کجروی پیدا ہو جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مکمل جنسی آزادی خود جنسی کجروی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

Marfat.com

عقلِ اجتماعی اور خاندان

اب اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے رکھیے۔ ہم اخلاق کو درمیان میں نہیں لاتے بلکہ ہم صرف خاندان پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ خاندان مرد و زن دونوں کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے۔

جدید مغربی تہذیب جن خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے اور اس مادیت محضہ کے نتیجے میں انسانی نفس اور زندگی کی جو ناقص و نامکمل تعبیرات کی گئی ہیں ـــــ جیسے تاریخ کی اقتصادی تعبیر .... (Economical Interpretation of History)، مشاعر کی جسمانی تعبیر..... (Interpretation of Emotions) اور عمل کی جنسی تعبیر...... (Sexual Interpretation of Human Activities) ـــــــ ان سب اُمور نے مل کر انسانیت کی عمارت کو متزلزل کر دیا، اس کی مقدسات میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے اور انسان کی ایک قابلِ نفرت، پست و ذلیل تصویر تیار کر کے انسان کے سامنے رکھ دی۔ نیز ان سب مؤثرات نے مجموعی طور پر خاندان کے تصور کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور افراد خاندان کے درمیان باہمی تعلق و محبت پر تیشہ چلا دیا۔

دورِ جدید کی تاریخ میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) اپنے جلو میں بڑی عظیم الشان اور گوناگوں تبدیلیاں لے کر آیا ہے۔ اس نے عورتوں اور بچوں کو کسبِ معاش پر لگا کر خاندان کی بنیاد پر ایک ضربِ کاری لگائی ہے۔ اسے پراگندہ کر دیا ہے اور اب گھر کی حیثیت ایک ایسی سرائے سے زیادہ نہیں رہی ہے جس کے رہنے والے اپنے دن بھر کے مشاغل سے تھک ہار کر آ کے پناہ لیں، کھائیں، پئیں اور سو جائیں۔ اب لوگ

Marfat.com

جب گھر آتے ہیں تو انھیں انسانی شفقتوں کی جستجو نہیں ہوتی، کیونکہ اب کشمکشِ حیات کے طفیل ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا۔

بجائے اس کے کہ سماج کی ان صورتوں کے بدلنے کی کوشش کی جاتی اور انسانیت کو انسانی شرافت کی اساس پر دوبارہ کسی سیدھے راستے پر لایا جاتا، مغرب اپنی سرکشی اور گمراہی پر جما رہا، مشین کی طاقت اور پیداوار کی افزائش پر بھروسا کرتا رہا اور سماج کی ان بدوضع صورتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اور ان کے وجود کا جواز پیش کرنے کے لیے اور انھیں برقرار رکھنے کے لیے سائنس اور تحقیق و جستجو کے نام پر نت نئے نظریات اختراع کرتا رہا۔

علمائے مغرب نے انسانیت کو ملوث کرنے اور اسے صرف حیوانی لذت اور شیطانی قوت کا غلام ثابت کرنے میں اس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جیسے انھیں کسی بہت زبردست طاقت نے اس کام کے لیے مامور کیا ہو اور وہ اپنی اس خدمت کا معاوضہ پا رہے ہوں۔

ان کے سائنسی نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خاندان ایک ایسا اجتماعی ادارہ ہے جو طبعی محرکات اور انفرادی میلانات سے وجود میں نہیں آتا بلکہ یہ 'عقل اجتماعی' کی تخلیق ہے۔ عقل اجتماعی ہی اسے کنٹرول کرتی ہے اور اس کی تمام تر تبدیلیاں اور ذمے داریاں اسی کے تابع ہوتی ہیں۔

گویا ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سماج کا وجود ان افراد کے وجود سے علیحدہ ہے جن کے اجتماع سے یہ سماج وجود میں آتا ہے اور 'عقل اجتماعی' افراد کے وجود سے ایک جداگانہ شے ہے۔ ان کے خیال میں اس تفریق کی دلیل یہ ہے کہ سماج اکثر و بیشتر افراد کو ایسے امور پر مجبور کرتا ہے جو ان کے میلانات اور فطری خواہشات کے برعکس ہوتے ہیں۔

ہم 'فرد اور معاشرہ' کے باب میں بتا چکے ہیں کہ انسان کے کسی کسی وقت

Marfat.com

اپنے انفرادی میلانات کے برخلاف اجتماعی رُجحان کی جانب جُھک جانے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ سماج، افراد کے وجود سے کوئی علیحدہ اور جُداگانہ شے ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ فرد، اپنے انفرادی میلان پر سماجی رُجحان کو ترجیح دے دیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اس کا وہ مفاد حاصل ہو جاتا ہے جو اسے انفرادی صورت میں میسّر نہیں آسکتا۔

بیان کرنے کا منشاء یہ ہے کہ مندرجہ بالا نظریہ یہ بتلاتا ہے کہ خاندان انسانیت کے اصُولوں میں سے کوئی ثابت شدہ اصُول نہیں ہے کہ اس کے بغیر انسانیت کا وجود خطرے میں پڑ جائے، بلکہ دراصل خاندان، معاشرے کے تصرّف میں ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ چاہے اسے باقی رکھے اور چاہے ختم کر دے۔ کسی کو نہ تو اعتراض کا کوئی حق ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ معاشرے نے غلطی کی ہے اور راستے سے بھٹک گیا ہے۔

اب اگر آج کا جدید معاشرہ تاریخ کے تاریک ترین ادوار کی طرح جنسی انارکی کی طرف لوٹ گیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ معاشرے پر اس کی کیا ذمے داری ہے؟ اگر کوئی ذمے داری ہو سکتی ہے تو وہ صرف افراد پر ہی ہو سکتی ہے۔

خاندان ـــــ دَورِ قدیم کی ایک اِقتصادی ضرُورت؟

ان نظریات میں سب سے اہم اور خطرناک یہ نظریہ ہے کہ خاندان اور خاندان کی ہیئتِ ترکیبی جس طرح تاریخ کے طویل ترین ادوار میں برقرار ہے، یہ انسان کی اقتصادی ضرورت ہے۔ جب مرد ـــــ کاشتکاری کے دَور سے نکل کر ـــــ ذرائع پیداوار کا تن تنہا مالک بن گیا اور عورت اپنی کفالت میں مرد پر اعتماد کرنے لگی تو عورت اس بات پر مجبور ہو گئی کہ مرد کی ظالمانہ انانیت کے سامنے سرنگوں ہو جائے، کیوں کہ مرد چاہتا تھا کہ عورت صرف اسی کی ہو کر رہے اور تمام مردوں کی مشترکہ ملکیت بن کر نہ رہے۔

Marfat.com

پھر چونکہ ذرائع پیداوار پر مرد کا قبضہ تھا اس لیے مرد نے ایسے اُصول و قوانین بنا لیے اور ایسے اخلاقی ضابطے وضع کر لیے جس سے خاندان کے گرد جھوٹے تقدس کی دیوار بن گئی اور اس طرح مرد کو یہ ضمانت حاصل ہو گئی کہ اب اس کی عورت، زندگی بھر اس کی خدمت کرتی رہے گی اور کبھی کسی دوسرے مرد سے کوئی سروکار نہیں رکھے گی۔

اس کے بعد مذہب آیا ـــــ شاید مذہب بھی مرد کی ایجاد ہو ـــــ اس نے عورت کو ایک ہی مرد کے دائرے میں محدود کرنے کے لیے کچھ اور جھوٹی دیواریں کھڑی کر دیں اور عورت کے لیے ان حدود سے باہر قدم رکھنا ممنوع قرار دے دیا۔

مگر چونکہ اب دنیا بدل چکی ہے اور عورت مرد کی قید سے آزاد ہو چکی ہے، کیونکہ اب عورت عملی جدوجہد میں شریک ہو گئی ہے۔ اب وہ دنیائے اقتصاد میں ایک فعال عنصر بن چکی ہے۔ اب وہ مرد کی غلامی سے آزاد ہو چکی ہے۔ اب اس کے پیروں میں خاندان کی وہ بیڑیاں نہیں رہی ہیں، جو مرد نے اپنی انانیت کی تسکین کے لیے ڈالی تھیں۔ بہرکیف اب وہ آزاد ہے۔ اب وہ ایک مرد کی غلام نہیں ہے جس غلامی کو اس نے اقتصادی مجبوری کے تحت برداشت کیا تھا۔ اب اگر وہ ایک رات ایسے نوجوان کے بازوؤں میں گزارے جو اسے پسند کرتا ہے اور جس کے خیالات پر وہ چھائی ہوئی رہتی ہے اور دوسری شب کسی ایسے مرد کی آغوش میں پہنچ جائے جو سرِ راہ مل گیا تھا، جس کے بازو بہت مضبوط ہیں اور شکل میں تو بالکل "کلارک گیبل" نظر آتا ہے ـــــ تو کسی کو کیا حق ہے کہ اسے روکے اور منع کرے؟ اب دورِ اوّل کی بربریت ختم ہو چکی ہے اب تو عورت خود ہی کمانے لگی ہے اور خود ہی اپنے اخراجات برداشت کرنے لگی ہے۔ اب مذہب، اخلاق اور روایات کے سارے دعوے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اور جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے تو اخلاق تو خود

Marfat.com

ایک اقتصادی مسئلہ ہے۔ ہر اقتصادی نظام اپنے مناسب حال اخلاق وضع کرتا ہے۔ چونکہ اب سرمایہ دار مغرب اور اشتراکی روس میں اقتصادی نظام تبدیل ہو چکا ہے، اس لیے انھوں نے اپنا نیا ضابطۂ اخلاق بھی بنا لیا ہے جو عورت کی اقتصادی آزادی سے ہم آہنگ ہے اور اسے شخصی آزادی اور اثبات ذات (Self Assertion) کے نام پر ہر بے حیائی کی کھلی چھٹی دیتا ہے۔

خاندان اور فطرتِ انسانی

خاندان کے بارے میں اوپر اہم ترین جدید نظریات بیان کر دیئے گئے ہیں جو باہمی اختلاف کے باوجود اس بنیاد پر باہم متفق ہیں کہ خاندان انسانی فطرت نہیں ہے اور نہ کوئی انسانی اصل ہے اور خاندان کا ایک طویل تاریخی دَور تک باقی رہنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ مستقبل میں بھی باقی رہے گا۔ بلکہ اگر اجتماعی اور اقتصادی حالات متقاضی ہوں تو اس کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں اور اس کی جگہ ایک غیر خاندانی سماج وجود میں لے آئیں۔

خاندان کے بارے میں ان نظریات نے اہم ترین سائنٹفک حقائق کو فراموش کر دیا ہے۔ مثلاً یہ حقیقت نظر انداز کر دی ہے کہ خاندان جنسی اور اجتماعی میلان اور اقتصادی ضروریات کے علاوہ انسان کی ایک ایسی نفسیاتی ضرورت بھی ہے جو میلان فطری، عنصر اقتصادی اور سماجی تبدیلیوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے مشاعر و جذبات پر بھی مشتمل ہے جن کا تعلق نہ تو اقتصاد سے ہے اور نہ جبلّت سے۔

صحیح سائنسی نقطۂ نظر وہی ہو سکتا ہے جو انسانی زندگی کے ایک عنصر میں مبالغہ کر کے اس کو دیگر تمام مقومات حیات پر ترجیح نہ دے بلکہ یہ سمجھے کہ زندگی اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ اسے اجتماعی ضرورت یا اقتصادی ضرورت میں منحصر کر دیا جائے، کیونکہ یہ انسان کے بے شمار پہلوؤں میں سے

Marfat.com

صرف چند پہلو ہیں ۔ انسانی زندگی ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل تو ضرور ہے مگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر یا دونوں پر منحصر نہیں ہے ۔ بلکہ انسانی زندگی ان پہلوؤں سے گزر کر ایسے انتہائی وسیع اور مکمل آفاق تک پھیلی ہوئی ہے جو انسانی وجود کے لیے زیادہ موزوں اور زیادہ مناسب ہیں ۔

خاندان بھی انسانی وجود سے ظہور میں آیا ہے ۔ اور جس طرح نفس انسانی سے اُبھرنے والے دیگر اُمور مکمل نفس انسانی کا پرتو اور اس کے جملہ عناصر سے متاثر ہیں ، اسی طرح خاندان بھی مجموعۂ نفس انسانی سے متاثر اور اس کے تمام عناصر کا پرتو ہے ۔ بلاشبہ اقتصادی نظام کی تبدیلی اور سماجی ارتقاء کے ساتھ چلنے والے جنسی میلان کا تغیر ، خاندان کی ساخت اور افراد خاندان کے باہمی روابط پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے ، مگر اصولی لحاظ سے خاندان کی جڑیں ، نفس انسانی میں جسمانی محرکات اور اقتصادی ضروریات سے بہت زیادہ گہری ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد —— مرد ہو یا عورت —— اپنی عمر کے کسی حصے میں محسوس کرے کہ اسے اب خاندان کی ضرورت نہیں رہی ہے ، مگر اس کے نفس کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ایک آرزو ، بالآخر اسے خاندان کی طرف متوجہ کر دے گی ۔ اور اسی منزل پر پہنچ کر اس کے نفس کو حقیقی قرار ملے گا ۔ اور یہی درحقیقت نفس کا مطالبہ ہے اور اس مطالبے کے بغیر انسانی زندگی کا قیام ممکن نہیں ہے ۔

فرد اور خاندان

ذرا اس فرد کو دیکھیے جو خاندان میں رہتا ہے اور اس فرد کو دیکھیے جو بلا خاندان زندگی گزارتا ہے ۔ وہ نوجوان جو قیود اخلاق سے آزاد ہوں ، ان کی اقتصادی ضروریات کی بخوبی تکمیل ہو رہی ہو ، جو خوش و خرم ہوں اور بے پناہ لطف اندوز ہو رہے ہوں اور حیوانات کی طرح جب چاہیں اور جس طرح چاہیں اپنی جسمانی بھوک مٹا رہے ہوں —— یہ نوجوان اس تمام ظاہری خوشی

Marfat.com

اور مسرت کے ساتھ ایک ایسے نفسیاتی اضطراب سے دوچار ہوتے ہیں جو چھپائے نہیں چھپتا۔ کیونکہ لذتوں کے حصول میں مستقل منہمک رہنا ایک ایسی آتشِ شوق کو بھڑکا دیتا ہے جو کبھی سرد نہیں ہوتی اور جو کبھی چین نہیں لینے دیتی۔ جیسے بھیڑیا چیر پھاڑ کرتا پھرتا ہے مگر اس کی تسکین نہیں ہو پاتی اور وہ بے چین و مضطرب پھرتا رہتا ہے حالانکہ وہی غذا ایک پُرسکون اعصاب والی مستقیم مخلوق کے لیے کافی بھی ہے اور نشاط انگیز بھی۔ اور اپنی خواہشوں سے چمٹے رہنا ایک ایسے جنون کی علامت ہے جس میں پھنس کر، خاندانی حدود و قیود کو نظرانداز کر کے، انسان بے قید و آزاد خواہشوں کی تکمیل میں لگ جاتا ہے حالانکہ خاندان دراصل فرد کو اس جنون سے بچائے رکھنے کا ایک طبعی ٹوٹکا ہے۔ خاندان کا پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ یہ مجنونانہ شہوت کے زور کو توڑ دیتا ہے کیونکہ انسان فطرۃً ایسی شے کے بارے میں زیادہ بےچین نہیں ہوتا جو اس کی ملکیت ہو۔ اگر میاں بیوی کو ابتدائی تسکین کے بعد یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ دونوں ہر وقت و ہر گھڑی ایک دوسرے کی دسترس میں ہیں تو پھر سخت شہوت اور مجنونانہ انگیخت باقی نہیں رہے گی۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شادی سے شہوت مرجاتی ہے یا اس میں جمود آجاتا ہے، کیونکہ بقائے نسل انسانی کا تقاضا اور روئے زمین کو آباد رکھنے کا داعیہ یہ ہے کہ شہوت جنسی کبھی سیراب نہ ہو اور پرہیزگار لوگوں کی پرہیزگاری سے اس میں جمود نہ آنے پائے۔ اسی لیے جنسی خواہش میں اس قدر تیزی و تندی رکھی گئی ہے کہ جب تک فرد کی جسمانی صحت اس مقصد کے حصول کے لیے کارآمد رہے اس وقت تک یہ آتشِ شوق سرد نہیں ہوتی، بلکہ جنسی خواہش کے لیے نارمل حالت میں نفسیاتی محرک کی بھی ضرورت نہیں ہے[1] کیونکہ یہ خواہش تو فوراً ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ البتہ

---

[1] اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ جب بے اعتدالی سے جسم میں پژمردگی آجائے تو جسم کو بیدار کرنے والی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ نفس کی پرواز کا ساتھ دے سکے۔

Marfat.com

اس کے لیے ایسے گداز و لطیف امور کی ضرور ضرورت ہے جو اس کی تندی و تیزی میں کسی حد تک کمی کر دیں تاکہ اس کی تیزی اور حدت انسان کے لیے ایسا وبالِ جان نہ بن جائے، جس سے اس کی خوشگوار زندگی مجروح ہو جائے۔ اور شادی سے یہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔

عائلی مصروفیات اور اس کے مطالبات، بالخصوص اولاد اور ان پر توجہ اور ان کی تربیت کی ضرورت — یہ سب ایسے امور ہیں جو نفس کو تند و تیز شہوت سے ہٹا کر ایسی حدِ معقول پر لا کر روک دیتے ہیں، جس پر آ کر نہ جسم تکان محسوس کرتا ہے اور نہ ہی محرومی کا شکار ہوتا ہے۔

خود جنسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی خاندان، خواہش جنسی کا ایک طبعی منتظم ہے — ایسا ادارہ جو فرد کے جسم کو تباہی سے محفوظ رکھتا اور دائمی عذاب سے بچاتا ہے اور ایک نارمل انسان کو جسمانی لذت کا اس قدر وافر حصہ بھی بہم پہنچ جاتا ہے جس سے اس کی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

مغرب میں محبت، جسمانی خواہش کی مظہر ہے

آج کل کے نوجوان نفسیاتی اطمینان و خوشی سے ہمکنار نہیں ہوتے جبکہ خاندان فرد کی جسمانی طور پر ہی تسکین نہیں کرتا بلکہ اسے نفسیاتی اطمینان و مسرت بھی فراہم کرتا ہے۔ مشرق کے خوابوں کی دنیا میں رہنے والے کچھ لوگ اور کچھ اہلِ فن یہ سمجھتے ہیں کہ 'محبت' ہی وہ سرچشمۂ سعادت ہے جس کے بالمقابل زندگی میں کوئی سعادت نہیں ہے۔ وہ اس محبت کی تصویر میں خوب رنگ بھرتے ہیں اور اس تصویر کو ایک سحر انگیز تاثر دے دیتے ہیں۔ بلا شبہ 'محبت' سعادت زندگی ہے مگر اسی وقت جبکہ اپنے رفیق کو خوش آمدید کہنے کے لیے یہ محبت طبعی طور پر نفس انسانی میں پیدا ہو، اور یہ نہ ہو کہ عاشقی ہی محور زندگانی بن جائے —

Marfat.com

بے قید مغرب میں اس قسم کی پاکیزہ، بے لوث اور روحانی محبت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان کے یہاں وہ محبت نہیں پائی جاتی جو انسانیت کے دورِ پاکیزگی اور زمانۂ ارتفاع میں پائی گئی تھی، بلکہ ان کے یہاں محبت صرف جسمانی نشاط اور جبلّی انگیخت کا نام ہے۔ نفسیاتی اور خالص فنی اعتبار سے یہ محبت اس امر کی مقتضی نہیں ہے کہ اس پر توجہ دی جائے —— اس لیے اس محبت کو عالمِ مثال میں نہ دیکھا جائے بلکہ واقعی اور نفس الامری صورت میں اس کا جائزہ لیا جائے۔

وہ محبت جو صرف جسمانی خواہشوں کا مظہر ہے، مغرب کے نوجوان اسی محبت پر فریفتہ ہیں۔ مگر کیا وہ واقعی مطمئن و شاد کام ہیں؟ اور کیا انسان اس طرح مطمئن ہو سکتا ہے کہ وہ طوفانی ہواؤں کے رحم و کرم پر ہو۔ کبھی کوئی اندھیاؤ ادھر اڑا لے گیا اور کبھی کوئی جھونکا ادھر لے گیا؟ صورتِ حال یہ ہے کہ جب ایک طرف کھلم کھلا کوئی فتنہ سامنے آتا ہے، انسان پوری قوت سے اس کا شکار ہو جاتا ہے اور داخلی یا خارجی بچاؤ کی عدم موجودگی میں اس کی جانب لپک پڑتا ہے اور جب دوسری طرف دوسری جانب کوئی اور کشش سامنے آتی ہے تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اس طرف کھچا چلا جاتا ہے، کیونکہ اس میں زیادہ کشش ہے اور تسکین کا وافر سامان ہے۔ غرض مغرب کا انسان ہر روز ایک نئی سمت کی جانب متوجہ ہوتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اس جذباتی ٹھیراؤ اور سکون سے کہاں مستفید ہو سکے گا جو سعادت و خوش بختی کا باعث بنتا ہے؟

کیا وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سعادت و اطمینان اسی پیہم سرگشتگی اور خمار میں ہے، جو تھوڑی دیر کے لیے پُرسکون ہوتا ہے اور پھر دوبارہ بھڑک اٹھتا ہے؟ اور جو روزانہ ایک نئے رُخ پر گامزن ہوتا ہے؟ ہر شخص کو اپنا دل ٹٹولنا چاہیے کہ ہر وہ میلان جو اپنی انتہاء کو نہیں پہنچتا نفس میں

Marfat.com

کس قدر گہرے ڈال دیتا ہے، ہر نفسیاتی تعلق جب منقطع ہوتا ہے تو سوزش قلب پیدا کر جاتا ہے۔ یہ زخم ایسا ہوتا ہے کہ مندمل تو ہو جاتا ہے مگر مٹتا نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جو نفس انسانی سے ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر تعلق اس طرح ختم ہو جاتا اور مٹ جاتا ہے کہ اس کے بعد شعور یا لاشعور میں اس کے مطلقاً کوئی اثرات باقی نہیں رہتے۔ تو جب ہر تعلق کے اثرات نفس انسانی میں باقی رہ جاتے ہیں تو وہ تعلقات تو بہت ہی اثر انگیز ہوں گے جو نفس انسانی میں ایسے زخم ڈال دیتے ہیں جو مسلسل رستے رہتے ہیں۔

اہلِ مغرب تو یہی کہیں گے کہ یہ سب جذباتی مشرق کی اوہام پرستی ہے، جو اپنی قوت متخیلہ سے ٹھوس حقائق میں بھی خیال آمیزی کرتا رہتا ہے۔

مغرب کے نوجوان جوڑے جب آپس میں ملتے ہیں ان کے دلوں میں یہ خیال تک نہیں ہوتا کہ یہ تعلق دائمی ہے۔ وہ چند ساعتوں کے لیے ساتھ ہوتے ہیں، اپنے جذبات کی تسکین کرتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ انھیں اس جدائی پر کوئی افسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے دل رنجیدہ ہوتے ہیں۔

پناہ بخدا، ایسی انسانیت سے جو پستی میں حیوانات سے بھی بڑھ جائے! حیوانات میں بھی محبت ہوتی ہے جو ان کے نر و مادہ کے درمیان تعلقات استوار کرتی ہے اور یہ محبت جسمانی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دیگر فطری عوامل کے زیر اثر حیوانات کے نفوس میں پیدا ہوتی ہے اور باقی رہتی ہے۔ کیا بے قید مغربی معاشرہ اپنے آپ کو کبوتروں، بندروں بلکہ بلوں میں رہنے والے سانپوں کے مقام سے بھی پست کر دینا چاہتا ہے؟ ہر چند کہ میں بے قید و زوال آشنا مغربی سماج کے بارے میں کوئی

Marfat.com

اچھی رائے نہیں رکھتا، مگر پھر بھی میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ سارا مغربی معاشرہ مجموعی لحاظ سے اس قدر جذباتی پستی اور گراوٹ کا شکار ہے۔ اہل مغرب جس نفسیاتی اضطراب اور اعصابی بے چینی کو انگیز کر رہے ہیں، جس طرح حوادثِ خودکشی رونما ہو رہے ہیں اور نفسیاتی ہسپتالوں کی جانب رجوع جس قدر بڑھتا جا رہا ہے —— یہ سب درحقیقت اس غلط و فرسودہ نظامِ مغرب کے نتائج ہیں جو انسانی فطرتِ سلیمہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ اہلِ مغرب جس قدر اپنی اس روش پر تیزی کے ساتھ بڑھتے جائیں گے ان کا اطمینان و سکون ناپید ہوتا جائے گا اور ناقابلِ علاج شدید نفسیاتی اضطرابات رونما ہوتے جائیں گے۔

ہر مرد کو عورت کی ضرورت ہے اور ہر عورت کے لیے مرد ناگزیر ہے۔ صرف اسی لیے نہیں کہ یہ ان دونوں کی جسمانی ضرورت اور جبلّی تقاضا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے شریکِ حیات کے ساتھ رہتے ہوئے الفت و محبت، نرمی و مہربانی جیسے نفسیاتی جذبات محسوس کرتا ہے۔ اور یہ ایسے جذبات ہوتے ہیں جو مرد دوسرے مرد کے ساتھ رہ کر اور ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ اوقات گزار کر حاصل نہیں کر سکتی۔ نیز یہ کہ ان جذبات کا احساس وقتی جوش اور نو بہ نو بدلتی ہوئی صورتوں میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ جذبات اپنی ساخت کے لحاظ سے چاہتے ہیں کہ ان پر کچھ وقت گزرے اور انھیں استقرار حاصل ہو۔ ظاہر ہے اس طرح سرِراہ مل جانے والوں میں محبت کیوں کر ہو سکتی ہے جن کے دوبارہ ملنے کی کوئی توقع نہ ہو؟ اور جو صرف چند گھڑیوں کے لیے ملاقات کریں وہ تقاضائے الفت کیوں کر پورا کریں گے؟

لطیف جذبات اور پُرسکون فضا

نفس کی گہرائیوں سے ابھرنے والے لطیف جذبات کے لیے حد درجہ

Marfat.com

پُرسکون و مستقل فضا درکار ہے۔ اور اگر یہ فضا موجود نہ ہو تو انسان مستقل نفسیاتی بے کیفی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی جسمانی راحت و آرام کے باوجود اور ہر نوع کی اقتصادی آزادی کے باوجود انسان پژمردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

دونوں صنفوں میں سے ہر فرد دوسری صنف کا اشتیاق رکھتا ہے تاکہ اپنے جذبات و افکار اس کی جانب منتقل کر سکے، اپنے رازہائے سربستہ اس کے سامنے کھول سکے، اس کے ساتھ سرگوشیاں کر سکے، نرمی و مہربانی کا سلوک کر سکے اور زندگی کے مقابلے کے لیے اور زندگی کی مشکلات سے نمٹنے کے لیے اس کا تعاون اور مدد حاصل کر سکے۔ ان دونوں محبت کرنے والے اور اُلفت رکھنے والے قلوب کے سامنے جس طرح دنیا وسیع ہو جاتی ہے، اس طرح محبت و نرمی سے محروم قلبِ تنہا کے سامنے وسیع نہیں ہوتی، خواہ وہ کتنے ہی بڑے دل کا مالک کیوں نہ ہو۔ بلکہ جو شخص اس شفاف و لطیف روحانی غذا سے محروم ہو اس کا دل بڑا ہی نہیں ہو سکتا۔

زندگی کی یہ تصویر فن اور آرٹ میں پہنچ کر شعر بن جاتی ہے اور خیال و تصور کی رنگ آمیزیاں اس کو مزید دلکش بنا دیتی ہیں۔ تاہم اگر فن اور آرٹ کو نظر انداز کر کے زندگی کی اس تصویر کو خالص واقعاتی حیثیت میں دیکھا جائے، تو بھی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی صحت کی گواہی زندگی از آغاز تا ایں دم ہمیشہ سے دیتی آ رہی ہے۔

غرض جذباتی ٹھہراؤ بھی مرد و زن کی ایسی نفسیاتی ضرورت ہے جس کی تلافی جسمانی راحتوں اور اقتصادی آزادی سے نہیں ہو سکتی اور جو اس موج بیکراں میں نہیں ٹھہر سکتی جس میں مغرب غوطے کھا رہا ہے۔ اس ٹھہراؤ اور سکون کے لیے یقیناً گھر اور خاندان کی ضرورت ہے۔ جبکہ اہل مغرب اپنے بھٹکے ہوئے دلوں

Marfat.com

اور پراگندہ قلوب کے ساتھ ساری زندگی سڑکوں ہی پر گزار دیتے ہیں۔ ان کے تو شادی شدہ جوڑوں کو بھی قرار و سکون میسر نہیں آتا۔

ان حقائق کے باوجود فریبِ مغرب کا شکار کچھ اہلِ مشرق کہتے ہیں کہ ذرا اہل ترقی اور پیش قدمی کو دیکھیے...... وہاں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک طویل اور مکمل تجربے کے بعد اپنا اپنا ساتھی چنتے ہیں اور اس انتخاب سے قبل وہ اپنے ساتھی کے بارے میں باریک سے باریک باتوں اور پوشیدہ ترین امور تک سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ انھیں ایک دوسرے کی خواہش جنسی کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں ــــ اس لیے ان کی زندگی میں اچانک ہچکولے نہیں آتے اور زندگی کی نیّا بخیر و خوبی ساحلِ اُمید سے جا لگتی ہے۔

کثرت طلاق اور جنسی انارکی

ان بے چارے مغرب کے گرویدہ لوگوں پر تہذیبِ نو نے سحر کر دیا ہے...... یہ نہیں دیکھتے کہ امریکہ میں طلاق کا تناسب دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ مصر سے بھی زیادہ ہے، جہاں ــــ بقول ان کے ــــ ایک پسماندہ قوم بستی ہے جس کا کام ہی شادیاں کرنا اور طلاقیں دینا ہے۔ مگر امریکہ کی بعض ریاستوں میں طلاق کا تناسب چالیس فی صد ہے، جبکہ مصر میں شدید ترین سماجی ابتری کے دَور میں بھی طلاق کا تناسب اس حد تک کبھی نہیں پہنچا ہے...... اس سے زیادہ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات کیا ہو سکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ امریکہ میں طلاق تہذیب و تمدن کی علامت ہے جبکہ مصر میں پس ماندگی اور تہذیب ناآشنا ہونے کی نشانی ہے۔ جی ہاں، درست ہے۔ کیونکہ امریکہ کی طلاق 'ساختہ امریکہ' ہے اس لیے اس کی بناوٹ بڑی بہترین اور مضبوط ہے۔ جبکہ مصر کی طلاق، مصر میں بنی ہے، اس لیے بے کار اور نکمی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ امریکہ میں طلاق ہمارے

Marfat.com

آقاؤں کی طلاق ہے اور مصر میں طلاق ہم جیسے غلاموں کی طلاق ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ میں طلاق کا تناسب اس قدر زیادہ کیوں ہے؟

امریکہ میں کثرت طلاق کا اصل سبب جنسی انارکی ہے۔ جو نوجوان سڑکوں، کلبوں اور پارکوں میں اوقات زندگی گزارنے کے عادی رہے ہوں، ان کے لیے گھر کا پرسکون و منظم ماحول قابلِ قبول نہیں رہتا، بلکہ ایک ایسی ہنگامی تبدیلی ثابت ہوتا ہے جس سے ان کا سکون و راحت لٹ جاتا ہے۔

پھر جو شخص ہر حسن جہاں سوز کے پیچھے لپکنے کا عادی ہو اور جو عورت اپنے میلانات کی پیروی کی عادی ہو، وہ مستقل جداگانہ نوعیت کے نظام میں زندگی نہیں گزار سکتے، بلکہ شوق انھیں نئے سے نئے تجربات اور نَو بہ نَو جذبات کی جانب کھینچے گا۔ یہاں تک کہ جداگانہ اور مستقل گھریلو زندگی خود ایسا المناک حادثہ بن جائے گی، جس کے لیے نفوس پہلے سے تیار نہ ہوں گے۔ اور کچھ وقت گزرنے کے بعد عادت و الفت کے تحت وہ آتش شوق فراواں سرد ہو جائے گی اور وہ پہلا سا ولولہ اور شوق باقی نہیں رہے گا۔ اور اس صورت میں جب کوئی نیا حسن فتنہ پرور سامنے آئے گا تو پھر اس جوڑے میں ہر ایک اس جانب لپکے گا۔ کیونکہ اگر مقصد، صرف لطف اندوز ہونا ہے تو کچھ دیر بعد میاں بیوی دونوں ہی محسوس کریں گے کہ ان کا مزاج باہم متفق نہیں ہے اور ان کی خواہشوں کا مرکز درون خانہ نہیں ہے بلکہ گھر سے باہر ہے۔ نتیجہ یہ کہ طلاق ہو جاتی ہے اور ہر ایک اپنے نئے شکار کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اور اگر جدائی کے سلسلے میں قانونی رکاوٹیں حائل رہتی ہیں تو پھر میاں بیوی دونوں ہی ایک دوسرے کی خیانت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

ہر وہ زندگی جس کا مقصد محض جسمانی آسودگی ہو اس کا انجام بالکل یہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص کو اس کے صنفِ مخالف

Marfat.com

میں اس کی تمام پسندیدہ صفات مل جائیں۔ بلکہ اتفاقاً ایسا دوسرا شخص بھی مل سکتا ہے جس میں کوئی نئی خوبی موجود ہو یا ابتدائی تعارف کی بناء پر اس کی اس صفت میں اثر انگیزی زیادہ ہو۔

زندگی گزارنا ایک عادت ہے..... اگر دونوں صنفوں میں سے کوئی دوسری صنف پر اعتماد کرتے ہوئے اور تنہا اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کی عادت نہ ڈالے اور اپنے جسمانی ارتباط کے ساتھ اپنے نفس اور اپنے احساسات و جذبات میں اس کو شریک نہ کرے تو اسے اس نظام زواج سے کیا خوشی و مسرت حاصل ہو سکتی ہے جس کا مقصد ہی اسی ارتباط کامل کو وجود میں لانا ہے۔

اس کے علاوہ ماضی کے تجربات بھی ہیں۔ اگر شادی سے قبل کے بھی کچھ تجربات ہوں تو یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شادی نے ان تجربات کے آثار بالکل مٹا دیے ہیں، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہر تجربہ ایک گہرا نفسیاتی اثر چھوڑ دیتا ہے خاص طور پر عورت کے نفس میں —— خواہ وہ ظاہری طور پر کتنا ہی فراموش کرنے کی کوشش کرے۔ لاشعور کے یہ مخفی آثار انسانی زندگی کو غیر شعوری طور پر متاثر کرتے ہیں اور اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اگرچہ وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ تمام تر زمانہ حال ہی میں زندگی بسر کر رہا ہے ——

ایسی زندگی کا ماحصل کیا ہو سکتا ہے جس میں ایک انسان جسمانی طور پر تو اپنے شریک زندگی کے ساتھ رہ رہا ہو مگر شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس کے جذبات کی دنیا کہیں اور بسی ہوئی ہو اور وہ ماضی کے اندھیاروں میں اس کی دبیز تہیں کھود کھود کر اپنی کھوئی ہوئی خوشی، اپنے جذبوں کی گرمی اور اپنی حسین یادوں کے کھنڈرات تلاش کرتا رہے؟ اس حیرت کے ساتھ اور بکھرے ہوئے پراگندہ جذبات کے ساتھ انسان کیوں کر خوشی اور مسرت سے ہمکنار ہو سکتا ہے؟

Marfat.com

تصوراتی خیال آرائی کے بجائے واقعاتی تجربے کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ دعویٰ بالکل باطل نظر آتا ہے کہ اباحیت مطلقہ لوگوں کی سعادت اور ان کے اجسام وقلوب کی راحت کا ذریعہ ہے بلکہ تجربے سے اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل مغرب بیرون خانہ جس طرز زندگی کے عادی ہو چکے ہیں، اور جسے وہ قانونی شادیوں یا اس کے بغیر ہی برت رہے ہیں، یہ طرز زندگی اعصاب کے لیے سخت تباہ کن اور نفوس کے لیے مہلک ہے۔

ہو سکتا ہے بعض دانش ور یہ کہیں کہ یہ بات محسوسات اور واقعات کے برخلاف ہے کیونکہ محسوسات اور واقعات تو یہ ہیں کہ مغرب سائنسی علوم، ایجادات، اقتصادیات اور سیاسیات میں بے اندازہ ترقی کر چکا ہے۔ مگر ہم ان دانشوروں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ آج کی انسانیت جس قدر نفسیاتی اور اعصابی امراض سے دوچار ہے اس قدر تو کبھی اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب انسانیت غاروں اور جنگلوں میں زندگی گزار رہی تھی۔

خاندان — بچوں کی ناگزیر ضرورت

مستقل گھریلو زندگی صرف مرد و زن کی نفسیاتی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ ایک مستقل و مستحکم گھریلو زندگی آنے والی نسلوں کو مضبوط بنیادوں پر اٹھانے کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

اس نفسیاتی حقیقت کا اثبات بھی ناگزیر ہے کہ بچوں کی پیدائش کی خواہش ایک ایسی آرزو ہے جس سے انسان آج تک کبھی گریز نہیں کر سکا ہے بلاشبہ آج کل کے نوجوانوں پر ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ اپنی انانیت کی تسکین اور حصول آرام کی خاطر نسل کشی سے گریز اختیار کرتے ہیں، یا اقتصادی مجبوریاں اس گریز پر اکساتی ہیں، مگر جوں ہی دورِ شباب گزرتا ہے اور ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب یہ نوجوان اپنے نفس اور اپنی زندگی میں کھوکھلا پن

Marfat.com

محسوس کرتے ہیں اور اس کھوکھلے پن کا بچوں کی چیخ و پکار کے سوا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اس وقت یہ نوجوان اس امر پر پشیمان ہوتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عمر بے کار ضائع کر دی اور افزائش نسل کی جانب توجہ نہ دی جو آگے چل کر ان کی معاون بنتی اور ہمیشہ کے لیے ان کا نام باقی رکھنے کا سبب بنتی۔

مرد کو تو کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ اور ایسا عمل میسر آجاتا ہے جس میں گم ہو کر وہ ضمیر کی اس آواز کو دبا دیتا ہے مگر عورت کی زندگی بڑی بے کیف و خشک ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بچہ درحقیقت عورت کی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اس بچے کی، عورت اپنے بطن میں پرورش کرتی ہے، پھر اسے اپنا دودھ پلاتی ہے اور اپنے جوہر حیات سے اسے غذا فراہم کرتی ہے۔ اور بچہ عورت کے نفسیاتی وجود کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے کہ بچے کے بغیر عورت اپنے آپ کو ناقص و بے کار خیال کرتی ہے۔

جب انسان کے لیے بچوں کی پیدائش ناگزیر ہے تو اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ان کی تربیت اور نشو و نما کے لیے ایک بہترین گھریلو ماحول بھی فراہم کرے۔ انسان تو انسان، حیوانات بھی اپنے بچوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک انھیں یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ اب ان کے بچے مستقل حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور اب انھیں ان کی ضرورت نہیں رہی ہے۔

انسان کے بچوں کو زیادہ مدت تک کے لیے نگرانی اور تربیت کی ضرورت ہے، کیونکہ حیوانات جس قدر مدارج ترقی طے کرتے جاتے ہیں، ان کی ذمے داریاں بڑھتی جاتی ہیں اور ان کے اعمال میں وسعت و ہمہ گیری آتی جاتی ہے۔ اسی لیے انسان کے بچوں کو ان اعمال اور ذمے داریوں پر زیادہ لمبے عرصے تک تمرین اور مشق کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ حیوانات کی ترقی یافتہ ترین صورت (انسان) تک پہنچ سکیں۔ (اگر اس مفروضے کو

Marfat.com

وقتی طور پر تسلیم کر لیا جائے) اسی لیے انسان کا دورِ طفولیت تمام حیوانات میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ اور جس قدر انسان ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہوتا جاتا ہے اس کے جسمانی، نفسیاتی اور عقلی اعمال میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اعمال و جذبات و افکار کی دنیا میں وسعت آتی جاتی ہے اور اس طرح بچے زیادہ توجہ اور زیادہ دیکھ بھال کے محتاج ہوتے جاتے ہیں۔

گویا تقاضائے تہذیب بھی یہی ہے کہ ہم بچوں کے لیے ایک پُر سکون و مستقل گھریلو ماحول فراہم کریں۔ اور بے قید و اباحیت پسند لوگوں کے خیال کے مطابق تہذیب نوی کے ارتقاء نے اس ضرورت میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ درحقیقت خاندان ہی وہ واحد طبعی جولان گاہ ہے جس میں بچوں کی جسمانی افزائش ہی نہیں بلکہ ان کے میلانات کی تربیت بھی انسانی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔ اور صرف گھریلو ماحول ہی بچوں میں نرمی، محبت، شفقت اور مودت کے جذبات کی آبیاری کر سکتا ہے۔ اور اسی تربیت سے گزر کر آنے والے بچے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جس میں سماجی تعلقات کی کش مکش کے بجائے باہمی تعاون پر ہوتی ہے۔

ہر چند کہ کش مکش، زندگی کے لیے ناگزیر ہے —— کش مکش نہ ہو تو نفس میں کاہلی پیدا ہو جائے اور نفس میں اس طرح سست روی پیدا ہو جائے جیسے اگر جسمانی ورزش نہ کی جائے تو پٹھے سست پڑ جاتے ہیں اور ان میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے —— اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کشمکش حیات ہر حال میں ایک برائی ہے۔ برائی تو یہ اس وقت بنتی ہے جب انسان اس کش مکش میں مبالغہ پر اتر آئے اور اس کے خوب تر مقاصد کو فراموش کر کے کش مکش ہی کو بذات خود مقصد بنا لے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچے کے نفس میں اس کش مکش اور جد و جہد کا کوئی پاکیزہ اور صاف ستھرا مقصد ترقی پا سکے اور اس کے نشوونما کے مختلف مدارج میں دخول

بھی نشوونما پاتا رہے اور بچہ کے پیش نظر ہر وقت یہ بات رہے کہ وہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے لیے مصروف پیکار ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہونے سے یہ فائدہ ہوگا کہ انسان اس پیکار میں حد سے زیادہ نہیں بڑھے گا اور دوسروں کے حقوق پر زیادتی نہیں کرے گا ـــــ جب تک بچوں کی تربیت، محبت و الفت سے بھرپور گھریلو ماحول میں نہ ہوگی اس وقت تک کشمکش حیات میں مبالغے میں کمی نہیں آسکتی۔

نرسری کا نظام تربیت

اہل مغرب تو یہی کہیں گے کہ نرسریوں کے نظام تربیت نے اس فضول قصۂ پارینہ کو بے حقیقت ثابت کر دیا ہے اور یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ صحیح سائنسی بنیادوں پر بچوں کی تربیت کی جا سکے۔ اور ایسی بہترین تربیت کی جا سکے جس تک "ناواقف و ناداں ماں باپ" کی کبھی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ بلکہ نادان و ناواقف ماں باپ نے بچوں کو خراب ہی کیا ہے اور ان کو جسمانی، فکری اور نفسیاتی طور پر بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ مگر جدید نرسری نظام نے ان سب خرابیوں کی اصلاح کر دی اور سماج کو ہر لحاظ سے بہترین تربیت یافتہ بچے فراہم کر دیے۔

یہ ایک اچھی دلچسپ کہانی ہے جسے خوشنما دعووں کی مدد سے ثابت کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ نرسریوں میں بچوں کو مناسب و متوازن غذا فراہم کی جاتی ہے، ان کی صحیح اور لازمی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ہر روز وزن ہوتا ہے اور وزن نوٹ کیا جاتا ہے، روزانہ طبی اصولوں کے مطابق غسل دیا جاتا ہے، ذہنی آزمائشیں ہوتی ہیں، عقلی صلاحیتوں کو صیقل کیا جاتا ہے اور جسم کی نشوونما میں پیدا ہونے والے ہر نقص کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے کر فوری اور مؤثر طریقے پر، نہایت سائنٹفک ذرائع سے اس کا تدارک کیا جاتا ہے ...... یہ سب امور انجام پا جاتے ہیں۔ مگر ان سے

Marfat.com

زیادہ مہتم بالشان یا کم از کم انہی جیسی اہمیت کا حامل اَمر باقی رہ جاتا ہے.....
یعنی بچوں کی نفسیاتی ضروریات کی تکمیل ۔ نرسریوں میں ان ضروریات کی تکمیل ایک اَمرِ محال ہے ۔کیونکہ ان اُمور کی تکمیل صرف ایک صحیح گھریلو ماحول ہی میں ہو سکتی ہے ۔

جو مغربی ماہرینِ نفسیات اس خیال کے حامل ہیں کہ نفس تمام کا تمام جسم کی تخلیق ہے اور جو ماہرین یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مادی حالات ہی احساسات و جذبات کو وجود بخشتے ہیں، انھیں تو ظاہر ہے ان نفسیاتی ضرورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جن کا تعلق جسم سے نہیں ہے یا جن کا تعلق خالص مادی حالات سے نہیں ہے ۔ مگر اس بحث کے آغاز ہی میں ہم بتا چکے ہیں کہ ان ماہرینِ نفسیات نے انسانیت کے بیشتر انتہائی اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے، جس کی بنا پر ان کی تعبیرات ناقص اور گمراہ کن قرار پا گئی ہیں ۔

انا فرائڈ (Anna Freud) نے ایک کتاب (بغیر خاندان کے بچے) لکھی ہے ۔جس میں اس نے بتایا ہے کہ نرسریوں اور بچہ گاہوں میں پرورش پانے والے بچے شدید نفسیاتی نقص کا شکار ہو جاتے ہیں ۔اور اس نقص سے ان کے میلانات میں اضطراب اور ان کے جذبات میں اس قدر انحراف پیدا ہو جاتا ہے کہ کوئی ماہر نفسیات بڑی کوشش کے بعد ہی اس اضطراب اور انحراف کو دُور کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے ۔

بچے کی اپنے والدین کی جانب احتیاج

بچپن کے بالکل ابتدائی دَور میں بچہ ماں باپ کا بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے اور اس وقت وہ یہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ کلیتہً اس کی ملکیت ہیں اور ان میں اس کے علاوہ کسی کی شرکت نہیں ہے اور اگر کوئی اس کی ملکیت میں شریک پیدا ہو جاتا ہے، خواہ وہ اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو

Marfat.com

(اگر اس بھائی کی پیدائش پہلے بچے کے دودھ چھوٹنے کے وقت سے پہلے ہی ہو جائے) تو بچہ پر اس کے شدید اثرات مرتب ہوتے ہیں، جن کا اگر کسی نہ کسی طرح تدارک نہ کیا جائے تو وہ بچے میں اعصابی اور نفسیاتی امراض پیدا کر دیتے ہیں۔

خاندانی نظام کے طفیل ہی بچے کو اس کے ابتدائی دَور میں مکمل طریقے پر ماں باپ میسر آسکتے ہیں۔ اور اس کی اس طرح ملکیت میں ہو سکتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس کا مزاحم نہ ہو۔ جبکہ نرسری میں بچہ کو ماں کا حصہ بچوں کی تعداد کے حساب سے میسر آسکتا ہے کہ اگر بیس بچے ہیں تو مامتا کا بیسواں حصہ اور اگر تیس بچے ہیں تو مامتا کا تیسواں حصہ، اور باپ کا کوئی حصہ نہیں ملتا۔

عام حالات میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بچہ ماں باپ سے یا دونوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جاتا ہے جس سے اس کے نفس میں عدم توازن اور اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بہر حال یہ ایک مجبوری کی صورت ہے اور اس میں کوئی تدارک ممکن نہیں ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ خوشحال گھرانوں میں، نیا بچہ ضروری وقفے سے پہلے ہی پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے بھائی سے ایسے وقت میں مزاحمت کرتا ہے جب وہ مزاحمت پسند نہیں کرتا۔ یہ صورت بہر حال کم ہی پیش آتی ہے اور اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا صورتیں تو کم تعداد میں وجود میں آتی ہیں، زیادہ تعداد میں اور طبعی طور پر ظہور میں آنے والے حالات کے بارے میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ خاندانی نظام بچوں کے لیے حیرت ناک حد تک محکم طریقے پر عادات و اطوار کو ترتیب دیتا ہے۔ دیکھیے، بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے پستانوں میں دودھ تیار پاتا ہے جو یقینی طور پر ایک ایسی مکمل اور طبعی غذا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ پیدائش سے ذرا دیر قبل جب اس دودھ کی

Marfat.com

ضرورت نہیں تھی تو یہ دودھ موجود نہیں تھا، مگر جب اس کی ضرورت رونما ہو گئی تو اس میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ پھر بچے کو پیدا ہوتے ہی ماں کی شفقت و مودت اور محبت مل جاتی ہے۔ جو یقیناً بچے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور جس کی اہمیت دودھ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

باپ کی باری ماں سے ذرا بعد میں آتی ہے اور باپ کو باپتا کا احساس اس طرح نہیں ہوتا جس طرح ماں کو ممتا کا ہوتا ہے۔ کیونکہ بچہ ماں کا ایک نفسیاتی اور روحانی حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کا ایک مادی حصہ بھی ہوتا ہے۔ بلاشبہ بچہ باپ کے مادی جسم کا بھی حصہ ہوتا ہے مگر اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ باپ کے وجود میں سے ایک حصہ اس سے جدا ہوتا ہے یا اس کا خارجی امتداد ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی شے اس کے جسم میں داخل ہو اور وہ اس کو محفوظ کرلے۔ بچہ، باپ کے نفسیاتی اور روحانی وجود کا بھی یقیناً ایک حصہ ہوتا ہے، مگر باپ کے ساتھ یہ عمل کئی مراحل میں پورا ہوتا ہے۔ پہلے تو اپنی نسل کے باقی رہ جانے سے اس کے اندر ایک موہوم سی ہمیشگی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور پھر الفت و صداقت کے ذریعے محبت پیدا ہوتی ہے جو مرد میں میلانات کی اصل بنیاد ہے۔

باپ کا کردار اگرچہ ماں کے کردار کے بہ نسبت ذرا متاخر ہوتا ہے مگر بچے کی نسبت سے اس کردار کی ادائیگی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جس وقت سے بچے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب بچہ کی دنیا ماں کی چھاتی، اور اس کے چہرے کے نقوش، اور سوتے جاگتے اس کے جسم سے چپٹے رہنے کے محور سے ہٹ کر ذرا وسعت اختیار کرتی ہے تو اسے کسی نئے چہرے کی جستجو ہوتی ہے، اس مرحلے پر آکر باپ کا کردار اس کی خارجی دنیا میں وسعت کا باعث بنتا ہے اور اس کے جسم اور نفس

Marfat.com

میں قوت و قدرت کے متنوع پہلو افزائش پانے لگتے ہیں۔

بچہ دو سال کی عمر تک مکمل طور پر ماں باپ سے پیوست رہتا ہے اور والدین کے اس طرح اپنی دسترس میں ہونے پر بڑا کیف و سرور محسوس کرتا ہے کہ والدین غذا کی فراہمی اور لوری دینے سے لے کر، باتیں سکھانے اور چلنا سکھانے تک اس کی تمام ضروریات کی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ بچہ جب والدین کے قریب ہوتا ہے اور ان کو اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے پر کمربستہ پاتا ہے تو اسے نفسیاتی اطمینان اور جذباتی سکون حاصل ہوتا ہے، مگر ان دو سالوں کے دوران بچہ عموماً والدین کی کامل پیوستگی سے چھٹکارا حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ غذا کے باب میں اس کا جسم دودھ کے علاوہ دیگر اشیا قبول کرنے لگتا ہے اور اس کا نظامِ ہضم ان اشیاء کو ہضم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی بچہ ماں باپ کے محور سے ہٹ کر دوسرے اشخاص میں دلچسپیاں تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے اور ان کے ساتھ رَل مِل کر اپنے اجتماعی جذبے کی تسکین کرتا ہے اگرچہ یہ دیگر اشخاص اسے مکمل طور پر ماں باپ سے مستغنی نہیں کر دیتے۔

پھر دودھ چھوٹنے کے دن آتے ہیں جو بچے کے لیے بڑے جاں گسل ہوتے ہیں، مگر بہرحال دودھ چھڑانا ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بعد ماں کا دودھ بچے کی نشوونما کے لیے ناکافی ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا نظامِ ہضم زندگی کے پیش آمدہ حالات کے لیے تیار ہو جائے۔ نفسیاتی فطام (علیحدگی) بھی بچے کے لیے ضروری ہے، ہر چند کہ اس کے بچے پر بڑے شدید اثرات مرتب ہوتے ہیں، مگر اس نفسیاتی علیحدگی کا یہ مقصد نہیں ہے کہ بچے کو ماں باپ کی محبت سے دُور کر دیا جائے اور بچے کو کلیتہً فراموش کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس طرزِ عمل سے زیادہ نقصان دہ بات بچے کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نفسیاتی علیحدگی کا مقصد یہ ہے کہ بچہ کو والدین کی معاونت و شفقت

Marfat.com

کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اپنی ذات پر اعتماد کرنے اور خارجی دنیا پر بھروسا کرنے کی تربیت دی جائے۔ کیونکہ اس تربیت کے بغیر اس میں پختگی پیدا نہ ہوگی اور اس کے جذبات پیش آمدہ زندگی کے لیے تیار نہ ہو سکیں گے۔ بلکہ ایک طویل عرصے تک اس کے جذبات و افکار میں اس قدر بچپنا باقی رہیگا کہ وہ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ جیسا کہ ان لاڈلے بچوں کا حال ہوتا ہے جن کو نفسیاتی علیحدگی کی مناسب وقت پر تربیت نہ دی گئی ہو۔

جب بچہ کی نفسیاتی اور جسمانی علیحدگی مکمل ہو جاتی ہے اور بچہ کسی حد تک والدین سے مستغنی ہو جاتا ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب والدہ طبعی حالات کے مطابق نئے مولود کے لیے تیار ہوتی ہے اور نئے بچے کی پیدائش مناسب وقت پر ہوتی ہے اور اس وقت اسے پہلے بچے کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا (سوائے بہت کم حالات کے) اس صورت میں نومولود، پیدائش کے وقت والدین کو اپنے استقبال کے لیے مستعد پاتا ہے۔ یا کم از کم ابتدائً اسے ماں تو مل جاتی ہے جو اس کی آمد کے لیے پوری طرح تیار ہوتی ہے اور اسے کامل ملکیت کا احساس دلاتی ہے جو اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے اور اس کے حصول کے سوا اس کے پیش نظر اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

پہلے بچے میں نئے مہمان کی آمد پر رشک و حسد کے جذبات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس نئے مہمان نے آکر اس کی مملکت پر قبضہ جما لیا ہوتا ہے۔ مگر پہلے بچے کے اس شعور پر غلبہ پایا جا سکتا ہے اور اسے نرمی کے ساتھ کسی اور جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے یہ احساس دلایا جائے کہ اس نئے واقعے کے ظہور کے باوجود وہ مسلسل مرکز توجہ ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی جائے کہ وہ

Marfat.com

اس ننھے مہمان سے بڑا ہے اس لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور اس کو اس بات کی تربیت دی جائے کہ وہ بڑے ہونے کے ناطے اپنے چھوٹے بھائی سے خوش گوار سلوک کرے۔ تاکہ اس طرح دونوں کے درمیان رشک و حسد کے بجائے الفت و تعاون پیدا ہو۔

لامحالہ، یہ تمام اُمور مستحکم طریقے پر خاندان کے طبعی ماحول ہی میں انجام پا سکتے ہیں۔ نرسریوں میں ان اُمور کی تکمیل محال ہے۔ کیونکہ نرسریوں میں ایک ہی عمر کے بہت سے بچے ہوتے ہیں، جن کی ضروریات یکساں ہوتی ہیں اور ان سب کی 'ماں' بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقی ماں باپ سارا وقت کارخانوں میں برسرکار ہوتے ہیں یا کلبوں اور ریسٹورانوں میں جائز و ناجائز لذت کوشی میں منہمک ہوتے ہیں۔

نرسری نظام تربیت اور اشتراکیت

تمام اقوام عالم میں اشتراکی روس خاندان کا کٹر مخالف اور نرسری نظام کا مؤید ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انفرادی ملکیت کے مسئلے میں فطرت کی بہر طور مخالفت کی جائے۔ چنانچہ روسی کہتے ہیں کہ خاندانی نظام انانیت کے جذبات پیدا کرتا اور ملکیت کی محبت کو ہوا دیتا ہے۔ کیونکہ والدین بچوں کو وارث بنانا چاہتے ہیں۔ اشتراکی نظام چونکہ انفرادی ملکیت کے ختم کرنے کے درپے ہے اس لیے ان جذبات کی مزاحمت ضروری ہے۔ اور ناگزیر ہے کہ جذبۂ ملکیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اسی لیے خاندانی جذبات کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔ اور یہ اقدام بھی ناگزیر ہے کہ بچوں کو حقیقی والدین کے بجائے ریاست کی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس طریقے سے جذبۂ ملکیت بھی کچلا جائے گا اور یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ریاست بچوں کی تربیت پہ نظر رکھ سکے گی اور اسے یہ ضمانت حاصل ہو جائے گی کہ یہ بچے بڑے ہو کر کٹر اشتراکی بنیں گے۔

Marfat.com

مگر اس روش کے دو عظیم نقصانات ہیں۔ پہلا نقصان تو یہ ہے کہ نرسریاں بچوں کی نفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کر سکتیں اور وہ نرمی اور محبت کے جذبات کے بجائے خالص کشمکشِ حیات کی بنیاد پر بچوں کی تربیت کرتی ہیں، جیسے وہ انسان نہ ہوں بے شعور و بے احساس مشینی آلات ہوں۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ جب مرد و زن سے خاندانی جذبات اور بچوں سے متعلق میلانات چھین لیے جاتے ہیں تو ان کے باہمی تعلقات صرف جسمانی اور شہوانی رہ جاتے ہیں۔ جس کے بعد معاہدۂ نکاح کی حقیقت ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہتی۔ اگر بچوں کی نگران ریاست ہے اور شادی ایک جنسی تعلق ہے تو پھر اس تعلق اور دوسرے مختلف تعلقات میں وجہ امتیاز کیا باقی رہ جاتی ہے؟ اور کون سی بات میاں بیوی کو اخلاص و وفا پر مجبور کر سکتی ہے اور اس بات پر آمادہ کر سکتی ہے کہ ان کا باہمی تعلق صرف حیوانی اور جسمانی لذت پر مبنی نہ ہو۔

مگر ان کے کچھ دانش ور ان سب باتوں سے انکار کر کے یہ کہتے ہیں کہ نرسریوں میں تربیت ناگزیر ہے۔ کیونکہ نادان و ناواقف والدین بچوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔ گویا یہ ایک مجبوری ہے جس کو اپنانے پر ایک نسل انسانی مجبور ہو گئی ہے۔ مگر فی الاصل یہ کوئی صحیح و درست نظام نہیں ہے[1]۔

---

[1] اب اشتراکی پروپیگنڈہ باز کہہ رہے ہیں کہ روس میں خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے اور خاندانی روابط مضبوط بنانے کی سعی کی جا رہی ہے خواہ یہ بات درست ہو یا صرف پروپیگنڈہ، مگر یہ اس حقیقت کا اعتراف ضرور ہے کہ نظام اسلامی ہی صحیح نظام ہے۔

Marfat.com

احساساتِ جنس میں فرق و امتیاز

اب ہم اس موضوع پر ایک نئے رُخ سے گفتگو کرتے ہیں ـــــ مگر اخلاق کو ہم یہاں بھی درمیان میں نہیں لائیں گے ـــــ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ تمام اعتبارات کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو جنس ایک ہی ہے، اس کا درجہ اور مقام بھی ایک ہی ہے..... مگر دیکھنا یہ ہے ـــ کہ

ایک، تو وہ تند و تیز خواہش ہے جو سُلگتے ہوئے جسم اور پیاسے اعضاء میں پیدا ہوتی ہے اور ان آنکھوں میں فروکش ہوتی ہے جن سے مجنونانہ جنسیت ٹپکتی ہے۔

ایک وہ نرم و نازک کومل سی آرزوئے نفس ہوتی ہے جو بڑی احتیاط سے پروان چڑھی ہے۔ جس کے لیے رکھ رکھاؤ، ترتیب اور سلیقہ سے تیاری کی گئی ہے تاکہ اس کا اظہار پُرسکون اور نرم و نازک طریقے پر ہو۔

کچھ وہ سُلگتے، جھُلستے اور تپتے ہوئے احساسات ہیں جو جسم کی بھٹی سے اُبلتے ہیں، مگر جب یہ قلب سے ہو کر گزرتے ہیں تو اس کا گدلا پن بہت کچھ چھٹ جاتا ہے اور کسی قدر نرمی اور لطافت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

وہ ہلکے پھلکے سے احساسات بھی ہیں جن کا سرچشمہ تو قلب ہوتا ہے، مگر جب وہ جسم سے وابستہ ہوتے ہیں تو جسمانی حرارت ان میں بھی بہت کچھ حدت اور تپش پیدا کر دیتی ہے۔ مگر بہر حال قلب کی لطافت بھی بہت بڑی حد تک موجود رہتی ہے۔

وہ لطیف و پاکیزہ خیالات بھی ہوتے ہیں جن پر عالم بالا سے روحانی لہریں آتی ہیں اور نورانی کرنیں پرتو فگن ہوتی ہیں۔ یہ خیالات اس قدر پاکیزہ ہوتے ہیں کہ ان میں ذرا سی بھی مادی تلچھٹ نہیں ہوتی اور یہ اس قدر نورانی

Marfat.com

ہوتے ہیں کہ ان کی روشنی ہر بندش سے آزاد ہوتی ہے۔ یہ لطیف خیال، خالص حسن پر فریفتہ ہوتے ہیں اور انھیں اس قالب سے بھی سروکار نہیں ہوتا جس میں ان کا محبوب، حُسن جلوہ گر ہے۔

دنیائے احساسات کے کچھ عکس ایسے بھی ہیں جنھیں نہ تو الفاظ کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اور یہ تمام رنگا رنگ احساسات اصل کے اعتبار سے تو ایک ہی ہیں، کہ سب احساس ہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ آپس میں بہت زیادہ مختلف و متنوع ہیں۔

تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ تمام جنسی احساسات 'جنس' ہی ہیں؟ اور اس سے انسانیت کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

جی ہاں! جنس تو ضرور ہیں..... مگر اس قسم کے نقطۂ نظر سے دنیا کا ہر علم و فن نیست و نابود ہو جائے گا — جس قدر بھی دنیا میں جاندار اور ذی روح پائے جاتے ہیں سب کے سب جاندار ہی ہیں، تو پھر علم حیاتیات ان جانداروں کے درمیان موازنہ اور ان کا تقابلی مطالعہ کیوں کرتا ہے۔ اور ذی حیات موجودات میں سے ہر نوع اور ہر صنف کی علیحدہ اور جداگانہ خصوصیات کیوں بیان کرتا ہے۔ اس لیے کہ ذی حیات موجودات کے درمیان یہ گوناگوں اختلافات ہی، انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ اور انھیں ایک دوسرے سے زیادہ ترقی یافتہ قرار دیتے ہیں۔ اگر حیاتیات میں ان امتیازات کا تذکرہ نہ ہو اور تمام ذی حیات موجودات کو ایک ہی درجے میں رکھ دیا جائے، کیونکہ یہ سب زندگی کی اساس میں مشترک ہیں، تو پھر علم حیاتیات ہی کب باقی رہ جائے گا؟

یہی حال نفسیات کا ہے۔ اگر جنس کے مسئلے میں اُبھرنے والے مختلف شعور و احساسات کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ ان سب کا سرچشمہ جنسی طاقت ہے، اس لیے یہ سب ایک ہیں، تو نفسیات بھی صحیح

Marfat.com

معنے میں نفسیات باقی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ احساسات حد درجہ اہم ترین ہیں اور انہی احساسات کے ذریعے ارتقائی مراحل میں، ایک انسان میں، اور دوسرے انسان میں فرق و امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے۔

انسان میں جمالیاتی مظہر

بعض لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ مقصد حیات، زندگی کے حیاتیاتی کردار کی تکمیل ہے۔ تاکہ مغرب کے بے قید لوگ، اور مشرق کے پراگندہ فکر لوگ، یہ یقین کر لیں کہ جنسی مسئلہ ایک خالص حیاتیاتی مسئلہ ہے۔

اگر جنس صرف حیاتیاتی مسئلہ ہے، تو پھر حسن کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ حسن تو ایک ایسی صفت ہے جو حیاتیاتی ضرورتوں کے لیے قطعاً ناگزیر نہیں ہے۔ بلکہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے تو اتنا ہی کافی ہے کہ منہ کی جگہ کسی بھی قسم کا سوراخ ہو جائے، ناک کی جگہ کوئی ایسا راستہ ہو جائے جس سے ہوا اندر داخل ہو سکے اور آنکھوں کی جگہ کیسے بھی دو روشندان ہو سکتے ہیں۔ یہ اعضاء، خواہ انتہائی خوبصورت ہوں یا انتہائی بدشکل، دونوں صورتوں میں حیاتیاتی نقطۂ نظر سے دونوں کا عمل یکساں ہی رہے گا۔

جب حسن کی کوئی حیاتیاتی ضرورت نہیں ہے پھر حسن کیوں ہے؟ ظاہر ہے حسن کا وجود کسی ایسے مقصد کے لیے ہے جو ناگزیر ضرورتوں سے بلند اور زیادہ آفاقیت کا حامل ہے۔ اور وہ مقصد ہے، بلندی و رفعت، صعود و ارتفاع کا مقصد۔

اگر حسن کا وجود جسمانی طور پر مقاصد تخلیق میں شامل ہے تو پھر نفسیاتی لحاظ سے بھی حسن یقیناً مقاصد تخلیق میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ کیونکہ جس طرح جسمانی حسن تمام جسمانی اعمال کی انجام دہی کے ساتھ ایک ایسا کردار بھی انجام دیتا ہے جس کی حیاتیاتی لحاظ سے کوئی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح نفسیاتی جمال اپنے حیاتیاتی جذبات و میلانات کی تکمیل کے بعد کچھ

Marfat.com

ایسے جذبوں کی تکمیل بھی کرتا ہے جس پر حیاتیاتی ضرورت مجبور نہیں کرتی۔ بلکہ اس پر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ انسان کچھ وقت کے لیے ضرورتوں اور مجبوریوں کے درجے سے بلند ہو جائے اور اس کا نفس ارتفاع حاصل کر لے۔

یہی فطرت حیات ہے۔ یہ فطرت حیات انسان کی تخلیق نہیں ہے اور نہ اسے مشرق کے ان لوگوں نے تخلیق کیا ہے جو پسماندہ ہیں، جو بنائے تصورات میں کھوئے رہتے ہیں اور جو سائنس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اس فطرت حیات کو اس خدا نے پیدا کیا ہے جس نے کائنات کی تمام اشیا کو پیدا کیا ہے اور جس نے اپنی ہر تخلیق میں دائمی ارتقاء اور مسلسل تغیر کا جذبہ پنہاں کر دیا ہے۔

"بلاشبہ اللہ سبحانہٗ جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں"۔ (الحدیث)

نفسیاتی ارتفاع

یہ کامل یقین کر لینے کے بعد کہ خود فرد کی ذاتی مصلحت بھی اباحیت مطلقہ اور حیوانی بہیمیت سے پوری نہیں ہوتی، اور یہ کہ مقصد زندگی صرف حیاتیاتی کردار کی ادائیگی ہی نہیں ہے۔ بلکہ مقصد حیات نفسیاتی ارتفاع ہے۔ تاکہ انسان اپنا کردار اس قدر خوبصورتی کے ساتھ اور اتنے بہترین منہاج پر پورا کرے کہ وہ حیاتی اور جسمانی ضرورتوں کا پابند نہ رہے۔ ان سب امور پر یقین کامل کر لینے کے بعد ہم مغرب کو اس کی مجنونانہ پستیوں میں چھوڑ کر اسلام کے دامان عافیت میں داخل ہوتے ہیں تاکہ ہمارے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہو جائیں اور ہمارے پریشان و مضطرب اور سرگشتہ قلوب مطمئن ہو جائیں

Marfat.com

جنس کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

اُصولی طور پر اسلام، جنسی قوت کا نہایت صراحت کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔ مگر وہ اس کو ایک گراوٹ اور رات کی گہری تاریکیوں میں کی جانے والی چوری نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے پاکیزہ اور مطہر بنا کر اس پر نورانی کرنوں کا پرتو ڈالتا ہے۔

اسلام، مسئلہ جنس میں صرف اسی قدر کہہ دینے پر اکتفاء نہیں کرتا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ

(آل عمران : ۱۴)

"لوگوں کے لیے خوشنما کر دی گئی ہے، مرغوبات کی محبت عورتوں سے اور بیٹوں سے"۔

بلکہ اس کو ایک ایسی عبادت گردانتا ہے جس پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم آمادہ کرتے ہیں:

"شادی کر کے اپنا نصف دین مکمل کرو"۔

اس قول سے صرف فرد کے 'احصان' (تحفظ) کو ہی پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے اور صرف اس مسئلے کے اخلاقی پہلو ہی کو نہیں لیا گیا ہے، بلکہ جنسی پہلو میں بھی ارشاد فرمایا گیا:

"تم میں سے ہر ایک کے جنسی عمل میں بھی ثواب ہے"۔

اس پر صحابۂ کرامؓ نے متعجب ہو کر سوال کیا: "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے کوئی شخص اپنی خواہش نفس پوری کرتا ہے تو اسے بھی ثواب ملتا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "کیوں نہیں! اگر وہ اس خواہش نفس کو حرام طریقے پر پورا کرتا تو اسے گناہ ہوتا۔ اسی طرح اگر اس نے اس خواہش کو حلال طریقے پر

Marfat.com

پورا کیا ہے تو اسے ثواب بھی ملے گا۔"

نیز آپؐ نے فرمایا :

"تمہاری دنیا میں مجھے خوشبو اور عورت پسند ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"

دیکھیے اس قول میں آپؐ نے جنس کو اس قدر مطہر و پاکیزہ اور روح پرور بنا دیا کہ اسے نماز کے درجے میں رکھ دیا۔

ابھی قریب کے دور تک مسلمان اس عمل کی ابتداء سے قبل بسم اللہ پڑھا کرتے تھے، اور پرہیزگار مسلمان اب بھی ایسا کرتے ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی حس میں جنس انتہائی پاکیزہ شے ہے۔ یہ درست ہے کہ بسم اللہ پڑھنے سے ان کا منشاء آئندہ نسل میں خیر و برکت کی امید ہوتی تھی مگر نامِ خدا قلب مومن کے لیے ایک پاکیزہ ترین نام ہے اور اس کے اس موقع پر ذکر کا واضح مطلب یہی ہے کہ مسلمان کے نقطۂ نظر کے مطابق وظیفۂ جنسی ایک پاکیزہ اور ایسا ستھرا عمل ہے جس پر نامِ خدا لیا جا سکتا ہے۔

اصولی لحاظ سے جنسی قوت حیاتیاتی مسئلہ ہے۔ اور ایسا ناگزیر مسئلہ ہے کہ اس کے بغیر روئے زمین پر زندگی کا بقاء ممکن نہیں ہے۔ اسلام اس امر کا بڑی قوت کے ساتھ مؤید ہے کہ مقاصد زندگی کی تکمیل کی جائے۔ اس لیے وہ ان تمام امور کو بھی ملحوظ رکھتا ہے جو ان مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔

گویا اسلام میں بذاتِ خود مقاصد زندگی پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ بلکہ اسلام ان تمام مقاصد کو تسلیم کرتے ہوئے اور ان کے احساس و شعور کو جائز رکھتے ہوئے ان کے عملی طریقوں پر قیود اور ضوابط عائد کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم "اسلام کا نقطۂ نظر" میں بیان کر چکے ہیں اسلام، مقصدِ زندگی سے ہمکنار کرنے والی فطری جبلتوں کو کچلتا نہیں ہے، بلکہ ان کے

Marfat.com

ظہور پر ایسی بندشیں لگاتا ہے جو اسے فرد واحد اور تمام افراد کے مفادات اور مصلحتوں کے مطابق بنا دیں۔ اس طرح اسلام خود مقاصد زندگی کی جانب راہنمائی کرتا ہے اور انسان کی فطرت سلیمہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر کوئی ایسی بات لاگو نہیں کرتا جو خلاف فطرت ہو۔ اور نہ اس پر ایسے امور کی انجام دہی فرض قرار دیتا ہے جن کی انجام دہی اس کی طاقت سے باہر ہو۔

اسلام اجازت دیتا ہے کہ لوگ اپنے جذبات کو کچلنے کے بجائے جنسی مطالبے کی تکمیل کریں۔ وہ اس مطالبے کی تکمیل کی صرف اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ انسان کو آمادہ کرتا اور اشتیاق دلاتا ہے۔ مگر اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانوں میں باہم ملاپ کی صورت اس طرح ہو جس طرح جانوروں میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اسلام انسان کو یقینی طور پر حیوانات سے ارفع و اعلیٰ وجود سمجھتا ہے۔ اور یہ ایک سائنسی حقیقت بھی ہے جو مذاہب سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی ثابت ہو چکی ہے۔

اسلام انسان کو بلند آفاق سے دیکھتا ہے۔ اس کے ماضی، حال اور مستقبل پر اس طرح نظر رکھتا ہے، جیسے حیاتِ انسانی ایک مسلسل، مربوط اور پیوستہ زنجیر ہو۔ اس لیے اسلام کسی ایک شخص کے ذاتی جنون کا ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ اسے یقینی طور پر علم ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کا یہ جنون اسے تباہ کر دے گا۔ اسلام کسی ایک فرد کے تابع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی نظر دیگر تمام افراد پر بھی ہے جو اس فرد کے عمل سے نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام افراد کا حق ہے کہ وہ نقصان سے محفوظ رہیں اور زندگی اطمینان سے بسر کریں۔ اسلام کسی ایک نسل کے جذبات کی پذیرائی بھی نہیں کرتا کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ اس نسل کے اعمال سے آئندہ نسلیں نقصان اٹھائیں گی۔

اسلام انسانیت کی گراوٹ میں انسان کا ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ

Marfat.com

اس کے نقطۂ نظر کے مطابق مقصد انسانیت رفعت و ارتقاء ہے، گراوٹ اور پستی نہیں ہے، یہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے جو عقیدے سے جدا رہ کر بھی ثابت ہو چکی ہے۔ اسلام صرف حیاتیاتی عمل کی انجام دہی کو کافی نہیں گردانتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ صرف حیاتیاتی کردار انسانی زندگی کے لیے ناکافی ہے۔ خود زندگی میں حسن کی تخلیق حیاتیاتی کردار سے ایک جداگانہ شے ہے اور زندگی کو حیاتیاتی لحاظ سے بہرحال حسن کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی حسن، زندگی میں ایک پسندیدہ اور قابل قدر شے ہے۔

اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ انسانیت، پستی و انحطاط کے ایسے مقام پر آجائے جہاں تمام انسانوں کے اعمال باہم مشابہ ہو جائیں۔ اور سب کے سب خالص جبلّی وظائف کی انجام دہی میں مصروف ہو جائیں۔ کیونکہ اسلام اس حقیقت سے باخبر ہے کہ لوگوں میں جذبات و میلانات کا بھی تفاوت اسی طرح ہوتا ہے جس طرح قوت، قدرت، عقلمندی اور دولت مندی میں تفاوت و فرق ہے۔ اور انسانیت کا یہ تنوع اور اس کی یہ بوقلمونی قانونِ زندگی اور مقصد حیات ہے۔ اور اگر انسانیت پستی و انحطاط کا شکار ہو جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

غرض اسلام ہائے واحد تمام مقاصد زندگی کی تکمیل پر انسانیت کو بغیر کسی جبر کے آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ جنسی میلان کو استمرار نسل کے لیے ضروری خیال کرتا ہے تو لوگوں کو اس میلان کی تکمیل کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اور جب وہ اس میلان کی تکمیل کے طریقوں کو پاکیزہ اور شائستہ بناتا ہے، تو وہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ مقصدِ زندگی ارتفاع ہے اور انسان کو اس ارتفاع پر قدرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اسلام، انسان پر نہ تو ناروا بوجھ مسلط کرتا ہے اور نہ اسے رہبانیت کی دعوت دیتا ہے۔ بلکہ رہبانیت اور ترک دنیا کو مذہبی فرائض

Marfat.com

کی ادائیگی سے کوتاہی خیال کرتا ہے۔

بقائے نسل اور تحفظ نوع

اسلام مرد و زن کے تعلق کو ایک امر فطری تصور کرتا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہر قلب میں دوسرے کے لیے میلان اور خواہش رکھ دی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الروم: ۲۱)

"اور اسی (اللہ) کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو۔ اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے رہتے ہیں۔"

اسلام کہتا ہے کہ اس فطری تعلق کا مقصد تحفظ نوع ہے۔ اور خود یہ تعلق مقصد نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ بلکہ سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ جنسی عمل بجائے خود مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد تحفظ نوع ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرہ: ۲۲۳)

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔"

الفاظ بالا میں کھیتی کی مثال دے کر یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جس طرح کھیتی کو تیار کر کے اس میں بیج ڈالا جاتا ہے اور اس کے اگنے اور اسی نوع کے پھل لانے کا انتظار کیا جاتا ہے اسی طرح دونوں صنفوں

Marfat.com

کا تعلق بقائے نسل کے لیے ہے ۔ اور صرف خواہشات کی تکمیل بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے ۔ اور اسلام اپنے اس نقطۂ نظر میں تمام سائنسی حقائق کے مطابق اور حقائق زندگی سے ہم آہنگ ہے ۔

کسی شخص کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ جنسی خواہش کی تکمیل سے بقائے نسل کا مقصد تو بہرحال حاصل ہو جائے گا ۔ خواہ فرد اس کا شعور رکھے یا نہ رکھے ...... تو پھر ان دونوں رویوں میں کیا فرق ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیائے شعور میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں بڑا عظیم فرق ہے ..... اگر انسان یہ یقین رکھے کہ اس جبلی عمل میں کوئی بلندتر مقصد پنہاں ہے اور خود یہ عمل مقصود بالذات نہیں ہے تو اس کے اس یقین سے اس کے شعور میں خواہش نفس کے تسلط میں کمی آجائے گی اور اس میں وہ تندی باقی نہیں رہے گی جو لذت و راحت سے زیادہ احساس کے لیے جاں گسل ہو جاتی ہے ۔ اس کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ اس طرح جسمانی لذت میں کوئی کمی آجائے گی بلکہ یہ ہے کہ اسراف میں تخفیف ہو جائے گی اور انسان مامون و محفوظ ہو جائے گا ۔

اس سلسلے میں کھانے کی مثال زیادہ واضح ہے ۔ اگر کوئی شخص کھانے ہی کو مقصد زندگی بنالے اور وہ صرف اس لیے زندہ رہے کہ کھاتا رہے تو وہ اپنی ساری قوت کھانے میں صرف کر دے گا جس سے بالآخر وہ بدہضمی کا شکار ہو جائے گا اور غذا کی لذت ختم ہو جائے گی ۔ اس کے برعکس وہ شخص جو اس لیے کھائے کہ زندہ رہ سکے تو اس کو کھانے کی لذت کا احساس رہے گا اور اپنی خواہش طعام کو محدود رکھے گا اور کھانے کی خاطر اپنی شرافت کو داؤ پر لگا کر اپنی انسانیت کو بٹہ نہیں لگائے گا اور صرف اس قدر غذا کھائے گا جو نظام ہضم پر بوجھ نہ بنے اور بالآخر ضرر رساں ثابت نہ ہو ۔

جنسی مسئلہ بھی اسی طرح ہے ۔ جو شخص خواہش نفس کے حصول ہی کو

Marfat.com

مقصد بنالے اور اس میں اپنی محدود جسمانی، مالی، فکری اور جذباتی توانائیاں لٹا ڈالے تو وہ جسمانی کمزوری اور نفسیاتی انحلال کا شکار ہو جائے گا۔ مگر وہ شخص جو مقصد جنس — یعنی افزائش نسل — کو پیش نظر رکھتا ہے وہ اسراف نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے نفس کو بالقصد و بالارادہ روکے رکھے گا بلکہ اس کا نفس اعلیٰ ترین مقاصد میں معروف ہو کر خود بخود اسراف سے رک جائے گا۔ مگر ساتھ ہی جب وہ اپنی معروفیات سے فراغت پاکر اپنے جذبات اور اپنے جذبات کے ساتھ جسم کے اس مطالبے کی تکمیل کرے گا اس وقت اسے جسمانی لذت میں بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔

اس شعور سے جو انسانی اور اجتماعی فرق ابھرتا ہے وہ بھی بذات خود بڑا اعظیم فرق ہے۔ جب جنس خود مقصد بن جائے تو فرد کے دل میں ان سماجی تنظیمات کا احترام باقی نہیں رہتا جو اس سلسلے میں فرد پر پابندیاں عائد کرتی ہیں۔ کیونکہ ان تنظیمات کی اساس ہی یہ ہوتی ہے کہ اس جبلت کے ماوراء کوئی ارفع و اعلیٰ مقصد موجود ہے۔ نیز ایسا شخص بلند انسانی مشاعر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھ سکتا کیونکہ ان مشاعر کا مقصد ہی یہ بتانا ہے کہ فطری میلانات اور جنسی میلان کے اعلیٰ ترین اور پست ترین حدود کے درمیان مختلف درجات ہیں۔ جن میں بلند تر درجہ جبلت سے زیادہ دور ہے اور پست تر درجہ جبلت سے زیادہ قریب ہے۔

غرض جو لوگ خالص لذتِ بہیمی کے حصول میں کسی مقصد پر یقین نہیں رکھتے بلکہ جنس کو بذات خود مقصد سمجھتے ہیں، وہ اجتماعی اور انسانی پہلو سے بہت زیادہ پست ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی نفسیاتی عظمت اور قدرت کے لحاظ سے اس لذت کے حصول میں کسی مقصد یا متعدد مقاصد پر یقین رکھتے ہیں وہ ارتفاع اور بلندی اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ پستی اور رفعت تمام فطری میلانات پر منطبق ہوتی ہے۔ مگر اس کا

Marfat.com

پورا پورا اظہار مسئلہ جنس میں ہوتا ہے۔ اور اسی مسئلے میں اسی کے زیادہ گہرے اثرات رونما ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم اس باب کی ابتدا میں پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ جنسی قوت انتہائی شدید ہوتی ہے، اس کے اثرات نفس انسانی کے تمام گوشوں پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور مشاعر و اعمال کی ایک بڑی تعداد پہ اس کی بالادستی ہوتی ہے، اسی لیے اخلاق اگرچہ تمام انسانی تصرفات پر مشتمل ہے مگر وہ مسئلہ جنس سے بہت زیادہ مربوط (Connected) ہے، اور اس قدر زیادہ مرتبط ہے کہ اخلاق کا نام سنتے ہی ذہن میں جنسی محرک کے طریقہ شعور اور اس کی تکمیل کے آداب آجاتے ہیں۔

اگر سائنس مندرجہ بالا دعویٰ کو رد کر دے تو میں اسے چھوڑ دینے کے لیے تیار ہوں۔ مگر سائنس تو خود یہی کہتی ہے کہ جنس بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم وہی نتائج سامنے رکھیں جن نتائج کی طرف منطقی طور پر مندرجہ بالا مقدمات لے جا رہے ہیں۔

توافق اور ہم آہنگی

اوّلین مقصد جنس بقائے نسل ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرہ: ۲۲۳)

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔"

اسلام زندگی کے متفرق علیحدہ علیحدہ اجزاء کو پیش نظر نہیں رکھتا، بلکہ وہ حیات انسانی کو ایک بڑے کُل کی حیثیت میں سامنے رکھ کر اس کی تمام جزئیات میں ہم آہنگی اور توافق پیدا کرتا ہے۔ تاکہ ان تمام اجزاء کی ہم آہنگی سے ایک ایسا مربوط اور متناسق کل وجود میں آجائے جس کا ہر ہر جزء اپنی جگہ پر، اپنے مخصوص کردار کو بھی بہترین اور مناسب طریقے پر انجام دے رہا ہو، اور اس کے اس کردار کے اچھے اور خوشگوار نتائج

برآمد ہو رہے ہوں۔ اس لحاظ سے انسانی کل کا ہر جزء بیک وقت دو کردار انجام دیتا ہے۔ ایک تو جزء ہونے کی حیثیت میں اپنا مخصوص کردار، دوسرے ایک بڑے کل کا جزء ہونے کی حیثیت میں تمام اجزاء سے توافق، ارتباط اور ہم آہنگی کا کردار۔

اس سے قبل ہم فرد اور معاشرہ کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اسلام نے جملہ قوانین وھدایات اس بنیاد پر جاری کی ہیں کہ فرد کی بیک وقت دو صفات ہیں۔ ایک تو اس کے مستقل بالذات فرد ہونے کی حیثیت ہے اور دوسرے اس کے سماج کا ایک ممبر ہونے کی حیثیت ہے۔ اسلام نے فرد کی ان دونوں حیثیتوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور ایسے قوانین بنا کر فرد کے انفرادی مطالبات اور اس کے اجتماعی مطالبات میں ہم آہنگی بھی پیدا کر دی ہے، جن سے فرد کے مفادات کا بھی تحفظ ہو جاتا ہے اور سماج کی مصلحتیں بھی محفوظ رہتی ہیں۔

اللہ سبحانہ نے ہر صنف کے دل میں دوسری صنف کا اشتیاق اس لیے رکھا ہے کہ اس طرح بقائے نسل کا سامان ہو سکے۔ گویا بقائے نوع، جنس کا براہِ راست اور قریبی کردار ہے مگر ساتھ ہی جنس ایک بڑے اور عظیم کل کا ایک حصہ بھی ہے۔ چنانچہ خاندان ہے، جو مرد و زن کے نفس میں اُبھرنے والے جذباتِ الفت کی اس طرح مکمل طریقے پر تسکین کرتا ہے کہ ایسی تسکین دو افراد کے درمیان استوار ہونے والے کسی بھی تعلق سے نہیں ہو سکتی۔ اور نیز خاندان بچوں کے مطالبات کی تکمیل کرتا ہے۔

خاندانی نظام میں بچے جذبات محبت کی اساس پر پرورش پاتے ہیں جس سے زندگی کی اس کشاکش میں قدرے تخفیف ہو جاتی ہے جس پہ طبیعت حیات مجبور کرتی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (البقرہ: ۲۵۱)

Marfat.com

"اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو (روئے) زمین پر فساد برپا ہو جاتا۔"

بچوں کے جذبات محبت و الفت پر، پرورش سے، بچوں اور والدین دونوں کی خوشی و سعادت کا ایک وافر حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اور یہی بچے آنے والی نسلوں کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ غرض اس طرح خاندان کے چھوٹے چھوٹے اجزا باہم مربوط و ہم آہنگ ہو کر اپنا مخصوص کردار بھی انجام دیتے ہیں اور زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ مکمل طریقے پر اپنا اجتماعی کردار بھی ادا کرتے ہیں۔

اس طرح یہ توافق و ہم آہنگی ایک سماج سے دوسرے سماجوں کی جانب اور مختلف سماجوں سے مکمل انسانیت کی جانب بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ جس سے انسانیت کا ہر جزء ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے یہاں تک کہ اعلیٰ ترین زندگی کے جملہ مقاصد اپنی پوری تفاصیل کے ساتھ اور ایک انتہائی باریک اور مجزرس نظام کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی ایک لطیف تعبیر

قرآن کریم دونوں صنفوں کے فطری تعلق کو ایک عجیب و لطیف تعبیر سے بیان کرتا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (البقرہ: ۱۸۷)

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔"

قرآن کریم کے یہ چند الفاظ جسمانی اور روحانی تعلق کی ایک انتہائی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں جس طرح لباس انسان کے جسم سے چسپاں اور پیوست ہوتا ہے، اس لباس سے انسان کی ستر پوشی بھی ہوتی ہے اور یہ لباس انسان کے قد پر بھی پورا آتا ہے۔ اسی طرح مرد و زن بھی ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ ان کے جسم و روح متصل ہو جاتے ہیں، وہ

Marfat.com

دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں اور ایسا وثیق اتصال پیدا ہو جاتا ہے جیسا لباس میں اور لباس پہننے والے میں ہوتا ہے۔

مرد و زن دونوں، جسمانی، نفسیاتی اور روحانی لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے ستر اور پردہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے دو محبت کرنے والے میاں بیوی ایک دوسرے کی جان، عزت، دولت اور رازوں کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں، اور دونوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے شریکِ حیات کی کوئی بات کسی دوسرے پر منکشف ہو اور لوگ اس پر باتیں بنائیں اور انگلیاں اٹھائیں۔ نیز وہ دونوں ایک دوسرے کو برائی سے اور اعمالِ فاحشہ سے اس طرح بچاتے اور محفوظ رکھتے ہیں جیسے کپڑا جسم کو گرمی اور سردی کی تکلیف سے بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے۔

نیز مرد و زن دونوں ایک دوسرے کے لیے ایسے ہوتے ہیں، جیسے لباس صاحب لباس کے جسم کے مطابق ہوتا ہے، اس کو پہن کر آدمی کو آرام بھی ملتا ہے، راحت بھی ہوتی ہے اور زینت و خوبصورتی بھی ہوتی ہے جو خود اسے اور دوسرے لوگوں کو بھلی اور خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

ان مفاہیم کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یقیناً قرآنی تعبیر ایک عمیق اور مکمل اور انتہائی دلکش تعبیر محسوس ہوتی ہے۔

جب دونوں صنفوں کا تعلق اس قدر مضبوط ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ضروری ہے کہ دونوں اس طور پر ملیں جیسے وہ ایک دوسرے کا لباس ہوں ایک دوسرے کی زینت ہوں اور ایک دوسرے کے ستر اور زمانے کے گرم و سرد سے تحفظ کا ذریعہ ہوں۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ انسانیت صنفی تعلق کے لیے دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت منتخب کر سکتی ہے۔ یا تو یہ ہے کہ تمام عورتیں تمام مردوں کے لیے مشترکہ طور پر جائز ہوں، جیسا کہ حیوانات کی اکثریت

Marfat.com

میں یہی طریقہ جاری ہے[1] یا یہ کہ ایک عورت ایک مرد کے لیے اور ایک مرد ایک عورت کے لیے ہو۔ طبعی طور پر مذہب نے اسی دوسری صورت کو پسند کیا ہے، کیونکہ مذہب انسان کو اس مقام بلند پر لے جانا چاہتا ہے جس کا فی الواقع وہ سزاوار ہے اور جس کی سائنس، مذہب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بھی، تائید کرنے پر مجبور ہے۔

جنسی انارکی (Sexual Anarchy) کے فرد کے ذاتی لطف و راحت کے لحاظ سے بھی اس قدر نقصانات ہیں کہ فرد کا انفرادی مفاد بھی اسی امر کا تقاضا کرتا ہے کہ جنسی انارکی کے علاوہ کوئی ایسا نظام اختیار کیا جائے جو بالآخر فرد کے راحت و اطمینان کا باعث بنے اور اس کو اعصابی بےچینی سے بچائے اور نفسیاتی اضطراب سے محفوظ رکھے۔

اسی لیے اسلام (اور تمام آسمانی مذاہب) شادی کو مرد و زن کے ملاپ کا واحد طریقہ گردانتے ہیں اور اسلام نکاح پر اس قدر اصرار کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نکاح کو نصف دین قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح فرد خواہشِ نفس کے پُرجوش دباؤ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کا نفس جنس کے غلبے سے آزاد ہو کر بلند ترین مقاصد کے حصول اور ان کے لیے جدوجہد کے جذبات و افکار ابھارتا ہے —— اور یہی مذہب کی تعلیم بھی ہے۔

بے قید مغرب کہتا ہے کہ اگر نوجوانوں کو یہ سہولت فراہم کی جائے

---

[1] ارتقائی طور پر اونچے درجے کے بعض حیوانات میں خاندان سے ملتا جلتا نظام ملتا ہے، ان کے یہاں جنسی انارکی موجود نہیں ہوتی، بلکہ اگر کوئی نر اس جنسی انارکی کے درپے ہو تو سخت معرکہ بپا ہو جاتا ہے جس میں طاقت ور کامیاب ہو جاتا ہے اور کمزور کو اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

کہ وہ بآسانی اپنے جذبات کی نکاسی کر سکیں تو ان کے اعصاب پر کوئی بوجھ برقرار نہیں رہے گا اور وہ مفید اور نتیجہ خیز کاموں میں لگ سکیں گے۔

فطری میلان اور پاکیزہ مقصد

مغرب کے اس دعوے میں ظاہری خیرگی تو بہت ہے مگر یہ دعویٰ حقیقت کے بالکل برخلاف ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نوجوان جذبات کی نکاسی کے بعد جس عمل کی جانب متوجہ ہوتے ہیں وہ خالص مشینی عمل ہوتا ہے جس پر انھیں زندگی کی ضرورت مجبور کرتی ہے اور مادی زندگی سے اور حقائق زندگی سے بلند اور ارفع کوئی مقصد ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ اور مغرب کی مادی زندگی کا سارا کچھ ماحصل بھی یہی ہے کہ دنیائے مادہ میں تو عظیم ترین ترقیات کر لی گئی ہیں مگر دنیائے نفس و روح اور عالم ضمیر مردہ، بے جان اور پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس مقام پر ضمیر کے لفظ سے میری مراد وہ افادی ضمیر نہیں ہے جو تاجر اور صارف کے درمیان اور مالک اور ملازمین کے درمیان تعلقات استوار کرتا ہے، بلکہ میری مراد اس ضمیر انسانی سے ہے جو تمام افراد بشر میں انسانی برادری کا شعور بیدار کرتا ہے اور اس شعور کے مطابق دنیائے عمل میں ظہور میں آتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس بات پر کچھ لوگ بیزاری سے اپنے شانے اچکائیں اور ناگواری سے ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں اور وہ یہ کہیں کہ ان تصورات کی، آج کی دنیا میں کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ بلکہ اب ترقی مادی ترقی، سائنسی ترقی اور زمینی پیداوار کی ترقی ہی کا نام ہے ——— مگر ذرا اس دنیا پر ایک نظر ڈالیے جس میں ان مادی اصولوں کا ہر جانب چلن ہوا اور جہاں اس حیوانی فلسفے کے حامل مغرب نے اپنا تخت اقتدار بچھایا۔ اس دنیا میں یہی کچھ تو ہوا کہ صرف ایک چوتھائی صدی میں دو عالمی جنگیں ہوئیں اور تیسری دروازے پر کھڑی ہے، اگر مغرب کی چمک دمک سے

Marfat.com

مرعوب اور تہذیب نوی کی روشنی سے خیرہ نگاہ لوگ، تباہ کن بموں اور قاتلِ انسانیت جنگوں سے ہی خوش ہیں اور اسی میں ذہنی سکون اور نفسیاتی اطمینان محسوس کرتے ہیں تو ضرور کریں۔

بہرحال انسان اعلیٰ مقاصد کی جانب اسی وقت متوجہ ہوتا ہے اور اس کے ضمیر میں بلند آفاق شعور اسی وقت بیدار ہوتا ہے جب وہ اپنی جنسی توانائی کو پاکیزہ بنیاد پر صَرف کرتا ہے۔ اور جب اس کے سامنے جنس کا مقصد ہوتا ہے اور جنس بذات خود مقصد نہیں ہوتی۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ صرف یہ شعور و احساس ہی انسانی ارتقاء کے لیے کافی ہے بلکہ میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ہر فطری میلان میں کسی پاکیزہ مقصد کا شعور، انسان کی طبیعت میں ایسی زرخیزی پیدا کر دیتا ہے جس میں اقدار عالیہ نشوونما اور فروغ پا سکتی ہیں۔ اس کے بغیر کوئی قدر راسخ نہیں ہو سکتی، خواہ 'انسانیت' کے کتنے ہی بلند دعوے کیوں نہ کیے جائیں اور ان دعوؤں کے ذریعے سے انگلستان، فرانس، امریکہ اور روس کے لوگ کتنا ہی خوش کیوں نہ ہوں۔ باشندوں کے ضمیر کتنے ہی بیدار کیوں نہ ہوتے رہیں اور خواہ یہ بڑی طاقتیں پسماندہ اقوام کا معیار زندگی کتنا ہی بلند کرتی رہیں ——— کبھی فوجی پیش قدمی کر کے ——— کبھی اقتصادی طور پر ذلیل کر کے ——— اور کبھی اسرائیل جیسے ناپاک ریاست کو وجود بخش کے کہ وہ عربوں کا خون چوستی رہے اور عرب پناہ گزینوں میں اشتراکیت کے فروغ و ارتقاء کا باعث بنتی رہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دَور میں اور اس کے بعد کے بھی بعض زمانوں میں اسلام صحیح صورت میں اور اپنے حقیقی معنوں میں مسلمانوں میں کارفرما تھا تو اس وقت مسلمانوں کے نفوس میں کسی قدر عظیم الشان اور بلند اقدار رچی بسی تھیں، جن کے بل بوتے پر مسلمانوں

Marfat.com

نے مثالی سرعت کے ساتھ ساری دنیا میں اسلام کا پیغام پھیلا دیا۔ ہندوستان سے لے کر اسپین تک تمام مسلمانوں میں بھائی چارہ قائم ہو گیا اور ان نصاریٰ اور یہود تک میں بھی مسلمانوں کے انسانی جذبات سرایت کر گئے جو دعوت غیر سے کھلم کھلا نبرد آزما نہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں نے عسکری، اقتصادی اور سائنسی غلبہ بھی حاصل کیا۔ کیونکہ اسلام صرف نظریاتی اور تصوراتی نظام ہی نہیں بلکہ ایک ایسا بھرپور عملی ضابطہ حیات ہے جو تمام دنیاوی اُمور میں بھی دلچسپی لیتا اور انسان کو روحانی طور پر سربلند بھی کرتا ہے۔

انسانی مساوات

اسلام خاندانی تعلقات کو دونوں صنفوں کے درمیان انسانی مساوات کی بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ ہر انسان ـــــ مرد ہو یا عورت ـــــ اسلام کی نظر میں خدا کی مخلوق ہے جس کے برابر اور مساوی انسانی حقوق ہیں۔ اس کی زندگی بھی معزز ہے اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی قابلِ احترام ہے اور کسی کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو طعنہ دے، نام رکھے، بُرا بھلا کہے، غیبت کرے، تجسس کرے اور اس کی بغیر اجازت اس کے گھر میں داخل ہو۔ ان تمام حقوق میں مرد و زن دونوں برابر ہیں کیونکہ ان حقوق کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔

اسی طرح اعمال پر جزائے آخرت میں بھی مرد و زن برابر ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (النحل: ۹۷)

"نیک عمل جو کوئی بھی کرے گا، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔ اور ہم انھیں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔"

Marfat.com

مگر اسلام چونکہ انسان کی فطرتِ سلیمہ سے ہم آہنگ ہے اس لیے وہ مرد و زن کی بالکلیہ مماثلت کے بجائے دونوں کی قانونی مساوات کا قائل ہے۔ اس لیے اسلام، انسانیت پر مشتمل تمام اُمور میں مرد و زن کو برابر اور مساوی قرار دینے کے ساتھ ان حقوق و فرائض میں فرق روا رکھتا ہے جو دونوں کے جداگانہ طبعی مزاج اور منفرد کردار سے متعلق ہیں۔ اور یہی وہ اُمور ہیں جن پر عورتیں شور و شر بپا کیے ہوئے ہیں۔ ان کی کانفرنسیں ہوتی ہیں اور مرد معاوضہ لے کر مرد و زن دونوں کے حقوق و فرائض میں مطلق مساوات کے موضوع پر کتابیں تصنیف کرتے ہیں۔ ان کرائے کے لکھنے والوں کی اُجرت اور اس کی نوعیت نامعلوم اور ناقابلِ ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت وہ یہ مطالبہ بھی کر بیٹھیں کہ مرد و عورت کے جسمانی اعضاء اور نفسیاتی طبیعتوں میں مساوات کے لیے کچھ آلات ایجاد کر دیے جائیں تاکہ مکمل مماثلت ہو جائے اور ہر صنف بیک وقت مرد بھی اور عورت بھی ہو اور اس طرح کسی صنف کو دوسری صنف کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

تقسیمِ میراث

اسلام نے دو اساسی مقامات پر مرد و زن میں تفریق قائم کی ہے: قوامیت اور تقسیمِ میراث۔

چلیے! پہلے اقتصادی مسئلے (تقسیم میراث) پر گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس مسئلے کے پیشِ نظر مشرق و مغرب کے پروپیگنڈہ باز، اسلام کو دورِ جہالت اور زمانۂ تاریکی کا ایک پس ماندہ نظام بتاتے ہیں —— اور اس حقیقت کے باوجود بتلاتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو وہ تمام انسانی حقوق عطا کیے ہیں، جن کے حصول کے لیے آج عورت ہر مرد سے چیخ و پکار مچائے ہوئے ہے مگر کوئی کان تک نہیں دھرتا۔

اسلام کہتا ہے:

Marfat.com

فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ط (النساء : ۱۷۶)

"ایک مرد کو دو عورتوں کے حصے کے برابر ملے گا"

یہ بلاشبہ مرد کو ایک حق دیا گیا ہے، مگر اس حق کے بالعوض مرد کو کفیل ٹھہرایا گیا ہے جب کہ عورت سے خود اپنی ذات یا کسی اور کی کفالت کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے تو یہ ظلم و استبداد کس طرح ہو گیا؟ یہ مسئلہ تو حساب کا ہے جذبات کا اور دعووں کا تو نہیں ہے۔

عورت کو وراثت میں ایک تہائی ملتا ہے۔ اور اس لیے ملتا ہے کہ وہ اپنی ذات پر خرچ کرے جب کہ مرد کو دو تہائی ملتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی (یعنی عورت) پر خرچ کرے اور اپنے خاندان پر اور اپنی اولاد پر خرچ کرے تو حساب اور منطق سے کس کا حصہ زیادہ بنتا ہے؟ اور اگر بالفرض چند مستثنیٰ صورتوں میں کچھ لوگ نہ شادی کریں اور نہ خاندان بسائیں بلکہ اپنا سارا مال اپنی ہی ذات پر خرچ کر ڈالیں تو اس صورت میں بھی یہ لوگ عورتوں پر غیر قانونی طریقوں سے خرچ کریں گے۔ طبعی صورت تو یہ ہے کہ مرد اپنی دولت و ثروت اپنا گھر بنانے میں خرچ کرے جس میں لامحالہ ایک عورت ضرور ہو گی جو اس کی بیوی ہو گی اور وہ اس پر قانونی طور پر لازماً خرچ کریگا۔ اور جو بیوی کی مخصوص ملکیت ہو گی اس میں سے شوہر بغیر اس کی اجازت کے نہ لے سکے گا۔ اور اگر بیوی چاہے تو اپنا مال محفوظ رکھ سکتی ہے اور مرد سے انکار کر سکتی ہے جبکہ مرد پر اس کے باوجود بھی خرچ کرنا لازم ہے۔ اور اگر مرد خرچ دینا بند کر دے یا اس میں کمی کرے تو عورت اس معاملے میں قانونی رجوع کر سکتی ہے۔

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ج

(البقرہ : ۲۳۶)

"وسعت والے کے ذمے اس کی حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے کے ذمے اس کی حیثیت کے لائق"

Marfat.com

اور شریعت کا قانونی فیصلہ یہ ہے کہ مرد یا تو نفقہ برداشت کرے یا پھر جدائی پر راضی ہو جائے۔

کیا اب ان سب باتوں کے باوجود بھی میراث میں عورت کا حقیقی حصہ کم رہتا ہے؟ اور کیا اقتصادی لحاظ سے مرد کے دہرا حصہ ہونے سے کوئی فرق رونما ہوتا ہے جب کہ مرد پر ایسی ذمے داریاں اور ایسے بوجھ ہیں جو عورت پر نہیں ہیں؟

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مرد و عورت کا یہ فرق صرف مال میراث میں ہے۔ اور اسلام نے میراث کی تقسیم میں دونوں صنفوں کی ضروریات اور ان کی ذمے داریوں کے پیش نظر رکھا ہے۔ میراث کے علاوہ اس مال میں جو عورت نے یا مرد نے اپنے کسب سے حاصل کیا ہو، اس میں بالکلیہ قانونی مساوات ہے اور اسلام میں کوئی ایک دفعہ بھی ایسی نہیں مل سکتی جس سے عورت اور مرد کی اجرت اور معاوضے میں فرق ظاہر ہوتا ہو جبکہ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی انگلستان کی عورتیں مساوی اجرتوں کے حصول کے لیے مظاہرے کر رہی ہیں۔

مسلمان عوام جس طرح سمجھتے ہیں اور دشمنان اسلام جس طرح پروپیگنڈہ کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ عورت کی قیمت مرد سے نصف ہے کیونکہ اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ رہ گیا شہادت کا مسئلہ اور اس سے یہ استشہاد کرنا کہ عورت مرد کا نصف ہے، تو یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس مسئلے میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ گواہی کی جملہ ضمانتیں پوری ہو جائیں۔ چونکہ عورت کی طبیعت جذباتی اور سریع الانفعال ہے اور عورت کے بارے میں اس امر کا قوی امکان ہے کہ مسئلے کے متعلقہ پہلوؤں سے زیادہ متاثر ہو جائے اور حقیقت کو نظر انداز کر دے، اس لیے یہ قانون

Marfat.com

بنایا گیا کہ اس کے ساتھ دوسری عورت بھی ہو کہ اگر پہلی حقیقت کو نظر انداز کر دے تو دوسری اسے متوجہ کر دے۔

اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ (البقرۃ : ۲۸۲)

"تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے گی اگر کوئی ایک ان دو میں سے بھول جائے۔"

البتہ یہ بات بہت ہی شاذ و نادر وقوع میں آ سکتی ہے کہ دو عورتیں ایک ہی مقام پر موجود ہوں اور وہ دونوں ایک ہی غلط بات پر متفق ہو جائیں اور ان میں سے کوئی بھی بات کے پرت اس طرح نہ کھول دے جس سے حقیقت منکشف ہو جائے۔

قوامیت

قوامیت کے مسئلے میں دراصل تقاضائے ضرورت یہ ہے کہ مرد و عورت کے درمیان قائم ہونے والے اس مشترکہ ادارے کے قیام و بقاء اور اس میں مزید افراد کے بڑھ جانے کے بعد متوقع ذمے داریوں کی تکمیل کے لیے مرد و زن میں کسی نہ کسی کو ذمے دار بنایا جائے۔ کیونکہ انسان نے آج تک جس قدر ادارے بنائے ہیں ان میں اسے کوئی ایسا صدر یا ناظم مقرر کرنا پڑا ہے جو متعلقہ امور کی نگرانی کر سکے اور ان کا جوابدہ بن سکے۔ اگر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو ہر ادارہ انارکی اور انتشار کا شکار ہو جائے اور سب کو مجموعی طور پر اس کا نقصان اٹھانا پڑے۔ اب خاندان کی قوامیت میں تین صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو مرد کو نگراں بنایا جائے، یا عورت نگران ہو، یا دونوں ہی ذمے دار اور نگران قرار دیے جائیں۔ تیسری صورت تو ناقابلِ عمل ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ کسی ادارے میں دو یکساں حیثیت کے نگرانوں کا وجود اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے جس قدر کہ

Marfat.com

نقصان، بغیر کسی نگران کے ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم تو آسمان و زمین کے بارے میں فرماتا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیاء: ۲۲)

"اگر ان دونوں (جگہوں) میں علاوہ اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو گئے ہوتے۔"

إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ (المومنون: ۹۱)

"اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو جُدا کرتا اور (پھر) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔"

جب یہ صورتِ حال تصوراتی خداؤں میں پیش آ سکتی ہے تو عام انسانوں میں کیوں نہیں پیش آ سکتی؟

نفسیات تو بہر حال یہی کہتی ہے کہ جو ماں باپ اپنی اپنی بالادستی کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں ان کے زیر سایہ تربیت پانے والے بچوں کے جذبات نارمل نہیں رہتے۔ اور ان کے نفوس میں اُلجھنیں اور اضطرابات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اب پہلی دو صورتیں رہ گئی ہیں، جن پر گفتگو کے آغاز سے قبل ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے فی الواقع قوامیت اور اس کی بوجھل ذمے داریوں کی ادائیگی کے لیے قوتِ فکر، زیادہ موزوں ہے یا جذبہ؟ اس کا بدیہی جواب یہی ہے کہ منصب قوامیت کے لیے فکر زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ فکر انفعالیت اور جذباتیت سے دُور رہ کر، تدبیرِ امور کرتی ہے جبکہ جذباتیت، فکر میں انحراف پیدا کرتی اور اسے صاف سیدھے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب کسی بحث کے بغیر مسئلہ طے ہو گیا۔

Marfat.com

مرد کو جو قوت فکر یہ ملی ہے، اسے زندگی کی کشاکش سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو طاقت دی گئی ہے اور نتائج و عواقب کو انگیز کرنے کے لیے اس کے اعصاب جس قدر مضبوط بنائے گئے ہیں اس کا مفہوم یہی ہے کہ مرد، عورت کی بہ نسبت منصب قوامیت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بلکہ خود عورت اس مرد کا کوئی احترام نہیں کرتی جو اس کا تابع ہو اور اس کی خواہشوں کے سامنے جھکتا رہے۔ عورت ایسے 'زن مرید' شوہر کو سخت ناپسند کرتی ہے اور اس سے نفرت کرتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ہمیشہ سے عورت کی اسی طرح تربیت ہوتی رہی ہے اس لیے اس تربیت نے اس کے لاشعور میں اپنے اثرات مرتسم کر دیے ہیں اور غیر شعوری طور پر عورت کے مشاعر اس طور پر ڈھل گئے ہیں۔ مگر امریکی عورت تو تمام اقتصادی حقوق میں مرد کے مساوی ہے اور اس کا اپنا مستقل وجود ہے۔ وہ کیوں مرد کے تابع ہے؟ وہ کیوں (امریکی اخبارات کے تبصروں کے مطابق اور وہاں سے آنے والے لوگوں کے بیان کے مطابق) مرد کے پٹھے دیکھتی ہے، مرد کا چوڑا سینہ اور مضبوط بازو دیکھتی ہے اور اپنی جسمانی کمزوری اور اس کی جسمانی قوت کا احساس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے نشیب و فراز سے باہم مل کر ایک متناسق اور مربوط مزاج تشکیل پا جاتا ہے۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں عورت کو جو بالادستی کا اشتیاق ہوتا ہے وہ صرف اس لیے کہ اس وقت اولاد نہیں ہوتی اور وہ ان ذمے داریوں سے فارغ ہوتی ہے۔ مگر جوں ہی یہ مشاغل سامنے آتے ہیں جو لامحالہ آنے ہی ہوتے ہیں، تو اس کے اعصاب اور اس کے ذہن میں اس قدر آمادگی باقی نہیں رہتی کہ وہ تربیت اولاد کے علاوہ بھی کچھ اور ذمے داریاں قبول کرے۔

Marfat.com

اس قوامیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد عورت پر ایک جابر حکمراں کی طرح مسلط ہو جائے اور گھر میں ایک آمر بن جائے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ بالادستی جس کے ساتھ ذمے داریاں بھی ہوں ان میں مشورہ اور تعاون زیادہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ اور وہی سرداری زیادہ کامیاب ہوتی ہے جس میں مکمل موافقت اور مسلسل جذباتی تعاون حاصل ہو۔ تمام اسلامی تعلیمات، گھر کے نظام میں اسی روح کو داخل کرنا چاہتی ہیں۔ حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان لوگوں کو ناپسند فرمایا ہے جو اپنی نافرمان بیویوں کے سلسلے میں، بلا شدید ترین ضرورتوں کے بھی، ان اجازتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں جو قرآن نے آخری درجے میں بیویوں کی تادیب و سرزنش کے لیے مردوں کو دی ہیں۔ چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے:

"کیا تمہیں اس بات پر کوئی شرم نہیں آتی کہ تم صبح کو اپنی بیویوں کو مارو اور شام کو پھر انھی کے ساتھ بستر پر لیٹ جاؤ"

آپؐ نے اس تنبیہہ میں لوگوں کو اس بات کی نصیحت کی ہے کہ زن و شو باہم الفت و محبت سے رہیں۔ نیز آپؐ نے مرد کی اچھائی اور بھلائی کا پیمانہ بھی یہ بتایا ہے کہ اس کا معاملہ اپنی بیوی سے اچھا ہو۔:

"تم میں سے اچھا شخص وہ ہے جس کا اپنی بیوی سے برتاؤ اچھا ہے۔"

مرد کی قوامیت کا ایک یہ حق بھی ہے کہ طلاق کا استحقاق بھی اسے ہی حاصل ہو۔ مگر وہ خواتین جنھوں نے کانفرنسیں منعقد کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا ہے وہ یہ کہتی ہیں کہ طلاق کا حق مرد کو دے دینا ظلم اور نا انصافی ہے۔ عورت کو بھی یہ استحقاق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ مرد کو طلاق دے دے۔

یہ مسئلہ درحقیقت بڑا سادہ ہے۔ ہر عورت اپنے آپ سے سوال کر کے معلوم کرے کہ وہ زندگی میں کتنی مرتبہ ایک شے سے منفق ہوئی

Marfat.com

اور پھر جب اس کے جذبات تبدیل ہو گئے تو پھر دوبارہ اس کو رد کر دیا۔ غور کرنا چاہیے، کہ عورت اپنی طبیعت کی اس نیرنگی کی بناء پر کتنی مرتبہ اپنے شوہر کو طلاق دے گی پھر اس سے رجوع کرے گی، پھر طلاق دے گی اور پھر رد کرے گی۔ اس طرح گھر کا امن و سکون ہی لٹ جائے گا اور اس ماحول میں بچوں کے نفوس میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔

اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مردوں میں ایسے غیر متوازن لوگ نہیں پائے جاتے۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ دونوں صنفوں میں کم و بیش ایک دوسرے کی طبیعت کے اثرات موجود ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کے حالات میں احکام، انفرادی حالات پر نہیں بلکہ عمومیت اور اکثریت کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود اسلام نے عورت کو اس امر کی اجازت دی ہے کہ وہ شادی کے وقت یہ شرط لگا دے کہ اگر وہ چاہے گی تو مرد سے جدائی اختیار کر سکے گی[1]

اسلام اور تحدید روابط

بقید نکاح اور گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے اسلام جنسی قوت کے اظہار کو اس کے طبعی اور معقول میدان میں جائز قرار دیتا ہے۔ مگر بہرحال اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ سرِ راہ ہے، کھلم کھلا ایک دوسرے سے ملا جائے یا چوری چھپے ملاقات کی جائے۔ کیونکہ اسلام کو پتہ ہے کہ جو قوم جنسی پستی میں گر جاتی ہے اور اس کی راہ میں اس

---

[1] میں نے اپنی کتاب "اسلام اور جدید ذہن کے شبہات" کے باب "اسلام اور عورت" میں اس موضوع کو کہ اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے، بالتفصیل اور ہمہ جہت بیان کر دیا ہے۔

Marfat.com

پستی میں گرنے سے روکنے کے لیے کوئی رُکاوٹ نہیں کھڑی کی جاتی وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو نظامِ حیات عورت کو ایک مرد کے قبضے میں دے کر اس کے سوا دوسروں کے لیے اظہارِ زیب و زینت حرام قرار دیدے وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ (النور : ۳۱) "اور اپنی زینت ظاہر نہ ہونے دیں مگر ہاں اپنے شوہروں پر" —— تو یہ نظام عورت کے حق میں ایک ظالمانہ نظام ہے۔ کیونکہ عورت کی طبیعت ہی یہی ہے کہ وہ اپنے فتنۂ حسن پر لوگوں کو فریفتہ کرے اور زیادہ سے زیادہ مرد اس کے حسن جہاں سوز کی کشش میں گرفتار ہو جائیں۔ عورت کو جب تک اجتماعی پسندیدگی کا احساس نہ ہو اس کی ذات کا اثبات نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم عورت کو ایک مرد کے پلے باندھ کر اس کی صفاتِ نسوانی کو دبا دیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو ایک محدود دائرے میں اپنے حُسن کی جوت جگانے کی جو اجازت دی ہے اور اس کو اس دائرے میں محدود کر دیا ہے اس میں اجتماعی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کا ہر وہ قانون اور ہر وہ ہدایت جس میں اجتماعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو اس میں ساتھ ہی فرد کے مفاد کی بھی رعایت رکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اگر عورت کو اس کے اثبات ذات کے لیے یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے حسن سے لوگوں کو متاثر کرے تو خود اس کا شوہر بھی دوسری عورتوں کے حسن اور آرائش و زیبائش سے متاثر ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی عورت اس صورتِ حال سے خوش رہ سکتی ہے کہ ہر وقت اس کا دل اس بات میں اُلجھا رہے کہ کہیں کوئی عورت اس کے شوہر کو اپنی جانب مائل نہ کر لے۔ جس کا مطلب

Marfat.com

یہ ہُوا کہ وہ اپنے دامِ حسن میں خود اپنے شوہر کو مقید نہ رکھ سکی جو اس کی انا کے لیے یقیناً ایک صدمہ ہو گا اور اس کی ذات کے اثبات میں رُکاوٹ بنے گا۔

اس کے علاوہ عورت اپنی ذات کا اثبات اس طرح بھی کر سکتی ہے کہ صرف عورتوں کی مجلس میں، دوسری عورتوں کے دلوں میں، رشک و حسد کے جذبات پیدا کر دے، کیونکہ عورتیں فطرتاً اس بات سے آشنا ہوتی ہیں کہ کس درجے کا ناز و انداز اور آرائش و زیبائش مرد کو گرفتارِ حسن کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس طرح عورت کی ذات کا اثبات بھی ہو جائے گا اور نہ کوئی برائی جنم لے گی اور نہ سماج بے قیدی اور انارکی کا شکار ہو گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ قید عورت پر تو لگائی گئی ہے مگر مرد پر نہیں لگائی گئی کیونکہ اسلام عورت کے بالمقابل مرد کو ترجیح دیتا ہے تو یہ ایک مغالطہ ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں عورت کی طبیعت یہ ہے کہ وہ مردوں کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی پیدا کرے وہاں مرد بھی طبعاً اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بیک وقت کئی عورتوں کو اپنے زیرِ اقتدار رکھے اور اپنی طبیعت کے نو بہ نو بدلتے ہوئے رُخ کے مطابق ان کے پاس جاتا رہے۔ تو کیا اسلام نے مرد کو اس امر کی اجازت دی ہے ؟ جی نہیں، بلکہ یہاں بھی اجتماعی مفاد اور انفرادی مصلحت کے پیشِ نظر ممانعت کر دی گئی ہے۔ کیونکہ اگر ہر شخص کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ وہ بغیر کسی قانون کے متعدد عورتوں کے درمیان منتقل ہوتا رہے تو اس کا کیا تحفظ ہو گا کہ کوئی شخص دوسرے شخص کے لیے مخصوص عورتوں پر دست درازی نہیں کرے گا اور ایسی صورت میں مرد کو اثباتِ ذات میں سعادت و خوشی نصیب نہ ہو سکے گی۔

Marfat.com

مرد و زن پر اسلام نے یہ ممانعتیں جو ان دونوں کے مفاد میں عائد کی ہیں، ان کے مزاج کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ نفس انسانی کی اس گہرے اور عمیق فطری جذبے کے جواب میں ہیں جو انسان کے اندر خاندان بنانے کا اشتیاق پیدا کرتا ہے اور جس جذبے کے تحت مرد و زن باہم مل جل کر محبت و الفت اور سکون و اطمینان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس طرح رہنے سہنے میں انھیں وہ خوشی اور اطمینان نصیب ہوتا ہے جو خاندان کے علاوہ اور کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔

اسلام اور تعدد ازدواج

اسلام نے مرد کو تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت دی ہے اور وہ اس اجازت کے ماتحت بیک وقت دو دو، تین تین، اور چار چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ جب کہ عورت کو تعدد ازواج کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ دورِ جدید میں اسلام کے تعدد ازدواج کے مسئلے پر بڑے اعتراضات کیے ہیں۔

تاریخ کے کسی بھی دور میں عورت نے تعدد ازواج کا مطالبہ نہیں کیا ہے کیونکہ یہ امر عورت کی فطرت کے خلاف ہے، وہ ہمیشہ اس مرد کی ہو کر رہتی ہے جس کو وہ پسند کرتی ہے اور اسی گھر میں زندگی گزار دیتی ہے جس میں وہ ایک مرتبہ داخل ہو جاتی ہے۔ اس کا اگر علاوہ شوہر کے کسی اور سے تعلق بھی تصور کیا جائے تو اس کے جذبات و عواطف میں سے اس نئے شخص کو دینے کے لیے کچھ نہیں بچتا اس لیے عورت کے تعدد ازواج (Polyandry) کا مسئلہ تو زیر بحث ہی نہیں آتا۔

دراصل اسلام میں کثرت ازدواج کا قانون عام حالات کے لیے نہیں ہے بلکہ ان غیر معمولی حالات کے لیے ہے جن میں کسی خاص

Marfat.com

سبب کی بناء پر عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھ جائے، جیسے جنگ یا وبائی بیماری۔ (جس سے مرد گھر سے باہر کی زندگی گزارنے کی بناء پر زیادہ متاثر ہوتے ہیں بہ نسبت عورتوں کے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں محصور ہونے کے باعث قدرے محفوظ رہتی ہیں۔ نیز جیسا کہ اعداد و شمار بتاتے ہیں امراض سے تحفظ کی صلاحیت عورت میں مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔)

اس قسم کی صورت میں جب عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ کچھ عورتیں بغیر مردوں کے رہ جائیں گی۔ اس لازمی نتیجے سے نمٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی احتیاطی تدبیر ناگزیر ہے۔ عورتوں کی زیادتی کی صورت میں جو اقتصادی مسئلہ پیدا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ مروجہ اقتصادی نظام اس کا کوئی حل تلاش کر لے اس لیے اس مسئلے کا اقتصادی پہلو اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر اس کا نفسیاتی اور جسمانی پہلو اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ نفسیاتی لحاظ سے کوئی بھی عورت مرد سے مستغنی نہیں ہو سکتی جیسا کہ مرد عورت سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے وہ عورت جسے مردوں کی کمیابی کی بنا پر کوئی مرد میسر نہیں آ سکا ہے وہ فرشتہ تو نہیں ہے، وہ یقیناً اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لیے چوری چھپے کسی نہ کسی مرد سے ملے گی اور اگر کوئی اباحیت پسند سماج اور بے قید معاشرہ اسے کھلم کھلا اجازت بھی دے دے تو بھی اس کا گھر بنانے اور خاندان تشکیل دینے کا فطری جذبہ تو تشنہ ہی رہے گا اور اس کی یہ خواہش تو ہر حال میں برقرار رہے گی کہ وہ ایسی زندگی گزارے جس میں اسے اپنے پاس ایک مرد ہونے کا احساس ہو۔ ذرا غور کیجیے! ان دونوں صورتوں میں سے اس کے لیے کون سی صورت بہتر ہو سکتی ہے؟ یہ کہ عورت بھی اپنی ہی جیسی دوسری عورت کی شریک بن جائے

Marfat.com

اور دو عورتیں ایک مرد کے نکاح میں آجائیں، یا پھر اس عورت کی ساری زندگی افسردہ و پژمردہ ہو کر رہ جائے اور وہ ساری عمر مرد کی گھات لگائے بیٹھی رہے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عورت کی اپنی سوکن کے ساتھ زندگی بعض اوقات ایک نفسیاتی جہنم ہوتی ہے مگر اس جہنم کی تپش اس جہنم سے یقیناً کم ہے جو عورت کو اس صورت میں انگیز کرنا پڑتا ہے جب اسے مرد ہی میسر نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت سوکن بننے کو، کم مضرت رساں سمجھتے ہوئے قبول کر لیتی ہے۔

گویا تعدد ازدواج کا حکم ان غیر معمولی حالات کے سدباب کے لیے ہے جن میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جائے۔ مگر جبکہ عام حالات ہوں اور مرد و زن کی تعداد مساوی ہو تو تعدد ازدواج کا مسئلہ خود بخود عمل میں نہیں آئے گا کیونکہ مردوں کی تعداد سے زیادہ عورتیں نہیں ہوں گی اور کوئی بھی عورت کسی شادی شدہ مرد سے شادی پر تیار نہ ہو گی کیونکہ اسے خود منفرد طور پر شوہر میسر آسکتا ہے تو وہ یہ شرکت کیوں گوارا کرے گی؟

مردوں کی کمی کی یہ دونوں صورتیں عملاً مساوی ہیں کہ خواہ مرد فی الواقع کم ہوں یا حکماً کم ہوں کیونکہ جو مرد اقتصادی لحاظ سے شادی نہیں کر سکتے یا صحت کے لحاظ سے شادی کے اہل نہیں ہیں عورتوں کے حق میں وہ غیر موجود ہیں۔ اس قسم کے غیر متوازن حالات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تدبیر ممکن ہوتی ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ جیسے نتائج جنگ ــــــ ایسی صورت میں یہ ہنگامی قانون نافذ ہو گا تاکہ جس قدر افراد کو بچانا ممکن ہو انہیں بچایا جا سکے اور جس قدر ممکن ہو اس مسئلے کے نقصانات سے بچا جا سکے۔ دوسری عالمی جنگ

Marfat.com

میں جب جرمنی کے لاتعداد مرد قتل ہو گئے تو اس وقت جرمنی نے بھی اس اقدام کی کوشش کی کہ تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تعدد ازدواج کو اس مسئلے کا بہترین حل سمجھا۔ جو اسلام کے حق میں ایک غیر مسلم ریاست کی جانب سے ایک بہترین شہادت ہے جس کے بعد دلیل بازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی ہے[1]

اسلام اور مساوات زن و مرد

عام حالات میں جب مرد و زن کی تعداد برابر اور مساوی ہو اس وقت ان دونوں کو مواقع بھی مساوی طور پر میسر آئیں گے۔ اور کوئی ایسا کام مرد کے لیے جائز نہ ہوگا جو عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے ہر نظام سے زیادہ اسلام اس بات کا اشتیاق رکھتا ہے کہ مرد و زن میں اخلاقی اور نفسیاتی مساوات قائم ہو۔

چنانچہ تمام معاشرے، مرد کی لغزش کو عورت کی لغزش سے کمتر اور ہلکا گردانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مرد کی لغزش کے اثرات اس کی خاندانی شرافت اور اس کی عائلی زندگی تک نہیں پہنچتے، جرم کے نتائج اس کے جسم کا حصہ نہیں بنتے اور وہ بیوی پر غیر عورت کی نسل نہیں تھوپتا۔ جبکہ عورت کا گناہ مجسم صورت بن کر سامنے آجاتا ہے اور وہ غیر مرد کی نسل اپنے شوہر پر تھوپ دیتی ہے۔ مگر اسلام کا نقطہ نظر سب کے لیے

---

[1] جرمنی کی کوششوں کے باوجود وہاں یہ قانون نافذ نہ ہو سکا، کیونکہ فاتح ممالک کو یہ خطرہ ہوا کہ جب ہر عورت کو قانونی شوہر مل جائے گا، تو فاتح سپاہی کو سامان عیش کہاں سے میسر آئے گا۔ پھر فاتحین کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ جرمن قوم کے اخلاق کا دیوالیہ نکال دیا جائے تاکہ وہاں ان کے خلاف کوئی مزاحم قوت سر نہ اٹھا سکے۔

Marfat.com

مبنی بر انصاف ہے۔ وہ مرد و زن کے ایک ہی جرم پر ایک ہی سزا مقرر کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام رغبت جرم کو پیش نظر رکھتا ہے جس میں مرد و زن برابر ہیں اور اس کے ان عملی نتائج کو اسلام مدنظر نہیں رکھتا جن کے ظہور میں عورت کا کوئی دخل نہیں ہے اور جن سے محفوظ رہنے میں مرد کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ جبکہ اسلام نے اولاد کو یہ حق دیا ہے کہ ان کے ماں باپ پاکیزہ و پاکباز ہوں تو یہ حق اسی مساوات کے ساتھ مجرموں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ عورت، مرد کی پاک دامنی نہیں دیکھتی جبکہ مرد عورت کی پاک دامنی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ عورت اپنے آپ کو کسی ایسے صاحب قدرت مرد کو سپرد کر کے مطمئن ہو جاتی ہے جس نے عملی تجربے سے اپنی اس قوت کار اور قدرت کا اظہار کر دیا ہو۔ ساتھ ہی اسے تسکین نفس کا یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے ایک ایسے شخص کو حاصل کر لیا ہے جو دوسری عورتوں کی نظر میں اہمیت کا حامل ہے اس لیے کہ اس کا حسن زیادہ دلکش ہے اور اسے مرد پر بالادستی کی قدرت حاصل ہے۔ اس کے برعکس ایک ناتجربہ کار مرد عورت کے لیے آسان شکار ہوتا ہے۔ اس کے حصول میں نہ تو عورت کی مہارت ظاہر ہوتی ہے اور نہ اس کی اہلیت ثابت ہوتی ہے۔ مگر جوں جوں اس ناپختہ مرد کے تجربات بڑھتے جاتے ہیں اور وہ دوسری عورتوں سے بچ کر اپنی عورت کے دام میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اس سے اس کی دل کشی ثابت ہوتی ہے اور اس کی ذات کا اثبات ہوتا ہے۔ مگر اللہ ان امور کو زیادہ جانتا ہے جو عورت کے لیے مفید ہیں اور جو اس کے ساتھ بہتر سلوک کے ضامن ہیں اسی لیے اسلام نے دونوں صنفوں کو یکساں احکام دیے ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ

Marfat.com

وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ط (النور : ۳۰)

"آپ ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔"

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور : ۳۱)

"اور آپ کہہ دیجیے ایمان والیوں سے، کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔"

اسلام نے زناکار کو اس امر کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ کسی پاکباز عورت کو اپنی شریکِ حیات بنائے:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ج وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور : ۳)

"زانی نہ نکاح کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ نہ نکاح کرے مگر زانی یا مشرک کے ساتھ۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔"

گویا اس طرح عورت کو یہ ضمانت دی گئی ہے کہ جس مرد کو وہ اپنا آپ سپرد کر رہی ہے اس کا جسم، نفس اور ضمیر پاکیزہ ہے۔ اور مرد کو یہ ضمانت دی جاتی ہے کہ جس عورت کو وہ اپنی شریکِ حیات بنا رہا ہے اس کے ماضی میں ایسی کوئی آلائش نہیں ہے جس سے اس کے تصورات کو صدمہ پہنچے۔

غرض اس طرح اسلام نے فطرت انسانی کے تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مشاعر و جذبات کا معیار حیوانی سطح سے بلند کر دیا ہے۔

Marfat.com

ایک اعتراض

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کی بہ نسبت مرد زندگی سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ مرد باہر نکلتا ہے اور عورتوں کو حکم دے دیا گیا ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (الاحزاب: ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو"

اس اعتراض میں بھی مغالطہ پنہاں ہے۔ کیونکہ اگر مرد باہر نکل کر اپنے دوستوں سے ملتا ہے تو عورتیں بھی اپنی گھریلو ملاقاتوں میں اپنی سہیلیوں سے ملتی رہتی ہیں۔ اور اگر اس اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ مرد باہر نکل کر دوسری عورتوں سے روابط پیدا کرتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے تو یہ چیز اس وقت کہاں حاصل ہو سکتی ہے جب عورتوں کا زینت کے ساتھ باہر نکلنا ممنوع قرار دے دیا جائے؟ جب ہر عورت اپنے گھر اور اپنے شوہر کے لیے مخلص ہوگی تو باہر نکل کر مرد کو ایسی عورت کہاں سے ملے گی جس سے وہ لطف اندوز ہو سکے۔ مرد کو زائد تمتع تو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب عورت گھر سے باہر نکل آئے۔ مگر جب مرد و زن دونوں اسلامی احکام کے پابند ہوں تو دونوں اباحت اور حرمت میں بھی برابر اور مساوی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ خود گھر سے باہر نکلنا ایک ایسی سہولت سمجھی جائے جو مرد کو دی گئی ہے مگر عورت کو نہیں دی گئی، تو یہ بھی غلط ہے۔ اسلام نے عورت کا باہر نکلنا قطعاً ممنوع نہیں قرار دیا ہے اور نہ اس پر یہ پابندی لگائی ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کسی تفریح کے لیے نہ نکلے۔ بلکہ اصل ممانعت یہ ہے کہ وہ سنگھار کر کے باہر نہ نکلے اور اس لیے باہر نہ نکلے کہ غیر مردوں کو اپنے حسن دلفریب کا شکار بنائے۔ اس ممانعت

Marfat.com

کی حکمت بیان کی جا چکی ہے کہ خود عورت کے حق میں یہ بات ضروری ہے تاکہ خود اس کے شوہر کو ایسی کوئی عورت نہ اُچک لے جو حُسن اور دلفریبی میں اس سے زیادہ ہو۔ خواہ اس کا وہ واقعتاً شوہر ہو یا منگیتر ہو یا اس کا پیغام آیا ہوا ہو۔

بے پردہ عورت اور لُطف زندگانی

کچھ لوگ جو بُرائی کے شیدائی ہیں اور چاہتے ہیں کہ برائی کی اشاعت ہو وہ اپنے اس مقصد کو بسہولت حاصل کرنے کے لیے اور سماج کی ناراضگی اور قانون کی گزند سے بچتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر عورت کو بلا قید، آزادی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے تو زندگی پر لطف و دل کش ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اگر دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ زیادہ پُر لطف بھی ہوں گے اور دل کش بھی ہوں گے بہ نسبت اس کے کہ دسترخوان پر ایک ہی قسم کا کھانا رکھ دیا جائے۔ لیکن اگر صورت ایسی ہو کہ ہر گھر سے ایک کھانے کا برتن چُرا کر لایا گیا ہو اور دسترخوان پر سجا دیا گیا ہو تو جو شخص کسی دوسرے گھر کا چُرایا ہوا کھانا شوق سے کھا رہا ہو، اسے یہ بھی تو سوچنا پڑے گا کہ اس کے اپنے گھر کا کھانا کوئی اور اسی اشتیاق سے کھا رہا ہوگا۔ اگر اس کو یہی پسند ہے تو پھر ٹھیک ہے مگر اسے یہ ہرگز دھوکہ نہ ہونا چاہیے کہ ڈاکہ ہمیشہ وہی ڈالتا رہے گا اور اس کا گھر ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

یا یہ صورت ہے کہ یہ لوگ چوری نہ کریں بلکہ ہر شخص بخوشی اپنے گھر کا کھانا لا کر اس اجتماعی دسترخوان پر سجا دے اور پھر جس کا جس برتن میں جی چاہے منہ ڈال دے۔ اور یہ صورت وہی جنسی انارکی ہے جس سے آج کا بے قید مغربی سماج گزر رہا ہے اور جس کے بارے میں ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ اس سے وہ موہوم خوشی اور اطمینان بھی حاصل نہیں ہوتا جس کی یہ لوگ آرزو کرتے ہیں۔

Marfat.com

عادت اور زندگی

انسانی زندگی پر عادت بڑا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اگر زن و شوہر جائز حدود میں ایک دوسرے پر اکتفاء کرنے کی عادت ڈال کر اپنے ذہن سے اس کے علاوہ ہر ناجائز لذت کا تصور نکال دیں تو اسی ازدواجی زندگی میں وہ مکمل خوشی اور اطمینان محسوس کرنے لگیں اور ان کا احساس محرومی بالکلیہ مٹ جائے۔

ترجمہ: ـــــ بیع "نفس کو اگر رغبت دلائیں تو وہ راغب ہو جاتا ہے اور اگر اسے تھوڑی شے پر محدود کر دیں تو پھر اسی پر قناعت کر لیتا ہے"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کا سخت گیر نظام جو دونوں صنفوں کو جدا جدا رکھتا ہے اس سے اخفاء (Repression) پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مشرق اسلامی تمام کا تمام کچلے ہوئے جذبات کا حامل ہے کیونکہ مشرق میں مرد و زن باہم آزادانہ میل ملاپ نہیں کر سکتے۔

یہ نئی کہانی اس وقت تراشی گئی ہے جب عورت بن سنور کر بازار میں آگئی اور ہر مرد کی دسترس میں پہنچ گئی جب کہ اس کہانی کا اس وقت کوئی وجود نہیں تھا جب ہر مرد و زن شادی شدہ ہوتا اور جب وہ ایک دوسرے پر اکتفاء کیا کرتے مگر نہ ان کے جذبات کچلے جاتے اور نہ وہ محرومی کا احساس کرتے۔

مگر جب عورت فتنے جگانے کے لیے گھر سے باہر نکل آئی تو یقیناً اخفاء (Repression) بھی رونما ہو گیا، کیونکہ یہ فتنہ اسلامی تعلیمات کے زیر اثر تربیت پانے والے مسلمان کے دل میں ناجائز جذبات کو بیدار کرتا ہے۔
ناجائز اس لیے نہیں کہ ان کا تعلق جنس سے ہے، جبکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام جنس کا درجہ بلند کرتا اور اسے عبادت تک کا درجہ دے دیتا ہے ــ بلکہ ناجائز اس لیے کہ ان جذبات کا تعلق ناجائز اور مجرمانہ بُرائی اور بہیمائی

Marfat.com

سے ہے ـــــ اس لحاظ سے گھر سے باہر کی دنیا کے اس سرکش و بلاخیز فتنے اور گھریلو زندگی کی ممانعتوں کے درمیان کش مکش برپا ہو جانا ایک طبعی امر ہے، اور اس کش مکش کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ اسلام کی عائد کردہ یہ ممانعتیں غلط ہیں بلکہ ان کا سبب وہ بے قید روایات ہیں جو رواج پاگئی ہیں، اور جنھیں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس مسئلے میں حکم کا دار و مدار پراگندہ جذبات اور بے کراں خواہشوں پر نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کا دار و مدار اس صحیح علمی تحقیق پر ہونا چاہیے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی زیادہ صحیح ہے اور کونسی زیادہ فرد کے ذاتی وجود کے لیے مناسب ہے اور بالآخر اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ صحیح علمی تحقیق کے سامنے اگر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں اور وہ انسانیت کی تمام نسلوں کو پیش نظر رکھے تو اس کے پاس صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے۔ اور وہ حل وہی ہے جو آج سے چودہ صدی قبل اسلام نے پیش کیا تھا اور جو آج بھی انسانیت کے لیے واحد راہ نما ہے۔

"پاکیزہ اختلاط"

اسلام چونکہ جنسی تلذذ کو صرف ازدواجی صورت میں محدود کر دیتا ہے۔ اس لیے یہاں غیر شادی شدہ نوجوانوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے جو بجائے خود ایک اہم مسئلہ ہے اور جس قدر تہذیب مغرب کی اجتماعی اور اقتصادی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر اس مسئلے کی گرہیں بڑھتی جاتی ہیں۔ مغرب کے ماہرین نفسیات و اجتماعیات مسلسل اس مسئلے کے حل کی تلاش میں لگے رہے ہیں۔ مگر چونکہ مغرب مسلسل پستی کی جانب بڑھ رہا تھا اس لیے اس مسئلے کا بھی ایک غلط حل سوچا گیا اور پھر اس حل کو بھی بے حدود و قیود چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ غیر شادی شدہ نوجوان، لڑکے اور لڑکیاں باہم پاکیزگی کے ساتھ ملیں جلیں چنانچہ اس نصیحت پر عمل شروع کیا گیا اور اس کی انتہا مکامل جنسی اباحیت

Marfat.com

اور انارکی پر ہوئی کیونکہ یہی اس کا لازمی نتیجہ تھا۔

مغرب نے اپنے دور اباحیت کی ابتداء میں جنسی انفجار کے علاج کے لیے "پاکیزہ اختلاط" کا فلسفہ تراشا تھا اور نفسیات و اجتماعیات کے ماہرین ایک عرصے تک اسے سراہتے رہے اور اس کے فوائد بیان کرتے رہے۔ مگر بالآخر مغرب نے اس ڈھکوسلے کو رد کر دیا اور اب اس کے طبعی نتائج سامنے آنے کے بعد وہاں کوئی اس کا نام تک نہیں لیتا۔

اب ماہرین نفسیات اور اعصابی امراض کے ڈاکٹر بھی اپنی اس رائے سے رجوع کر چکے ہیں اور وہ بھی یہ سمجھ چکے ہیں کہ زبانی طور پر پاکیزہ اختلاط کا نام لینے اور والدین اور اساتذہ کی زیر نگرانی رقص و موسیقی کے پروگراموں اور چائے کی محفلوں میں اختلاط کی اجازت دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر اختلاط جنسی جذبات کو سُلاتا نہیں ہے بلکہ جگاتا ہے۔ اگر ان اجتماعی حالات کی بناء پر جو ان جذبات کی عملی تنفیذ کی اجازت نہیں دیتے، یا حیاء و شرم اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے بھوکا پیاسا ظاہر کیا جائے یا کسی اور وجہ سے ان جذبات کا اظہار نہ ہو اور انھیں وقتی طور پر سُلا دیا جائے تو اس طرح مخلوط پارٹیوں سے جو تھوڑی سی طمانیت ملتی ہے، اس سے وقت گزرنے کے بعد ایک قسم کا نفسیاتی اور اعصابی اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دو صورتیں ہیں۔ یا تو نوجوان اپنی بھڑکی ہوئی توانائی کے اخراج کے لیے کسی ایسی دوسری جگہ متوجہ ہوں گے جہاں رُکاوٹیں کم ہوں۔ یا ان کا اضطراب ان کے اعصاب کو تباہ کرتا رہے گا۔ بلکہ بعض اطباء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بغیر نکاسی کے مسلسل جذبات کی برانگیختگی نوجوان میں ایک دائمی نفسیاتی تڑپ کے ساتھ ساتھ اسے جنسی اور اعصابی کمزوریوں کا شکار بنا دیتی ہے۔

غرض "پاکیزہ اختلاط" کے ذریعے جنس کو مہذب کو بنانے کی کہانی،

Marfat.com

ایک فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے اگر ایک نوجوان ایک مخصوص لڑکی سے مہذب رویہ اختیار کرے مگر دوسرے مقام پر وہ حیوانیت اختیار کرے تو اس تہذیب کا کیا فائدہ؟ یا یہ نوجوان پیہم جذبات کی تپش اور جسم کی حدت محسوس کرتا رہے تو اس تہذیب جنسی کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے کہ جو لڑکی ایک نوجوان کو مہذب بنا رہی ہے اور خود اس کے ساتھ رہ کر درس تہذیب حاصل کر رہی ہے وہ کسی وقت کسی اور نوجوان کے جال میں پھنس جائے اور وہ نوجوان خود بھی پہلے "درس تہذیب" حاصل کر چکا ہو مگر اب وہ اپنی پیاس بجھانے نکل کھڑا ہو۔

یہ تو ایک مذاق ہے ...... اور مغرب خود اس مذاق کو رد کر چکا ہے ...... اب وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ "پاکیزہ اختلاط" قابل نفاذ اور ممکن امر ہے! اب انھوں نے پردہ اٹھا دیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اب مغرب کے نوجوان کمال بے حیائی کے ساتھ ایک دوسرے کی آغوش میں جا سکتے ہیں۔

اب بے چارا مشرق اس کہانی کو لے کر بیٹھا ہے جس کا دنیا میں کبھی کوئی وجود ہی نہیں پایا گیا۔ اب یہاں مصنفین اور اہل قلم اس پاکیزہ اختلاط کی تلقین کر رہے ہیں جس کو کب کا رد کیا جا چکا ہے۔ ان مصنفین اور اہل قلم کو چاہیے کہ اپنی 'تحقیقات' میں تبدیلیاں کر کے اپنی تصنیفات کے نئے ایڈیشن شائع کرائیں ..... کیونکہ ان کتابوں کے سابقہ ایڈیشن اب حسب حال (up-to-date) نہیں رہے ہیں۔

اسلام چونکہ طبیعت انسانی سے آشنا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں سے واقف ہے، اس لیے اسلام جانتا ہے کہ یہ "پاکیزہ اختلاط" دو قدم بھی پاکیزہ نہیں رہ سکتا ..... چنانچہ اسلام نے اختلاط کی ممانعت کی ہے۔

Marfat.com

اسلام نے دائرہ نکاح میں رہتے ہوئے معقول تلذذ کی اجازت دی ہے، مگر دائرۂ نکاح سے باہر ہر لطف اندوزی کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کا مقصد جذبۂ حکمرانی کی تسکین نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے اور انھیں نفسیاتی اور اعصابی راحتوں کے اسباب کی فراہمی ہے۔ اگر پرجوش نوجوان اس فائدے کو فوری طور پر محسوس نہ کرسکیں کیونکہ ان کے سامنے وہ عمیق گھاٹی نہیں ہے جو اس راہ کے آخر میں آتی ہے تو جو لوگ اس گھاٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں ان پر تو لازم ہے کہ وہ نوجوانوں کو اس راہ پر چلنے سے روکیں۔

Marfat.com

اسلام میں نوجوانوں کے مشاغل

مسیحی دنیا میں لوگوں کا اصل مسئلہ جسمانی سے زیادہ نفسیاتی اور اعصابی ہے۔ انھیں جس بیماری کا علاج درکار ہے وہ، وہ نفسیاتی اخفاء (Repression) ہے جس کو وہ اہلِ مذہب کی زبانی اور دینی کتابوں کے واسطے سے ملنے والی مسیحی تعلیمات کے زیر اثر انگیز کرتے رہتے ہیں۔ مگر جس طریقے سے انھوں نے اس نفسیاتی اخفاء کا علاج کیا اس سے وہ نفسیاتی اور اعصابی سلامتی کے حصول میں بالکل ناکام رہے ہیں اور اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کہ ان کی دائمی بھوک اور مسلسل تڑپ میں مزید اضافہ ہو گیا اور بے چینی اور اضطراب کے مارے بھی بے شمار ہو گئے۔ اور اب، بالخصوص امریکہ میں، ان گنت افراد روزانہ نفسیاتی کلینک کی جانب رجوع کرتے ہیں — اور امریکہ ہی وہ ملک ہے جس نے اس مثالی حل کو پوری طرح اپنے سماج پر منطبق کیا ہے۔

اسی مقام پر آکر اسلام کا امتیاز واضح ہوتا ہے — اسلام نے نہ تو جنسی جذبات پر کوئی قدغن لگائی ہے نہ انہیں گندہ اور نجس خیال کیا ہے اور نہ ان احساسات کے حامل افراد کو راندۂ درگاہ قرار دیا ہے، بلکہ پہلے تو اسلام نے اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ یہ جذبات فطری اور واقعی ہیں اور پھر ان جذبات کو احساس مسلم میں پاکیزگی عطا کر کے اس قدر بلندی اور رفعت عطا کی کہ اسے عبادت سے ملا دیا اور بسم اللہ سے اس کے آغاز کی تلقین کی۔

اس اخفاء کے نہ ہونے کی بناء پر نفسیاتی کش مکش میں بڑی حد تک تخفیف ہو گئی۔ مگر یہ کش مکش بالکلیہ ختم نہیں ہوئی، کیونکہ نوجوان تو پھر

Marfat.com

بھی جسمانی دباؤ اور اس تصور کے درمیان اُلجھا رہا کہ اس جذبے کی عملی تسکین نکاح تک ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ممانعت وقتی ہے اور اس ممانعت کا کچھ عرصے تک کے لیے ہونا اعصابی دباؤ میں بڑی حد تک کمی کر دیتا ہے مگر بالکلیہ زائل نہیں کرتا۔

اس عرصے کے لیے اسلام نے نوجوانوں کو کچھ مشاغل دیے ہیں تاکہ وہ اپنے جسم اور نفس کی گھٹی ہوئی قوتوں کا اخراج کر سکیں۔ چنانچہ نوجوانوں کو شاہسواری اور جہاد کی تلقین کی گئی۔ اس طرح جذبات کو سنوار کر اور پاکیزہ بنا کر مرد کو مستقبل کی پاکیزہ جدوجہد کے لیے تیار کیا گیا تاکہ وہ اپنی جسمانی طاقت کو بروئے کار لا کر اپنے نفس کی محبوس توانائیوں کا اخراج کر سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور اس مسئلے میں فرائڈ سے بھی استشہاد کر چکے ہیں۔ آج کل کے نوجوان چونکہ اپنے بیشتر اوقات تعلیمی اداروں میں گزارتے ہیں تو ان کے لیے شاہسواری کی جگہ جسمانی ورزش اور فوجی تربیت لازمی ہے اگرچہ مصری اسکولوں میں اس قسم کی کوئی بات سنجیدگی اور اہتمام سے نہیں ہوتی بلکہ مصری اسکولوں میں تعلیم اور امتحانات بھی صحیح طریقے پر نہیں ہوتے۔

لڑکی کے لیے گھریلو تربیت ضروری ہے تاکہ وہ گھر کی مالکہ کی حیثیت سے مستقبل کے لیے تیار ہو سکے اور اس کے افکار براہ راست جنسی خیالات سے دُور ہو کر خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں ضم ہو سکیں اور اس طرح بغیر کسی اعصابی دباؤ کے حدت جسمانی کا اخراج ہو سکے — اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تعلیمی ادارے لڑکیوں کو کیمسٹری، الجبرا، حساب اور انجینئرنگ کی تعلیم دے کر کس قدر گناہ عظیم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں "تدبیر منزل" جیسے کسی مضمون کا نام و نشان تک نہیں ہوتا حالانکہ گھریلو تربیت کا موضوع ایسا ہے کہ اس میں لڑکیوں کے تمام

Marfat.com

اوقات اور توانائیاں صرف ہونی چاہییں، اس کا محض سرسری تعارف نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس تربیت کے ذریعے لڑکیوں کے میلانات کو صحیح رُخ دینا چاہیے نہ یہ کہ انھیں ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اپنی اصل طبیعت کو فراموش کر کے مردانگی اختیار کر لیں۔ گھریلو تربیت کے موضوع کو مکمل کر لینے کے بعد پھر لڑکیاں اگر چاہیں تو مزید دیگر علوم حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر آج کل لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جس کا ان کی نسوانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جس سے گھُٹی ہوئی جسمانی قوت کا اخراج نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایسی انگیختگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے اعصاب مضمحل ہو جاتے ہیں اور لڑکی اپنے گھٹے ہوئے جذبات کو لے کر سڑکوں پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ تاکہ اس پر لوگوں کی پُراشتیاق و پُرحسرت نظریں پڑیں اور وہ بالآخر اس ڈھلوان گزرگاہ پر چلتی ہوئی کسی کھائی میں جا گرے۔

غیر طبعی ہیجانات سے پاک معاشرہ

اسلامی معاشرے میں غیر طبعی اور سخت ہیجان انگیز امور نہیں پائے جاتے۔ اسلامی معاشرے میں برہنہ تصاویر نہیں ہوتیں، ننگی صحافت نہیں ہوتی، ایسے اخلاق باختہ اہل قلم نہیں ہوتے جو نوجوانوں کا اخلاق تباہ کر کے روزی کماتے ہیں، وہ ایکٹر اور تاجر نہیں ہوتے جو لوگوں میں حیوانی جذبات بھڑکا کر دنیا کماتے ہیں، نیم عریاں اور عریاں فلمیں نہیں ہوتیں، وہ بے حیائیوں کا مرکز رقص گاہیں نہیں ہوتیں، جہاں دفن، دفن، پکار کر مریضانہ خواہشوں کی بولی بولی جاتی ہے، عزتوں کا نیلام کیا جاتا ہے اور برہنہ جسموں کا سودا چکایا جاتا ہے۔

اسلامی سماج میں چونکہ اس قسم کی ہیجان انگیز باتیں نہیں ہوتیں اس لیے اس سماج میں لوگوں کی حدتِ شہوت بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

اسلام جو اخفاء (Repression) سے بچاؤ کر کے اور عرصۂ ممانعت کو

Marfat.com

محدود کر کے نوجوانوں کو ایسے اُمور میں مصروف کر دیتا ہے جس سے ان کی قوتوں کا اخراج ہو جاتا ہے، ان کے افکار تبدیل ہو جائیں اور جو اعصاب کو تباہ کرنے والے دواعی (Stirrings) کو ختم کرتا ہے، وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آشنا ہے کہ یہ وقتی تدارک ہے، اصل علاج نہیں ہے۔ اسی لیے وہ شادی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور نوجوانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ جلد شادی کریں اور اس نعمت کے حصول میں تاخیر نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ جنس کا حقیقی حل ازدواج ہے اور اس کے سوا انسانیت کسی اور حل سے آشنا نہیں ہوتی ہے۔ ازدواج سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، محدود توانائی کا اخراج بھی ہو جاتا ہے، برانگیختہ خواہش بھی پُر سکون ہو جاتی ہے، انسان معیارِ حیوان سے بلند ہو جاتا ہے، اس کے سامنے انسانیت کے مقاصد بلند بھی آجاتے ہیں، اس کے جذبات و افکار صرف دائرہ جنس میں گھومتے رہنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے انسان آمادۂ عمل بھی ہو جاتا ہے۔

جلد نکاح کی تلقین

اسی لیے اسلام جلد شادی کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اسلامی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ اس کے مختلف ادوار میں نکاح، مسئلہ جنس کا اس قدر کامیاب حل ثابت ہوا ہے کہ لوگ ارتکابِ جرم پر مجبور نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سب ہی لوگ مطمئن اور آسودہ تھے اور کوئی بھی تشنگی اور اخفاء کا شکار نہیں تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا، جرمِ زنا سے خالی نہیں ہو سکتی اس لیے معاشرے اور قانون کو اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کے وجود کا اعتراف کر کے اس کی تنظیم اور نگرانی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ان میں سے کچھ لوگ اہل قلم بھی ہیں جنھیں کسی اسلامی ملک میں دعوتِ جرم دیتے ہوئے ذرا

Marfat.com

بھی شرم نہیں آتی، بجائے اس کے کہ وہ اس کا صحیح حل تجویز کرتے۔

مگر اسلامی تاریخ ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کرتی ہے ـــــ بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی جرم بالکل نابود نہیں ہوگیا تھا۔ مگر کیا اس بات میں کوئی فرق نہیں ہے کہ کسی معاشرے میں جرم شاذ و نادر کبھی واقع ہو جائے اور سب لوگ اسے بُرا سمجھیں اور کسی سماج میں جرم معمولی بات بن جائے اور کوئی اسے بُرا نہ کہے بلکہ جرم سے باز رہنا ہی تعجب و حیرت کا باعث بن جائے۔

دَورِ اوّل کے مسلمان بھی فرشتے تو نہ تھے مگر ان کی غالب اکثریت جرمِ زنا سے گریز کرتی تھی۔ اس لیے کہ اسلامی معاشرے میں ارتکابِ جرم کے محرکات موجود نہیں تھے اور لوگ چونکہ جلد شادی کر لیتے تھے اس لیے محرومی کا احساس نہیں تھا۔

اسلام لوگوں کو صرف وعظ و نصیحت کرنے کے بجائے لوگوں کے مسائل کا عملی حل پیش کرتا تھا، پھر اس کے بعد اس عملی حل کو اپنانے کی نصیحت کرتا تھا تاکہ مطلوبہ نتائج برآمد ہو سکیں ـــــ مگر آج یہی حال ان لوگوں کی نظروں میں ایک امر محال نظر آتا ہے جو صرف انہی امور پر غور کر سکتے ہیں جو ان کے سامنے ہیں اور جو اُس نسل سے متعلق ہیں جس میں وہ خود رہ رہے ہیں ـــــ

ان کے سامنے بیشتر دنیا میں پھیلا ہوا ایک ایسا پیچیدہ اقتصادی نظام ہے، جو تعلیم و تجربے کی طویل راہوں سے گزرنے کے بعد ایک شخص کو یہ موقعہ فراہم کرتا ہے کہ وہ برسرِ روزگار ہو سکے، اور اس کے بعد بھی اس کی آمدنی اس قدر محدود ہوتی ہے جو صرف اس کی اپنی ضرورتوں کو کافی ہو سکتی ہے اور اس میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس سے انسان اپنا گھر آباد کر سکے اور بڑھتی ہوئی ذمے داریوں کو پُورا کر سکے۔

ان کے پیشِ نظر دشوار گزار پیچ در پیچ تعلیمی نظام ہے، جس سے طالبعلم

Marfat.com

جلد فراغت حاصل نہیں کر پاتا بلکہ اگر وہ کوئی قابل قدر ڈگری حاصل کرنا چاہیے تو اسے عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ تعلیم میں کھپانا پڑتا ہے۔ پھر اس انتھک محنت اور طویل جدوجہد کے بعد اسے ایک معمولی سی ملازمت میسر آتی ہے۔ اور نظام تعلیم کی پیچیدگیاں کسی طالب علم کو اتنی بھی مہلت نہیں دیتیں کہ وہ دورانِ تعلیم بھی کوئی آمدنی حاصل کر سکے۔

ان تمام اُمور کے پیشِ نظر یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نوجوان بیک وقت تعلیم بھی حاصل کرے اور ازدواجی زندگی بھی گزارے۔ اس لیے جب تک وہ تعلیم سے فارغ نہ ہو جائے اس وقت تک تو شادی مؤخر کرنا لازمی ہے۔ پھر تعلیم سے فراغت کے بعد بھی جب تک لڑکا برسرِ روزگار نہ ہو جائے اور اس کے پاس اس قدر پیسے نہ جمع ہو جائیں جنھیں وہ اپنی شادی پر خرچ کر سکے کیسے شادی ممکن ہے؟ پھر بھی مناسب یہی ہے کہ شادی سے قبل نوجوانوں کو کچھ تجربہ حاصل ہو جائے، انھیں اچھے بُرے کی تمیز ہو جائے، ذمے داریوں کے برداشت کرنے کا سلیقہ آجائے اور تربیت اولاد کے ڈھنگ سے واقف ہو جائیں۔

ان تمام مسائل کا حل یہی ہے کہ نوجوانوں کو شادی کے علاوہ دوسرے طریقوں پر جنسی تقاضے پورے کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ورنہ تو ان بے چاروں کے اعصاب تباہ ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ہماری تنگ نظری اور سخت دلی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس مذہب کی خاطر جو دورِ جدید کے اجتماعی اور اقتصادی انقلابات سے ہم آہنگ نہیں ہے نوجوانوں پر پابندیاں لگائیں۔ بلکہ اگر ہمیں آزادیٔ فکر پر قائم رہنا ہے تو ہمیں اس بُرائی کی اجازت دینا ہی ہوگی، ورنہ یوروپ ہمیں پس ماندہ ہونے کا طعنہ دے گا۔ خواہ یوروپ خود قانونی بدکاری کو بُرا سمجھنے لگا ہو اور اس کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو۔

Marfat.com

اسلام، مکمل ضابطۂ حیات

یہاں پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام ایک مکمل اور مربوط ضابطۂ حیات ہے، اور اسلام اپنے مخصوص نہج پر اور اپنے مخصوص مقاصد کے تحت ایک معاشرہ تشکیل دیتا ہے، جس کو وہ چلاتا اور اس میں ابھرنے والے مسائل کا حل پیش کرتا ہے ــــ جب تک لوگ اسلام کو پورا کا پورا نہ اپنا لیں اور اس کے زیر سایہ زندگی گزارنا نہ شروع کر دیں، اسلام کی کوئی ذمے داری نہیں ہے کہ دوسرے نظام ہائے حیات کے ماتحت زندگی گزارتے ہوئے جو مسائل ابھرے ہیں اسلام ان کا بھی حل پیش کرے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کامل مغربی اور مادی نظام کے ایک عضوِ فاسد کو کاٹ کر ہم اس کی جگہ اسلام کا ایک جزء لا کر فٹ کر دیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسا کرنا درست نہیں ہے بلکہ اگر ایسا کیا گیا تو بجائے سنورنے کے مزید خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے نہیں کہ اسلام کا جو جزء لیا گیا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس لیے کہ جہاں اس جزء کو نصب کیا جا رہا ہے وہ اس کے نصب کرنے کا مقام نہیں ہے اور یہ اس ڈھانچے سے ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے مقاصد میں اور طریقے میں بنیادی طور پر مختلف ہے۔

اگر آپ کی گھڑی کا کوئی پرزہ ٹوٹ جائے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی بھی ساخت کی گھڑی کا پرزہ اس میں لگا دیں خواہ وہ کتنا ہی عمدہ اور مضبوط کیوں نہ بنا ہوا ہو، بلکہ یہی ہو گا کہ یا تو آپ گھڑی تبدیل کر دیں یا جس ساخت کی آپ کی گھڑی ہے اسی ساخت کا اس میں پرزہ لگوائیں۔
اب اگر مغرب سے آیا ہوا کوئی غیر اسلامی نظامِ اقتصاد فرسودہ ہو گیا اور اس کی فرسودگی اور ابتری پورے معاشرے اور معاشرے کے اخلاق میں سرایت کر گئی ہے اور اس ابتری کی بناء پر شادی میں عجلت کا

Marfat.com

اسلامی حکم قابلِ عمل نہیں رہا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام اب دورِ جدید کی زندگی میں منطبق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک ایسا حکم صادر کرتا ہے جو اس ابتر اقتصادی نظام میں ممکن العمل نہیں ہے۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ اس غیر اسلامی اقتصادی ڈھانچے میں اسلامی طور طریقے رواج نہیں دیے جا سکتے اس کے بجائے اگر ہم مطمئن ہو گئے ہیں کہ طریقۂ اسلام ہی درست ہے تو ہمیں پورا اسلامی معاشرہ وجود میں لانا چاہیے۔ زندگی کے ہر معاملے کو اسلام کی روشنی میں درست کرنا چاہیے اور ہر شے کو ٹھیک طریقے پر اس کی جگہ پر رکھنا چاہیے تاکہ وہ صحیح طریقے پر اور نتیجہ خیز طور پر اپنا پورا کردار بہتر طور پر انجام دے سکے۔

تھڑدلے لوگوں اور فرزندانِ غلامی کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ اقتصادی ڈھانچوں میں بھی کوئی تبدیلی آ سکتی ہے یا انھیں ختم کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے جس نے سابقہ اقتصادی اور اجتماعی نظام کو تبدیل کر کے اس کی جگہ بالکلیہ ایک نیا نظام استوار کیا۔ (اگرچہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق اس نے مادی اساس میں کوئی تبدیلی نہیں کی، جیسا کہ ہم "اشتراکی نقطۂ نظر" میں بیان کر چکے ہیں۔) جب اشتراکیت کو اس نئے تغیر میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور اس نے نئی ریاست کی تشکیل کے ساتھ لوگوں کے فکر و نظر کے زاویے تک تبدیل کر ڈالے تو اسلام تو انقلاب کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے، اس پر تو لوگ دل سے ایمان لاتے ہیں، اس کی جانب تو اشتیاق سے بڑھتے ہیں، وہ تو خود فکر و نظر کے ہر زاویے کو بدل ڈالتا ہے۔ اس لیے اسے یہ بھی قدرت حاصل ہے کہ وہ اجتماعی اور اقتصادی نظام کو بھی بدل ڈالے۔ کیونکہ وہ اپنی تنظیمات اور اپنے قوانین کے ساتھ ساتھ اپنے عقیدے کے ذریعے نفوسِ انسانی میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

اسلامی نظام میں جلد شادی کرنے کی سہولتیں

جب مکمل اسلامی نظام قائم ہوگا تو اس کے تحت جلد شادی کا مسئلہ بھی بالکل طبعی طریقے پر حل ہو جائے گا اور اس میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ مغرب کا مادی نظام جو جذبات محبت کو سُلا کر انانیت کو ہوا دیتا ہے وہ ایک ہی خاندان کے افراد میں اس قدر مطلب پرستی پیدا کر دیتا ہے کہ ایک مدت کے بعد باپ کو بھی یہ حوصلہ نہیں رہتا کہ وہ اولاد پر مزید خرچ کرے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین کے خوشحال ہونے کے باوجود بچے خود کفالتی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نظام میراث بھی ابتر ہے۔ اس نظام میں صرف ولد اکبر وارث ہوتا ہے اور باقی اولاد محروم رہتی ہے۔

اسلامی نظام تو اخوت و محبت اور باہمی تعاون کا نظام ہے یہ نظام باپ اور اولاد کے درمیان سونے کی دیوار نہیں تعمیر کرتا، یہ والدین کو نہیں روکتا کہ وہ اپنے بچوں پر خرچ کریں جب تک کہ وہ اطمینان کے ساتھ کمانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس کے بالمقابل والدین کا اولاد پر بھی حق ہے کہ جب وہ بڑھاپے میں کمائی سے عاجز ہو جائیں تو اولاد ان کے اخراجات برداشت کرے۔ بغرض اسلام میں والدین اور اولاد اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں نوجوانوں کا اپنے اخراجات کا کفیل نہ ہونا، جلد شادی کرنے میں حارج نہیں ہے۔ کیونکہ انھیں ان کے والدین کی اعانت اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو جائیں۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح اولاد ماں باپ پر بھروسہ کرنے لگے گی اور عملی جدوجہد سے گریز کرے گی تو یہ ایک خیالی بات ہے جس کا امر واقعی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ خیال اہم نفسیاتی عوامل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ نوجوانوں کے لیے یہ

Marfat.com

بات بہت پسندیدہ ہوتی ہے کہ وہ خود کمائیں خواہ ان کے والدین دولتمند ہی کیوں نہ ہوں۔ جو لوگ دیہات جاتے رہتے ہیں وہ پیداوار جمع کرنے میں بچوں اور نوجوانوں کا مقابلہ دیکھتے رہتے ہیں، ان بچوں کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی رقم حاصل کریں۔ اس عمل سے گریز صرف بہت زیادہ امیروں کے بچے کرتے ہیں جبکہ اسلام تعیش کو سخت ناپسند کرتا اور اسے جرم، مستلزم سزا سمجھتا ہے۔

اسلامی نظام میں ایسی تنگدستی کسی پر نہیں آتی کہ جس کی لپیٹ میں آکر کوئی نوجوان شادی نہ کر سکے اور اس کے والدین اس پر خرچ نہ کر سکیں۔ کیونکہ اسلام تقسیم دولت کا ایسا نظام تشکیل دیتا ہے جس سے تمام افرادِ معاشرہ میں اقتصادی انصاف جاری ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ صاحب امر کو اس قدر وسیع اختیارات دیتا ہے کہ حضرت عمرؓ یہاں تک ارادہ ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کی زائد دولت لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیں گے اور معاشرے میں جو عدم توازن کا رجحان پیدا ہو گیا ہے اسے ختم کر دیں گے۔

ایسے تنگ دست لوگ جو گھریلو اخراجات پر قادر نہ ہوں، ان کے اخراجات شادی، اسلامی نظام میں بیت المال کے ذمے ہوتے ہیں، یا یہ کہیے کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمے دار ہوتی ہے کہ کم مایہ لوگوں کو شادی کے سلسلے میں مالی تعاون دے۔ تاکہ اس سے سماج کو متوقع اجتماعی اور اخلاقی نقصان سے بچایا جا سکے۔

غرض اسلامی نظام میں کوئی اقتصادی مسئلہ شادی میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

ان تمام حقائق کے باوجود ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہم امریکہ میں ہیں۔ امریکی باپ سیکنڈری اسکول کے بعد اپنے لڑکے یا لڑکی کی کفالت نہیں کرتا، اور ظاہر ہے کہ حکومت بھی شادی کے سلسلے میں کوئی تعاون نہیں کرتی۔ ہوتا

Marfat.com

یہ ہے کہ نوجوان پرائمری تعلیم کے بعد کوئی نہ کوئی کام تلاش کر لیتے ہیں تاکہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ اور جب وہ اپنی ثانوی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں تو گھر سے ان کا ہر قسم کا مالی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر انھیں مزید کمانا پڑتا ہے تاکہ وہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں اور اپنے اخراجات بھی پورے کریں۔ امریکہ کے نظام تعلیم میں بہر حال اس قدر گنجائش ہے کہ طلبہ تعلیم بھی حاصل کرتے رہیں اور اپنی کفالت بھی کرتے رہیں۔ ٹائم ٹیبل، اسباق اور طریقۂ امتحان اس طرح ترتیب دیے گئے ہیں کہ طالب علم بلا کسی دقت کے پڑھتے رہیں اور اپنے اخراجات کی کفالت کے لیے کوئی نہ کوئی کام بھی کرتے رہیں۔

جب دنیا کے ایک ملک میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہمارے اوپر یہ کس نے فرض کر دیا ہے کہ ہم انگلستان و فرانس سے لیے ہوئے فرسودہ نظام تعلیم پر قائم رہیں اور اسی کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں؟

نکاح جلد کرنے پر چند شبہات

اقتصادی اور تعلیمی مسائل کے بعد اب نفسیاتی مسئلہ لیجیے:۔

کہا یہ جاتا ہے کہ نوجوان بیک وقت تعلیم اور ازدواجی زندگی نہیں جاری رکھ سکتے۔ مگر کیوں؟ امریکی نوجوان تعلیم بھی حاصل کرتا ہے اور اپنی کفالت بھی کرتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے، اس کے علاوہ نوجوان لڑکیوں سے تعلقات عشق بھی استوار کرتا ہے اور پھر حیوانی طریقے پر جنسی تقاضے بھی پورے کرتا ہے ــــ شادی میں ان تمام کاموں سے زیادہ کیا بات باقی رہ جاتی ہے سوائے احساس کی پاکیزگی اور ضمیر کی طہارت کے۔

یہ پختگی والا مسئلہ بھی خوب ہے۔ خاندان میں رہتے ہوئے

Marfat.com

نوجوانوں کو ذہنی پختگی سے کون روک دیتا ہے؟ یا پختگی صرف گھر سے باہر کی زندگی ہی میں آسکتی ہے؟ اور کیا جو انسانی نسلیں جلد شادی کرتی رہی ہیں، ان میں لوگوں میں پختگی نہ آتی تھی اور تاریخ نے جو عظیم لیڈر پیدا کیے ہیں ان میں پختگی نہ تھی؟

ایک کھوکھلا دعویٰ اور باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ نوعمری کی شادی حوادث کی نذر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب میاں بیوی میں پختگی آتی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے مطابق نہیں ہیں اور ان میں پوری طرح ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس قدر تاخیر کی جائے کہ میاں بیوی میں معاملات کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور پھر انھیں موقع دیا جائے کہ وہ بڑی باریک بینی سے دیکھ بھال کر اپنا شریک حیات منتخب کریں۔

اس دعوے کی اہمیت اس وقت تو ہو سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ باریک بینی سے دیکھ بھال کے بعد جب شریک زندگی کا انتخاب کیا جاتا ہے تو اس وقت میاں بیوی میں اچھی مفاہمت ہوتی ہے اور اس شادی کو زیادہ استقرار اور استقلال حاصل ہوتا ہے مگر صورت حال تو یہ ہے کہ ان اسباب اور محرکات کے زیر اثر جو ہم اس باب میں بیان کر چکے ہیں اس قسم کی شادیاں اکثر ناکام ہوتی ہیں اور مجنونانہ طور پر طلاقیں دی جاتی ہیں۔

بدترین نتیجہ یہی تو ہو سکتا ہے کہ پختگی کے بعد میاں بیوی علیحدہ ہو جائیں اور دوسری شادی کر لیں۔ مگر دیکھیے کہ اعداد و شمار کیا کہتے ہیں۔ اعداد و شمار تو یہ بتاتے ہیں کہ مصر کے دیہات میں جہاں نوعمری کی شادیاں ہوتی ہیں وہاں طلاق کی شرح امریکہ کی شرح طلاق سے بہت کم ہے جبکہ امریکہ میں باریک بینی سے دیکھ بھال کر کے شریک زندگی منتخب کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

کچھ لوگ اسلامی معاشرے کے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں کہ شاہراہوں پر حسن کے فتنے نہ رہیں گے۔ لوگ پاک باز ہو جائیں گے تو کوئی گندگی نہیں رہے گی۔ تو پھر جن لذتوں میں وہ آج منہمک ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گی — سوچ کی یہ لہر اس لیے آتی ہے کہ یہ حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے موجودہ جذبات و خواہشات، موجودہ مشاغل، طرز زندگی اور مقاصد حیات کو لے کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے — اور اسلام میں داخل ہو کر بہت سی لذتوں اور پر لطف باتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ جب لوگ اسلام میں داخل ہوں گے تو گویا ایک نئی مخلوق بن کر داخل ہوں گے، اسلام انھیں یکسر تبدیل کر دے گا۔ اسلام انھیں نئے نفوس عطا کرے گا۔ ان نفوس میں نئے جذبات و تصورات ہوں گے، نئے اسالیب حیات ہوں گے، زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ نئے ہوں گے اور مقاصد زندگی نئے ہوں گے — اور یہ سب اسلام کے مخصوص نظام سے ہم آہنگ ہوں گے — جب اسلام میں داخل ہو کر لوگ ایک نئی مخلوق کے قالب میں ڈھل جائیں گے تو انھیں اس مادی نظام زندگی کی نجس لذتوں کے چھوٹ جانے پر محرومی کا احساس نہ ہوگا، بلکہ وہ ان لذتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اپنے آپ کو اس پستی سے بہت بلند خیال کریں گے۔

غرض مسئلہ جنس کا صحیح اور مکمل حل اسلام ہی پیش کرتا ہے۔ اور ایسا حل پیش کرتا ہے جس میں اعصاب بھی پرسکون رہیں، معاشرہ بھی ارتکابِ جرم سے محفوظ رہے اور ایسی نفسیاتی اور شعوری فضا پیدا ہو جائے جس میں انسان دنیاوی تقاضوں سے بلند ہو کر انسانیت کے مقام و مرتبے کے مناسب، مقاصد زندگی حاصل کر سکے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے انسان کو تمام مخلوقات میں مکرم و معزز اسی لیے بنایا ہے کہ وہ کائنات میں اپنی سیادت اور خلافت کے فرائض انجام دے سکے۔

Marfat.com

اقدارِ عالیہ

فرض کیجیے اگر انسان نفس کی ان تاریکیوں میں پھنس جائے جن میں فرائڈ اسے پھنسانا چاہتا ہے..... یا تجربی نفسیات کی تجربہ گاہ میں پہنچ کر انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے...... یا مادی اور اقتصادی مذہب کی اتباع کرتے ہوئے انسان یہاں تک پہنچ جائے کہ اس کے سامنے پراگندہ انسانیت کو مشین حرکت دے رہی ہو اور اقتصادی روح اس کے جسم مردہ میں پھونکی جا رہی ہو اور انسان کا کوئی لمحہ دنیاوی قید اور دنیائے ضرورت سے آزاد نہ ہو..... اگر انسان ان پست معیاروں پر اتر آئے تو اس کا سر چکرا جائے، اس کا جی متلانے لگے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ کیا نفس اسی کا نام ہے؟ اور کیا اسی پستی کو اور حیوانی ضرورتوں کی غلامی کو نفس کہتے ہیں؟

یا یہ چند اباحیت پسند، کم ظرف اور بے ضمیر لوگوں کا ساری انسانیت پر بہتان ہے۔ اور اس بہتانِ عظیم سے ان کا منشا یہ ہے کہ وہ خود اپنی گناہ گار زندگی کا کوئی جواز تلاش کر لیں۔ یا پھر یہ ہے کہ واقعی اقدار عالیہ خرافات ہیں اور پاکیزہ مشاعر و جذبات بے حقیقت اوھام ہیں؟ کیا تمام انبیاء اور مصلحین (Reformers) کی دعوت ھائے ایمانی لغو ہیں اور طبیعت انسانی کو مہذب بنانے کی ہر سعی بے کار ہے؟ انسانیت کے فرزندانِ عظیم جو ہمیشہ اور ہر دور میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے قربانیاں دیتے رہے ہیں، جنھوں نے ندائے شیطان پر کان دھرنے کے بجائے اپنے ضمیر کی پکار پر لبیک کہا ہے، جنھوں نے

Marfat.com

انصاف، پاکیزگی، نرمی اور مہربانی کی عظیم مثالیں قائم کی ہیں اور جنھوں نے بلند پایہ افکار و تصورات کو فروغ دیا اور ان کے فروغ کے لیے جدوجہد کی ..... کیا یہ سب خرافات ہے؟ اور کیا ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہؓ، ابوذرؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، اخناتون اور بودھ، سب بے کار اوہام ہیں؟ اور ان کے علاوہ بھی ہزاروں اور لاکھوں شخصیات انسانی تاریخ کے آسمان پر ستارے بن کر جھلملا رہی ہیں۔ اور ایسے بھی بے شمار افراد ہیں جنھوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کشمکش حیات میں بھرپور حصہ لیا مگر تاریخ ان کے نام سے بھی آشنا نہ ہو سکی۔ کیا ان سب کو افسانے قرار دے دیا جائے؟ اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ دنیا میں ہمیشہ صرف شریر اور بدکار اور مجرم ہی بستے رہے ہیں۔

فرائڈ کی تیار کردہ تصویرِ انسان

چلیے پھر یہی مان لیتے ہیں، اور انسان کی اس تصویر کو درست سمجھ لیتے ہیں جو فرائڈ نے تیار کی ہے اور اس لیے تیار کی ہے کہ انسانیت کے تمام پاکیزہ جذبات کو نجاست و گندگی میں لتھیڑ دے۔

ذرا دیکھیے فرائڈ نے انسان کی کیا تصویر تیار کی ہے؟ اس تصویر کو سامنے رکھ کر ہی ان پست ذہنیت، اباحیت پسند اور تنگ دلوں کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بقول انسانیت کے اوّلین افراد نے اپنے باپ کو اس لیے قتل کر دیا تاکہ وہ اپنی ماں پر غلبہ حاصل کر کے اپنی جنس کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔ جب ان لوگوں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اپنے باپ کی لاش اپنے سامنے پڑی ہوئی دیکھی تو وہ اپنے اس گناہ پر شرمندہ ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ جب انسان ایک حیوان ہے اور ایسا حیوان ہے

Marfat.com

جو صرف حیوانی جذبات سے حرکت میں آتا ہے، تو ان حیوانات میں یہ شعور کہاں سے آیا کہ انھوں نے اپنے باپ کو ناجائز قتل کیا ہے اور ایک انتہائی غلط کام کیا ہے؟

یہ احساسِ جرم دراصل وہ پہلا انسانی شعور ہے جو انسان اور حیوان میں خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس قصے کو صحیح مان لیا جائے۔ خود فرائڈ کے پاس کیا دلیل ہے کہ یہ قصہ درست ہے؟ بہرکیف احساسِ جرم سے اور جرم پر شرمندگی سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان کے پاس ایک حاسّہ (Sense) ایسا بھی ہے جو مناسب اور غیر مناسب میں فرق اور خیر و شر میں تمیز قائم کرتا ہے۔ اگر اس جبلّی محرک سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے جو اس حاسّہ کی جانب لے جاتا ہے تو بھی یہ حاسّہ اعمال کی ذاتی قدر و قیمت بن جاتا ہے۔

یہ تو ایک بات ہوئی۔ اب آگے چلیے اور دیکھیے کہ کہانی کیا کہتی ہے؟

جب اولاد نے یہ سمجھ لیا کہ ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک اپنی ماں کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک باقی تمام قتل نہ ہو جائیں، جس کے لیے ایک سخت معرکہ ناگزیر ہے اور اس کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ حصولِ مقصد میں کامیابی نہ ہو سکے تو ان سب نے یہ اتفاق کیا کہ ماں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے اور قتل و خونریزی کر کے تباہ ہونے کے بجائے پھر دوبارہ سب مل جُل کر رہیں۔

اب دوسری بات سامنے آگئی۔ اب ایک اور انسانی شعور سامنے آگیا۔ اور وہ شعور یہ کہ بجائے قتل و غارت گری کے مشترکہ مفاد پر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس قصے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ عمومی بھلائی اور خیر کے لیے اپنے

Marfat.com

فطری میلانات پر کنٹرول کر سکتا ہے جس سے بالآخر ہر شخص کو ذاتی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرائڈ خود ڈارون سے نقل کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ جو واقعہ انسانی معاشرے میں وجود میں آیا ہے وہ حیوانات میں بھی وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ نوجوان بیل اپنی ماں کی جانب بڑھتے ہیں اور اسے اپنے باپ کے تسلط سے آزاد کراتے ہیں، پہلے وہ مجموعی طور پر اپنے باپ کو قتل کرتے ہیں (مگر انھیں کوئی ندامت نہیں ہوتی) پھر وہ آپس میں لڑتے ہیں (انھیں باہمی قتال سے جذبۂ اخوت اور ایک مشترک مقصد باز نہیں رکھتا) جس کے نتیجے میں کمزور مر جاتے ہیں اور ایک طاقت ور باقی رہ جاتا ہے، جو اس گائے پر قبضہ جما لیتا ہے جس پر جھگڑے کا آغاز ہُوا تھا۔

فرائڈ کے اپنے بیان کے مطابق انسان نے وہ سب کچھ تو نہیں کیا جو حیوان نے کیا ہے بلکہ انسان کو تو احساسِ ندامت ہُوا ہے۔ انسان تو شعور و تعاون پر باہم متحد ہو گئے ہیں اور انسان نے تو اپنے فطری جذبات پر قابو پا لیا ہے۔

ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ انسانیت پر ایمان رکھنے والے اور انسانیت کو ضرورتوں کے بندھن اور جبلت کے دباؤ سے بالاتر سمجھنے والے کے لیے یہی بیان کافی ہے۔

فرائڈ نے خود ہی ایسا اعتراف کر لیا ہے جس سے اس کے بیکار و لغو نظریات کی عمارت خود ہی منہدم ہو گئی ہے۔ اس نے خود ہی انسان کی کنٹرول کرنے والی قوت ارادی کا اعتراف کر لیا ہے، جس قوتِ ارادی کو کام میں لے کر انسانیت اولیٰ اپنی ماں کے حصول سے باز رہی ہے۔ اس نے خود ہی اس امر کی بھی نفی کر دی ہے کہ انسان

Marfat.com

کے تمام جذبات جبلی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس نے خود بتا دیا کہ انسانیت اولیٰ نے جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو فعل کیا پھر اسی فعل پر اسے احساسِ ندامت بھی ہوا، اور اس نے خود ہی اپنے اس قول کی بھی تردید کر دی کہ اخلاقی اقدار کو انسان پر خارجی جابر قوت نے تھوپا ہے۔ حالانکہ اس احساسِ جرم سے پتہ چلتا ہے کہ یہ احساس ذاتی ہے اور اس احساس کی ایسی اخلاقی قیمت ہے جسے انسانیت اولیٰ نے خود بخود اور ارتکابِ جرم کرتے ہی محسوس کیا۔

اللہ سبحانہٗ گہری تاریکیوں سے روشنی کی کرن نمودار کر دیتا ہے۔ فرائڈ نے مندرجہ بالا حقیقت ہی کا غیر ارادی طور پر اعتراف نہیں کیا بلکہ اس نے انسانی عمل کی تعبیر میں کچھ امور کا دعویٰ کیا اور پھر خود ہی ان کی تردید بھی کر دی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "تمام انسانی جذبات اپنی طبیعت اور اپنے ظہور کے لحاظ سے دوگانہ حیثیت کے حامل ہیں، ہر خوشی میں جذبۂ الم بھی کارفرما ہے، محبت کے ساتھ جذبۂ نفرت بھی موجود ہے اور کسی چیز کی خواہش میں اس چیز کی کراہت بھی چھپی ہوئی ہے۔ انسان کی تخلیق فطرۃً اسی طرح ہوتی ہے اور ان متضاد مشاعر و جذبات کے کسی قسم کے معروضی اسباب موجود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص یا شئے کی محبت نفس انسانی میں جنم لیتی ہے، ساتھ ہی اس کی نفرت بھی پھوٹ پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ نفرت پہلے ہی وجود میں آجاتی ہے۔ پھر جس قدر دائرۂ محبت وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر نفرت بھی پھیلتی جاتی ہے، یہاں تک کہ نفرت پھیل کر تمام دائرۂ محبت پر محیط ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دو متضاد جذبات عالم شعور میں جگہ پائیں اس لیے محبت سطح پر ابھر آتی ہے اور نفرت، دب کر لاشعور کی تہہ میں جا بیٹھتی ہے۔ فرائڈ کی

Marfat.com

نظریہ میں تمام انسانی زندگی کا دارومدار اسی کچلی ہوئی اور لاشعور کی تہہ میں دبی ہوئی نفرت پر ہے۔ یہ نفرت تمام جذبات کو غیر شعوری طور پر سطح پر لاتی رہتی ہے اور اس طرح انسانی اعمال پر اثرانداز ہوتی رہتی ہے۔ اور اسی نفرت سے' یا اس نفرت اور محبت کے درمیان باہم کش مکش سے ہی مذہب، تہذیب، سماجی اقدار اور انسانیت کے تمام مظاھر (Phenomena) جنم لیتے ہیں۔

فرائڈ نے اپنے اس نقطۂ نظر کی، متعدد کتابوں میں وضاحت کی ہے اور بڑے پُرجوش طریقے پر اس نظریے کا اثبات کیا ہے تاکہ اس کے قارئین کرام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ یہ ایک ناقابلِ تردید و تنقید حقیقت ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ دو ایسی حقیقتوں کا اعتراف کر لیتا ہے اور دو فقرے اس کے قلم سے ایسے ٹپک پڑتے ہیں جن سے اس نظریے کی ساری بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کتاب (Totem and Taboo) کے صفحہ ۱۳۹ پر بیان کرتا ہے:

"ماں پر نزاع کی بناء پر بچے کے نفس میں باپ سے جو نفرت پیدا ہوتی ہے، وہ اس کے نفس پر اس وقت تک غلبہ نہیں پا سکتی جب تک وہ رکاوٹ اور ممانعت سے دوچار نہ ہو۔ کیونکہ اس نفرت کو اس محبت اور جذبۂ پسندیدگی سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو اس کے نفس میں اپنے باپ کے لیے پہلے سے موجود ہے۔"

اس موقعہ پر فرائڈ نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ اس نفرت کے کچھ معروضی اسباب بھی ہیں۔ مثلاً اس کا سبب ماں کے بارے میں نزاع ہے۔ اور اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ یہ نفرت بلاسبب

Marfat.com

اور بغیر دیگر عوامل کے اثر انداز ہوئے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ محبت کا ظہور نفرت سے پہلے ہوا ہے۔ اور یہ نفرت جو بعد میں پیدا ہوتی ہے یہ پہلے سے موجود (Old Established) محبت سے کشمکش کرتی اور اس سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تیسری حقیقت کو بھی مان لیا ہے جو یقیناً پہلی دونوں حقیقتوں کی طرح اہم ہے۔ وہ یہ کہ نفرت جس جذبے سے نبرد آزما ہوتی ہے وہ جذبہ کسی خارجی قوت قاھرہ کے دباؤ سے پیدا نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ نفس کی گہرائیوں میں موجود اصل اور حقیقی جذبہ ہے اور اس جذبے کا نام محبت ہے جو نفرت سے پہلے وجود میں آیا ہے۔ یہ سب باتیں اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد ہیں کہ فی الواقع اولاد اور ماں کے مابین کوئی جنسی شعور موجود ہے۔

اس سلسلے میں ہم مزید کچھ اور کہنا نہیں چاہتے۔ ہمارے اثباتِ مدعا کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان اپنی انسانیت پر یقین رکھتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اگر ایسا نظامِ رحمت دنیا میں قائم ہو جائے جو اسباب نفرت کو کم کر کے محبت و تعاون کی فضا پیدا کر دے تو یقیناً اس معاشرے کا انسان محبت، مؤدت اور نرمی و مہربانی کے مشاعر پر زندگی بسر کرے گا۔

"انسان" کی ترقی کا پیمانہ

اگر ہم اقدارِ عالیہ پر یقین رکھتے ہیں اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی زندگی کی استواری درحقیقت اقدارِ عالیہ پر ہی ہوتی ہے، تو یہ کوئی وہمی اور خیالی بات نہیں ہے، بلکہ اپنی ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ہر تاریک سے تاریک دور میں اور بری سے بری صورت میں نفس انسانی میں بلند اخلاقی، سماجی اور انسانی اقدار پائی جاتی رہی ہیں۔

Marfat.com

لاکھوں سال گزر گئے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنا زمانہ گزر گیا؟ ان تمام زمانوں میں انسانیت ترقی کرتی رہی، اس کے مشاعر بلند ہوتے رہے اور اس کی طبیعت مہذب ہوتی گئی۔ مختلف تہذیبیں رونما ہوئیں، بیشمار مذاہب نے فلاحِ انسانیت کا پیغام دیا اور انبیاءؑ اور مصلحین آئے جنھوں نے ان اقدارِ عالیہ کو دنیائے حقیقت میں اور اپنے ماننے والے اشخاص کے وجود میں جلوہ گر کیا اور اپنے پیغام کی جانب لوگوں کو بلایا اور لوگ برضا و رغبت بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اس خیرِ کثیر کی جانب لپکے اور اسے قبول کیا۔ اب آج جب کہ ہم تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں ـــ اور مغرب تو دعوائے تہذیب کرتے نہیں تھکتا ـــ تو اقدارِ عالیہ پر ہمارے ایمان و یقین میں اضافہ ہونا چاہیے اور ہمیں ان اقدارِ عالیہ کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے اور اگر ہم ان اقدار کا انکار کر دیں اور انھیں اوہام و خرافات بتائیں تو ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم بہت بڑی اور گہری پستی میں پڑے ہوئے ہیں، خواہ ہم نے ایٹم بم ہی کیوں نہ ایجاد کر لیا ہو اور ہم چاند کے ویرانوں میں دنیا بسا کر مریخ کی جانب کیوں نہ روانہ ہو چکے ہوں۔

آج کے اہلِ مغرب کے ذہن پر ایک غلط تصور چھایا ہوا ہے جو ان کی تقلید میں خالی الذہن اہلِ مشرق نے بھی اپنا لیا ہے۔ وہ یہ کہ سائنسی عظمت و برتری کا مفہوم یہ ہے کہ سائنسی ترقیات کے ساتھ ساتھ انسان نے بھی مجموعی طور پر ترقی کی ہے۔ اس لیے ایٹمی دور کے اخلاق، عادات اور روایات یقیناً پہلے تمام ادوار سے بہتر ہونے چاہییں کیونکہ پہلے کبھی سائنس نے اس طرح اسرارِ کائنات سے پردہ نہیں اٹھایا تھا جیسے اب اٹھا دیا ہے۔ چونکہ آج ایٹمی دور کے لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے، قواعدِ اخلاق کی پابندی نہیں کرتے، جنسی انارکی کو جائز سمجھتے ہیں اور اقدارِ عالیہ کا انکار کرتے اور انھیں خرافات قرار دیتے ہیں اس لیے یہ سب باتیں درست ہیں۔

Marfat.com

کیونکہ یہ باتیں اس دور میں ہو رہی ہیں جو سائنسی دور ہے، جو ایسا زمانہ ہے جس میں روشنی پھیل گئی ہے اور حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔

یہ تصور بذات خود غلط ہے اور اس سے زیادہ غلط تصور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے عظمتِ انسان کی پیمائش کا پیمانہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، موٹریں، کپڑے دھونے کی مشینیں اور تباہ کن بم نہیں بن سکتے ...... البتہ یہ ضرور ہے کہ سب ایجادات انسان کے جذبات و میلانات پر اثر انداز ضرور ہوتی ہیں۔ اگر ان ترقیات کی مدد سے انسان کی رسائی کسی ایسے نظریۂ انسانی تک ہو جائے جو زیادہ مکمل اور زیادہ جامع ہو۔ جو زیادہ ہمہ گیر اور وسیع ہو، پھر تو یہ کہا جائے گا کہ یقیناً "انسان" نے ترقی کی ہے۔ لیکن اس چمک دمک کے باوجود اگر انسان کے جذبات سکڑ کر اپنی ذات میں مرکوز ہو جائیں اور انسان اپنی خواہشوں کا بندہ اور اپنی آرزوؤں کا غلام بن کر رہ جائے پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے ترقی کی۔ پھر تو یہی کہا جائیگا کہ "انسانیت" پستیوں میں جا پڑی۔

سیاہ فام امریکی، سفید فام امریکیوں کے ہم وطن، ہم زبان اور ہم مذہب ہیں مگر ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا گیا ہے جو یقیناً انسانیت سے فروتر ہے۔ انگریز، نوآبادیاتی باشندوں کا خون چوستے رہے ہیں، اور نوآبادیوں میں اپنی کوٹھیوں پر یہ تختیاں لگاتے رہے ہیں: "صرف گوروں کے لیے" تو یہ کونسی انسانیت ہے؟ اور فرانسیسی شمالی افریقہ میں زبردستی گھس کر وہاں کے باشندوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرتے رہے جیسے وہ مجرم ہوں اور ان پاکبازوں نے انھیں رنگے ہاتھوں دھر لیا ہو۔ اور روسی، ہر مذہب کے کٹر مخالف ہوتے ہوئے اسرائیل کے قیام میں (جو مذہبی بنیاد پر قائم ہے) تعاون کرتے رہے۔ اور مشرق اوسط میں اپنا مہرہ بٹھانے کے لیے انھوں نے اپنے ہر اصول اور اپنے تمام

Marfat.com

پروپیگنڈے کو بالائے طاق رکھ دیا اور مشرق کے اصل باشندوں کو نظرانداز کر دیا اور ہنگری اور پولینڈ کے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ سب 'انسان' کی ترقی کی کون سی مثالیں ہیں؟

مغرب ایک طویل عرصے سے اپنی اس روش زشت پر گامزن ہے اور وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات رچے بسے ہیں۔ پھر وہ یہ دعویٰ کیوں کر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ترقی کر لی ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی جنگی بیڑے بنا لیں، کارخانے قائم کر لیں اور چاہے وہ آسمان پر بھی پہنچ جائیں۔ مگر 'انسان' نے تو کوئی ترقی نہیں کی۔ انسانی ترقی کی پیمائش کا آلہ تو یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ انسان دوسرے انسان سے کس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ اس میں بھی یہ نہیں کہ انگریز دوسرے انگریز سے کس قسم کا برتاؤ کرتا ہے، کیونکہ اس میں تو قانون بھی اثرانداز ہے اور تعلقات کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے ایک دوسرے کی قوت کے اثرات بھی پڑ سکتے ہیں ــــ اصل بات تو یہ ہے کہ اہل مغرب ان بدیسیوں سے کیا معاملہ کرتے ہیں جو غیر مسلح ہیں اور جن کے پاس کوئی قوت نہیں ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں رنگین پردوں اور حسین کپڑوں میں لپٹا ہوا "مغربی انسان" عریاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے اور اس کے 'انسانیت' پر یقین کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔

اگر فی الحقیقت اہل مغرب 'انسانیت' پر ایمان رکھتے ہوں، تو یقیناً انھوں نے ترقی کی ہے۔ مگر مغرب انسانیت پر ایمان نہیں رکھتا ہے اور نہ اس وقت تک رکھ سکتا ہے جب تک اس کا زندگی اور کائنات کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل نہیں ہو جاتا، اور جب تک وہ اپنے فلسفۂ حیات کی استواری کے لیے فلسفۂ عملیت (Pragmatism) اور مفاد پرستی کے بجائے کوئی اور اساس اور بنیاد تلاش نہیں کر لیتا۔

Marfat.com

مغرب اور مادی مفادات

مغرب تمام اقدارِ عالیہ کا انکار کرتا اور صرف مادی مفادات پر یقین رکھتا ہے۔ کیونکہ مغرب کے مخصوص حالات نے اہلِ مغرب کو ایسی اقوام بنا دیا ہے جو دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے اقوامِ عالم پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور ذرا سے فائدے کے لیے کمزور اقوام پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ اس مفاد پرستی کی بناء پر ان کی طبیعتوں میں تعاون و محبت کے بجائے کشمکش و نزاع کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور ان کے جذبات و میلانات پر مفاد پرستانہ تصورات مسلط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس برائی کی جانب ان کے حالات انھیں کھینچ لائے ہیں اور یہ صورتِ حال کوئی ایسی خوبی نہیں ہے جس کا مشرق کے نادان لوگ اشتیاق رکھیں۔

یہ درست ہے کہ آج کے مغرب کو قوت و اقتدار حاصل ہے۔ اور یہ شان و شوکت اس کو اس دور میں حاصل ہوئی ہے جس زمانے میں اس نے اقدارِ عالیہ کو رد کر کے صرف دنیائے محسوسات ہی پر اپنے یقین کے دائرے کو منحصر کر لیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حصولِ قوت کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ ہمارے سامنے بطور دلیل اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ جب دنیائے اسلام —— اسلام پر پکا، سچا ایمان رکھتی تھی اور پوری قوت کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو جنگ و سیاست اور سائنس و اقتصاد، ہر میدانِ زندگی میں برتری اور تفوق حاصل تھا۔ اور جو یورپ آج ایک ہیکلِ عظیم کی طرح ہمارے سامنے ایستادہ ہے وہ خود ایک زمانے تک مشرقِ اسلامی کا شاگرد رہا ہے۔

انسانیت کے طاقت ور ہونے کا یہ مفہوم تو نہیں ہے کہ انسانیت کے اجزاءِ حقیقی ہی کو تسلیم نہ کیا جائے، اور جبکہ عملی طور پر ان دونوں باتوں

Marfat.com

میں ہم آہنگی بھی ہو سکتی ہو کہ انسان طاقت ور بھی ہو جائے اور اس کے اجزائے حقیقی بھی نشوونما پاتے رہیں۔

زیادہ قابلِ غور یہ حقیقت ہے کہ خالص مادی بنیادوں پر طاقت کے حصول نے انسانیت کو تباہی اور بربادی سے ہمکنار کیا ہے۔ کیونکہ مادیت کی بنیاد محبت و تعاون نہیں ہوتی بلکہ کشمکش اور چھینا جھپٹی ہوتی ہے اور یہ اصول ہوتا ہے کہ بالادستی اور اقتدار "صاحبِ حق" کا نہیں بلکہ اس شخص کا ہے جس کے پاس طاقت ہے۔ ظاہر ہے بربریت پر مشتمل اس فلسفے کا انجام جنگ کی صورت میں ظاہر ہو گا جس میں چند لمحوں میں انسانیت کی صدیوں کی کاوشیں ملیامیٹ ہو جائیں گی۔

اقدارِ عالیہ مادی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہیں

بعض "دانشور" کمال سادگی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ روحانیت اور اقدارِ عالیہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ جدید سائنسی ایجادات اب تک ہوئی ہیں، یا جو مادی آسائشیں دورِ جدید میں ہمیں حاصل ہو گئی ہیں، ان سب سے دامن جھٹک کر کھڑے ہو جائیں۔ سوچ کا یہ انداز مشرقی دانش وروں کا نہیں ہے بلکہ غالباً یہ "ثقافت" اور "دانشوری" کے کارواں میں شامل ہو کر مغرب سے آیا ہے۔ کیونکہ ایک انگریز جو یونیسکو کے ادارے میں بطور ماہر ادارہ مامور ہے اور جو آکسفورڈ کا فارغ التحصیل ہے، وہ مجھ سے ایک گفتگو کے دوران کہنے لگا:— "مَیں اس لیے روحانیت کو پسند نہیں کرتا کہ مَیں ہوائی جہاز کا سفر چھوڑنا نہیں چاہتا اور یہ پسند نہیں کرتا کہ مَیں موسیقی نہ سُنوں۔" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا:— "کیا تمھارے خیال میں روحانیت پر ایمان لانے کے لیے ان چیزوں کا چھوڑنا ضروری ہے؟" اس پر وہ کہنے لگا:— "مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ روحانیت پر ایمان لا کر مجھے خیموں کی زندگی میں لوٹنا پڑے گا۔"

Marfat.com

نہیں، اے دانشورو! ایسا نہیں ہے۔ اقدارِ عالیہ پر ایمان سائنسی ترقی اور روزنت نئی ایجادات میں مانع نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سائنس وہی تھی جس سے طبیعیات، کیمیا، فلکیات اور ریاضیات میں مسلمان واقف ہوا کرتے تھے۔ اقدارِ عالیہ پر ایمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہوائی جہاز نہ استعمال کیا جائے، راکٹ نہ بنائے جائیں، اور چاند پر انسان کو نہ اُتارا جائے۔ ایمان لاکر بھی یہ سب کچھ ہوگا۔ مگر ایمان اس تمام انسانی جدوجہد میں پاکیزہ و بلند انسانی مقاصد پیدا کر دے گا اور انسانیت کو زندگی کا ایسا مقصدِ عظیم عطا کر دے گا جو انسان کو ان سطحی مادی منفعتوں کی سوچ سے بہت بلند کر دے گا۔

مغرب کا ایک مغالطہ

مادہ پرست مغرب اقدارِ عالیہ کے انکار کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ نفسِ انسانی 'رفعت' کو قبول نہیں کرتا اور نفس کو مہذب بنانے کی کتنی ہی دلکش تدبیریں کیوں نہ کی جائیں نفسِ انسانی تہذیب اختیار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی دَور ایسا نہیں آیا ـــــ حتیٰ کہ انبیاءؑ کے زمانے میں بھی ـــــ کہ جرم بالکلیہ نہ ہوا ہو ـــــ فلسفۂ مغرب کے اس شاخسانے پر مشرق کے دانشوروں کے چہرے کھل اٹھے ہیں اور وہ بھی کہنے لگے کہ نفسِ انسانی کو مہذب بنانے کی کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ کوششیں تاریخ میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔

گمراہی کا یہ جواز ایک مغالطے پر مبنی ہے۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ان دونوں معاشروں میں بڑا عظیم فرق ہے جن میں سے ایک میں جرم کا ارتکاب شاذ و نادر ہوتا ہو اور اسے سخت بُرا سمجھا جاتا ہو اور دوسرے میں جرم کی اس قدر کثرت ہو کہ جرم سے روکنا بھی تعجب کی بات بن جائے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں جرم بالکلیہ ختم نہیں ہوا تو جرم موجودہ

Marfat.com

دَور سے یقیناً بہت زیادہ کم تھا۔ اور یہی وہ پیمانہ ہے جس سے معاشروں کو ناپا جا سکتا ہے۔

خود مغرب نے بعض اُمور میں اس بے مثال تہذیب کو اپنایا ہے جو انسان کو مہذب اور دیانت دار بتاتی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں اخبار فروش، اخباروں کا ڈھیر سڑک کے کنارے رکھ کر چلا جاتا ہے، ہر شخص اخبار کی قیمت وہاں رکھتا ہے اور اخبار اٹھا لیتا ہے ـــــ وہاں کوئی یہ سوچتا بھی نہیں ہے کہ یہ پیسے جو بلا حفاظت رکھے ہوتے ہیں انھیں اٹھا لیا جائے ـــــ ظاہر ہے یہ ایک پہلو سے بہترین تہذیب ہے جس نے نفس کو چمکا دیا ہے اور اسے چوری کا موقعہ ہونے کے باوجود چوری سے روک دیا ہے۔

امریکہ میں عام طور پر گھروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے باغ ہوتے ہیں جن کی چار دیواری نہیں ہوتی، ہر راہ گزر اگر چاہے تو بلا اجازت پھُول یا پھل توڑ سکتا ہے مگر کوئی بھی ایسا نہیں کرتا ـــــ بلکہ مَیں نے ایک مصری سے سنا، جو کچھ عرصہ امریکہ رہ کر آیا تھا، کہ ایک مرتبہ کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک لڑکا پنجوں کے بل ایڑیاں اٹھائے گھنٹی بجانے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس کی چھوٹی بہن اس کے ساتھ ہے، مجھے دیکھ کر اس نے اجازت چاہی کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کے لیے چند پھول توڑنا چاہتا ہے ـــــ حالانکہ اگر یہ بچے چاہتے تو پھول توڑ لیتے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

اگر کسی ذریعے سے اور کسی طریقے سے اس قسم کی تہذیب ممکن ہے تو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انسانی طبیعت تہذیب کو قبول نہیں کرتی ـــــ اگر مغرب اس قسم کی تہذیب کی سعی کر کے اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے تو اسے نفس انسانی کے دیگر پہلوؤں میں بھی تجربہ کرنا چاہیے اور اس قسم کی

Marfat.com

تہذیب تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ اسے اس دلیل کا سہارا لے کر کہ جنسی میلان مہذب نہیں ہو سکتا، نوجوانوں کو جانور بنا کر نہ چھوڑنا چاہیے۔

دراصل مغرب نے اپنی ساری توجہ اس تہذیب پر صرف کی ہے جو خالص مفاد پرستانہ تہذیب ہے اور اسی میں مگن ہے۔ کیونکہ مغرب کی طبیعت مفاد پرستانہ اور مادی ہے اور مغرب نے انسانی اور اخلاقی تہذیب کی جانب اس لیے کوئی توجہ نہیں دی کہ وہ اخلاقی اور انسانی اصولوں پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ اسلام نے نفس کے تمام پہلوؤں میں انسان کو مہذب بنایا اور اس تہذیب کے نتیجے میں وہ مثالیں سامنے آئیں جو ہم نے "اسلام کا نقطۂ نظر" میں بیان کی ہیں۔

نفس انسانی کی اگر مسلسل تہذیب و راہنمائی ہوتی رہے تو وہ رفعت و ارتقا کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتا، اور اگر نفس کو بغیر تہذیب و راہنمائی کے چھوڑ دیا جائے اور اس کے سامنے پستی و تنزل کے دل کش مناظر بکھر جائیں تو وہ پستی میں گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ چونکہ مغرب نے مسئلہ جنس کو اخلاق سے جداگانہ ایک حیاتیاتی فعل قرار دے دیا ہے اس لیے اس مسئلے میں بطور خاص مغرب، حیوان بن چکا ہے۔ اسی طرح مغرب نے سامراجیت کو اخلاق سے غیر متعلق ایک خالص اقتصادی مسئلہ قرار دے دیا۔ جیسے بلی چوہے کو دیکھتے ہی اس پر جھپٹتی ہے اور اس کے اس عمل کو اخلاقی پیمانے پر نہیں ناپا جا سکتا تو اس طرز فکر نے راہ اقتصاد میں مغرب کو جانور بنا دیا۔

حیوانات کے اعمال کا بلاشبہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ حیوانات کے عمل میں ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ جبلت کے تابع ہوتا ہے۔ مگر دنیائے انسان میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ انسانِ اوّل جو غاروں میں زندگی گزار رہا تھا وہ بھی اپنے اعمال کی اخلاقی قیمت سے یقیناً آشنا تھا۔

Marfat.com

بعض حیوانات میں بھی مہذّب رُجحانات موجود ہیں ——!!!

بعض حیوانات میں بھی ان اقدار عالیہ کی جانب ابتدائی سا میلان پایا جاتا ہے جو ہم انسان کے لیے خواہاں ہیں۔ چنانچہ ہاتھی اگر بیمار پڑ جائے تو باقی ساتھیوں سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور تنہائی اور محرومی برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ یا تو مرض سے شفا پا کر اپنے گلّے میں واپس آجاتا ہے یا مَر جاتا ہے۔ مگر گلّے کے باقی جانوروں کو بیماری کے لگ جانے کے خطرے سے بچا لیتا ہے۔

بعض کبوتروں میں محبت و اُلفت اس درجہ پائی جاتی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک مَر جائے تو دوسرا غمگین بیٹھا رہتا ہے، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ اسے چین آتا ہے یہاں تک کہ خود بھی مَر جاتا ہے۔

اونٹ کھلی جگہ میں فطری ملاپ سے گریز کرتے ہیں اور ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں جہاں لوگ انھیں دیکھ نہ سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ گھوڑا اپنی ماں سے فطری ملاپ نہیں کرتا خواہ لوگ کتنی ہی کوشش کریں۔

اگر اس قسم کی مثالیں بغیر شعور و ارادے کے دنیائے حیوانات میں ظاہر ہو سکتی ہیں تو کیا جس مخلوق کو سائنس اور علم، ترقی یافتہ بتاتے ہیں اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بلند اصولوں کو اپنائے اور اپنے شعور و ارادے سے انھیں بروئے کار لائے؟

لاشعور — اقدار عالیہ

میرا خیال یہ ہے کہ انسان کا 'لاشعور' صرف خواہش نفس اور تاریکی محض نہیں ہے بلکہ انسان کے 'لاشعور' میں ناموری و مردانگی کے تخیلات جیسے سراپا امورِ خیر اور اقدار عالیہ بھی موجود ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر

Marfat.com

انسانیت نے یہ مردانگی کے خواب کیسے دیکھے ہیں؟ اس کو یہ دل کش تصویریں کس نے سجھائی ہیں؟ (جو اس نے اپنے ابطال (Heroes) کی اس قدر عمدہ اور بہترین بنائی ہیں، جن میں کوئی نقص اور کمی نہیں ہے)۔

بات دراصل یہ ہے کہ کمال مطلق کا تصور انسان کے نفس میں بہت گہرا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانیت اپنے زمانۂ طفولیت میں اس تک رسائی نہ حاصل کر پاتی اور نہ اس کے آفاق بلند کے بارے میں تصورات قائم کرتی۔

اقدار عالیہ کی دلکشی اور نفسیاتی پاکیزگی دراصل لوگوں کو ارتفاع کی جانب لے جاتی ہے اور وہ بغیر کسی جبر کے خود بخود ارتفاع کی جانب بڑھتے ہیں، انھیں خود بطولت (Heroism) دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے نفس کی گہرائیوں میں موجود کسی جذبے کے تحت اس کی تقلید کرتے ہیں۔ گویا انسان کے لاشعور میں ان اقدار عالیہ اور اس بطولت کا کوئی سرچشمہ موجود ہے جو دنیائے واقعہ یا دنیائے تصور میں بہہ نکلنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر ہے۔

فرائڈ شاید ٹھیک ہی کہتا ہے کہ بدکردار انسان دراصل پرَتو ہیں، اُس برائی کا جو انسان کے لاشعور میں چھپی ہوئی ہے[1] ___ میں اس منطقی قضیئے کو اس طرح مکمل کرتا ہوں کہ نیک انسان درحقیقت پرَتو ہیں اُس نیکی کا جو انسان کے لاشعور میں موجود ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لاشعور، اقدار عالیہ کا بھی اسی طرح مسکن ہے جس طرح کہ وہ پست جبلّت کا مرکز ہے۔ اگر فرائڈ کے بقول انسانی جذبات و اعمال اس کے لاشعور کے تابع ہیں، تو وہ صرف سفلی جبلّت ہی کے تابع نہیں ہیں بلکہ

---

1. Totem and Taboo PP. 61.

Marfat.com

جذبۂ ارتفاع کے بھی تابع ہیں۔ اس طرح انسان فرشتوں اور شیطان کے مابین ایک مخلوق قرار پاتا ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ پستی کے لمحات میں حیوان بن جائے اور ارتفاع کے لحظات میں فرشتہ بن جائے۔ اور اسی طرح اسلام انسان کو سمجھتا ہے۔

"انسان" کے اجزاء

اسلام نے یہ بالکل دُرست کیا ہے کہ اس نے انسان کی قیمت جانچنے کا پیمانہ یہ مقرر کیا ہے کہ وہ کس قدر اقدارِ عالیہ پر کاربند ہے اور کس قدر ان کے وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان صحیح معنی میں انسان نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی طاقت و اقتدار کیوں نہ حاصل کرلے۔ یوروپ نے اپنے دَورِ انحطاط میں اخلاقی اقدار اور انسانی اعمال میں جو فرق رَوا رکھا ہے وہ عجیب ترین ہے۔ یوروپ میں جزئیت پسندی عملی دائرے سے نکل کر بحث و تحقیق کے میدان میں داخل ہوگئی اور علمائے اخلاق، اخلاق کو انسان سے جُدا رکھ کر مطالعہ کرنے لگے۔ اور علمائے انسان، انسان کو اخلاق سے جدا کرکے دیکھنے لگے۔ یہ جزئیت پسندی طبیعیات میں مفید ہوسکتی ہے مگر نفسیات میں جزئیت پسندی خطرناک بھی ہے اور ناممکن العمل بھی۔ کیونکہ جب تک لوگ کسی معاشرے میں رہیں گے، اور سماجیت ہر فرد کے نفس میں ایک جزو اساسی کے طور پر موجود رہے گی، تو لازمی طور پر اخلاقی اور اجتماعی اقدار بھی پیدا ہوں گی جو یقیناً انسان سے منفصل اور جدا نہ ہوں گی، اور ہر وہ مطالعہ جو ان اقدار میں اور انسان میں فرق کرے اور انھیں جدا جدا سمجھے، وہ تمام مطالعہ ناقص اور اس سے برآمد ہونے والے تمام نتائج غلط ہیں۔

چونکہ آج کے دَور میں سائنس کی عظمتوں کا چرچا ہے اس لیے جزئیت پسندی کی وبا سائنسی تجربہ گاہوں سے سماج میں منتقل ہوگئی اور لوگ

Marfat.com

اخلاق کو عملی زندگی سے جدا اور منفصل خیال کرنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ کسی کے اخلاق سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت اس کے اعمال کو حاصل ہے۔ گویا اعمال میں اور اخلاق میں فصل ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ بعض اوقات انسان کے اعمال بظاہر اخلاق سے متاثر ہوتے ہوئے نہیں محسوس ہوتے مگر ہر وقت اور تمام عمر ایسا نہیں ہوتا، بالخصوص ان افراد کے معاملے میں جو راہنمائی اور قیادت کے منصب پر بھی فائز ہوں۔ اس مقام پر یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ امریکہ، جہاں مطلقاً شخصی آزادی حاصل ہے اور جہاں خود اخلاق اور اعمال کو جدا جدا سمجھا جاتا ہے وہاں وزارت خارجہ سے جنسی انارکی میں مبتلا ہونے کی بناء پر تینتیس ۳۳ افراد کو حکومت سے نکالا گیا اور کہا گیا کہ ان لوگوں پر حکومت کے رازوں کے بارے میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

غرض انسان کو عمل اور اخلاق میں تقسیم کر دینا سخت غلطی ہے اور اس کے سخت اجتماعی نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ زندگی کے حقائق تمام کے تمام ایک کل ہیں جو نہ اجزاء میں تقسیم ہوتے ہیں اور نہ ان میں باہم کوئی تعارض ہے۔ ان حقائق میں تعارض دراصل ان لوگوں کو محسوس ہوتا ہے جو کوتاہ بیں اور کوتاہ اندیش ہیں۔ مگر جو لوگ دور اندیش اور وسیع النظر ہیں وہ انسان کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسلام نے چونکہ انسان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے اور اس کے داخلی اور خارجی میلانات میں ہم آہنگی پیدا کر کے انسان کو صحیح مقام دیا ہے اس لیے انسان کے بارے میں اسلام ہی کا صحیح ترین نقطہ نظر ہے۔

اسلامی معاشرے میں انسان کی رفعت کی مثالیں

اسلام نے جس طرح نفس انسانی کے تمام پہلوؤں کو ہم آہنگ کر دیا ہے اس سے انسان کے نفس کی تہذیب اور اس کو جبلی تقاضوں سے بلند

Marfat.com

کرنے میں بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اب اگر مغرب اپنی کچھ مجبوریوں کے تحت انحطاط و زوال آشنا ہو گیا ہے اور اس نے اقدارِ عالیہ سے انکار کر دیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی اسی روش پر چلیں اور ہم بھی اسی کے فرسودہ نقطۂ نظر کو اپنائیں جبکہ ہمارے سامنے مقاصد زندگی اور انسانی میلانات کے بارے میں بہترین روشن مثالیں موجود ہیں اور ایسا نقطۂ نظر ہے جو دنیا کے ہر نظریے سے ارفع ترین ہے۔

جب گزشتہ جنگ میں انگریزی لشکر دوسری اقوام پر ہر قسم کی زیادتیاں کر کے ان پر غالب آجاتے ہیں، اور مفتوح اقوام ان کی بالادستی اور اقتدار تسلیم کر لیتی ہیں، تو وہاں جنگل کا قانون نافذ ہوتا اور طاقت ہی سچائی ہوتی ہے۔[ل] لیکن جب ایک مصری حضرت عمرؓ کے سامنے مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے کی یہ شکایت پیش کرتا ہے کہ گورنر کے بیٹے نے میرے بیٹے کو بلاوجہ مارا ہے تو عمرؓ یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ مصری کا بیٹا گورنر کے بیٹے کو مار کر اپنا بدلہ لے، اور اس وقت قانون انصاف کارفرما ہوتا ہے۔

جب ایک مصری مجھ سے بیان کرتا ہے کہ میں فرانس میں دوران تعلیم ایک عورت کے مکان میں کرائے پر رہتا رہا میں اس عورت کے ملک میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، مگر وہ عورت مجھ سے پیسے گھسوٹنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتی تھی، حتیٰ کہ اگر کسی وقت وہ مجھے بطور تفریح کہیں لے گئی تو واپسی پر آمد و رفت کا کرایہ رکھوا لیتی، اور کبھی چائے کی پیالی پلائی تو بل میں اپنی اور میری دونوں کی چائے کا حساب لگا لیتی، تو مصری کا یہ بیان ثابت کرتا ہے کہ فرانس میں

[ل] یہ بات میں نے پہلے ایڈیشن میں تحریر کی تھی، اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں انگلستان اور فرانس مصر پر چڑھ دوڑے اور اس وقت انھوں نے جس بہیمیت کا مظاہرہ کیا وہ جنگل کے قانون کو بھی شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

Marfat.com

طلب زر اور مادیت حکمراں ہے۔ مگر جب انصار اپنی ایک ایک چیز تقسیم کر کے مہاجروں کو حصہ دے دیتے ہیں اور خدا کی رضا کے سوا ان سے کسی بدلے اور شکریے تک کے امیدوار نہیں ہوتے تو وہاں پاکیزہ ایثار کارفرما ہوتا ہے۔

جب ایک امریکی جو خوب دولت مند بھی ہوتا ہے اپنے تنگ دست ماں باپ پر کچھ خرچ کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہر شخص اپنا خود ذمے دار ہے اور اسے خود اپنی ضروریات کی کفالت کرنی چاہیے تو درحقیقت ان کے سماج میں مطلب پرستی حکمراں ہوتی ہے مگر جب ایک مسلمان یہ سوچتا ہے کہ اپنے تنگ دست والدین پر خرچ کرنا اس کی اپنی عزت ہے، اور ان کے اس احسان کا صلہ ہے کہ انھوں نے اسے پڑھایا لکھایا اور اسے تربیت دی۔ اور اگر وہ والدین کے اس مقدس فرض کو انجام نہیں دے گا تو لوگ اسے غیرت دلائیں گے۔ تو یہاں انسانی نیکی اور خلوص کارفرما ہوتا ہے۔

جب امریکی اپنے ہم زبان و ہم مذہب سیاہ فام لوگوں۔ سے وحشیانہ برتاؤ کرتے ہیں، ان کو اس وقت تک پابہ زنجیر رکھتے ہیں جب تک ان کے جسم میں سانس کی آمد و شد رہتی ہے اور انھیں اس جرم میں کہ وہ ان سے اپنے انسانی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، سڑک پر چلنے کا حق مانگتے ہیں، بسوں میں سفر کی اجازت چاہتے ہیں، اور ہوٹلوں میں داخلے پر سے پابندی ختم کرانا چاہتے ہیں تو ان کو اس جرم میں پھانسیاں دی جاتی ہیں۔ جب امریکہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے تو وہاں وحشیت اور بربریت حکمراں ہوتی ہے۔

مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"سنو اور اطاعت کرو، خواہ تم پر کسی ایسے سیاہ فام غلام کو حکمراں کیوں نہ بنا دیا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو، جب تک

Marfat.com

وہ تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتا رہے۔"

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس سیاہ فام غلام کو صرف انسانی مساوات ہی عطا نہیں کرتے بلکہ اگر وہ شریعت الٰہیہ کا نفاذ کرے تو اسے مرکز قیادت کا بھی اہل بتاتے ہیں۔ تو یہاں بلند روحِ انسانی کارفرما ہوتی ہے۔

جب سامراجیت آرزوئے اقتدار بن جاتی ہے، جب قدیم رومی سامراج غلاموں کی منڈیاں تلاش کرتا ہے اور جب جدید یوروپ وامریکہ اپنی زائد از ضرورت پیداوار کو کھپانے کے لیے نئے بازار اور نئی مارکیٹیں تلاش کرتا ہے تو اس وقت صرف مادہ حکمراں ہوتا ہے اور لوگ مادیت کے غلام بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں روحانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے — مگر جب اسلام فتوحات حاصل کرتا ہے اور اس کے پیش نظر اقتصادی اور سامراجی محرکات کے بجائے یہ مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلے، اور مفتوحہ ممالک اسلامی علوم سے آشنا ہوں، اور جب اسلام کسی ملک سے جمع کیا ہوا سرمایہ اسی ملک کے باشندوں پر خرچ کر دیا کرتا تھا اور جو بچ رہتا وہ بیت المال میں اس لیے لایا جاتا تاکہ عام مسلمانوں میں تقسیم کیا جا سکے، تو اس وقت نور الٰہی سے مستفاد پاکیزہ روحانیت کارفرما ہوتی تھی۔

اسلامی واقعیت سے اقدار عالیہ پیدا ہوتی ہیں اور اس وقت تک اپنے خوش گوار نتائج لاتی رہی ہیں جب تک مسلمان ان کی جانب توجہ دیتے رہے اور ان کی نشو و نما کی فکر کرتے رہے۔ مگر اب جب کہ مسلمان اپنے دین سے منحرف ہو کر پستیوں میں پڑے ہوئے مغرب کے غلام ہو چکے ہیں تو وہ مغرب سے بھی بدتر ہو گئے ہیں اور عملی قوت میں بھی ناکارہ ہو کر دنیا اور آخرت دونوں کے زیاں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح خدا کی ناراضگی مول لے لی ہے۔

Marfat.com

اب بھی اگر مسلمان عزت چاہتے ہیں تو ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہے جس پر وہ عمل پیرا ہو کر عزت و عظمت، شان و شوکت اور قوت و اقتدار حاصل کر چکے ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون: ۸)

"عزت تو بس اللہ ہی کی ہے اور اس کے پیمبرؐ کی اور ایمان والوں کی۔"

Marfat.com

ہماری کچھ نئی مطبوعات

ترجمہ قرآن مجید (معہ مختصر حواشی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۵/=
زادِ راہ (مجموعہ احادیث)	مولانا جلیل احسن ندوی	۱۲/=
حضرت یوسفؑ قرآن کے آئینے میں	سید احمد قادری	۳/=
تخلیقِ آدمؑ	اکرام الدین احمد	۶/=
نکاح کے اسلامی قوانین	صدرالدین اصلاحی	۳/=
افشاں (مجموعہ کلام)	نعیم صدیقی	۶/=
حق کی تلاش	التفات احمد	۴/=
مناظرِ قیامت	سید قطب شہیدؒ	۱۲/=
ایمان اور زندگی	علامہ یوسف القرضاوی	۵/۵۰
مطالعۂ حدیث	محمد فاروق خاں	۱۰/=
بنیادی حقوق	محمد صلاح الدین (ایڈیٹر جسارت)	۱۲/=
کشف المحجوب	مترجم: میاں طفیل محمد	۱۳/=
مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ (اوّل)	مولانا مفتی محمد یوسف	۱۲/=
〃 〃 〃 〃 〃 (دوم)		۱۲/=
مولانا مودودی اور فکری انقلاب	متین طارق باغپتی	۶/=
خطبات اوّل تا ششم مجلد	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۱۳/=
پیپر بیک		۱۱/=
غیر سودی بنک کاری (نیا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی	۱۰/=
سیرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم	سید ابوالاعلیٰ مودودی (اوّل)	۵۰/=
〃 〃 〃	〃 (دوم)	۵۰/=

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

Marfat.com

Marfat.com

تحریکِ اسلامی
کی
اخلاقی بنیادیں

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دین میں امامت صالح کس طرح قائم کی جا سکتی ہے؟
● معاملاتِ دنیا میں زمامِ کار کی اہمیت ● اسلامی اخلاق کی خصوصیات
اور اس کے اثرات ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی مفصل
تشریح ● دین کا حقیقی اور گہرا شعور بخشنے کے لیے بے مثال کتاب.

مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ٦

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ طباعت نیو کریسنٹ پرنٹرز

Marfat.com